”شاہکار“

بابت ماہ اپریل ۱۹۳۷ء

ایڈیٹر:- پروفیسر تاجور
آنریری ایڈیٹر:- میرزا ادیب بی۔ اے
ادارہ:- خواجہ محمود جاوید ایم۔ اے
(سید) عبدالرشید یزدانی
جلد (۵)
نمبر (۱)

فہرست

تصاویر:- (سہ رنگی) (۱) سنگھا- (یک رنگی) وزرائے پنجاب۔

ایم ہادی حسن احقر پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار ۹ لوئر مال بیرون بھاٹی دروازہ لاہور سے شائع کیا۔

"شاہکار" کے متعلق

ارکانِ حکومت، عمائدِ ملک اور اہلِ علم و قلم حضرات کی رایوں کے چند اقتباسات

ہز ایکسیلنسی سر ہربرٹ ولیم ایمرسن کے۔سی۔آئی۔ای، آئی،سی ایس گورنر پنجاب:۔

"میں آپ کے اس اقدام سے دلچسپی رکھتا ہوں اور اس کی کامیابی کا متمنی ہوں۔"

آنریبل سر ملک فیروز خاں نون۔ ایم۔اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا، سابق وزیرِ تعلیم پنجاب۔ حال کمشنر فار انڈیا (انگلینڈ):۔

میں "شاہکار" کے مضامین نہایت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ "شاہکار" کا اہم ترین مقصد عوام کو غیر ممالک کے متعلق واقفیت بہم پہنچانا ہے۔ ہمارے اکثر اردو رسائل و جرائد سیر و سیاحت، تاریخِ جدید اور روزانہ واقعات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔

آنریبل ڈاکٹر میاں سر فضل حسین ایم۔اے۔ایل ایل ڈی۔ بارایٹ لا کے۔سی۔ایس۔آئی۔ سابق ممبر تعلیمات حکومتِ ہند و وزیرِ تعلیم پنجاب

شاہکار اعلیٰ پایہ کا ماہنامہ ہے۔ عمدہ اصولوں پر چلایا جا رہا ہے اور زبانِ اردو و ملک کے لئے مفید ہے۔ مجھے رسالے کا خریدار بنا لیں اور اس کا خیر خواہ معاون تصور کریں۔

آنریبل سر جوالا پرشاد سری واستو کے۔ ٹی۔ وزیرِ تعلیم صوبجات متحدہ:۔

میں اسے اوّل درجہ کی چیز سمجھتا ہوں اور آپکو مبارکباد دیتا ہوں میں اس کا خریدار بننا پسند کروں گا۔

رائٹ آنریبل نواب حیدر نواز جنگ بہادر سر اکبر حیدری صدر اعظم مملکت آصفیہ دکن

مجھے "شاہکار" پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ میری رائے ہے کہ اس کا خیر مقدم اردو صحافت کی تاریخ میں ایک ممتاز نشانِ راہ کی حیثیت سے کرنا چاہیئے۔ دلچسپ اور ہادیانہ مضامین کی اشاعت سے آپ کا مجلہ اردو دنیا کی جو خدمت بجا لا سکتا ہے۔ اسے اردو کے وہ تمام شیدائی بیحد پسند کریں گے جو اس زبان میں مختلف ترین موضوعات پر اظہارِ خیال دیکھنے کے متمنی ہیں۔

آنریبل جسٹس خواجہ سر محمد نور بی۔اے، بی۔ایل، وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی جج ہائیکورٹ پٹنہ:۔

ترتیب و تہذیب اعلیٰ ہے اور مقالات قیمتی اور ہادیانہ ہیں۔

ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب ایل ایل ڈی ممبر اسمبلی وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

میں نے رسالہ "شاہکار" کا مطالعہ کیا۔ اس کی ظاہری شان اور باطنی خوبیاں ناقابلِ انکار ہیں۔ اس کے علمی اور تعلیمی مضامین بہت بلند پایہ ہیں اور تعلیمات پر اس کی رائے قابلِ وقعت ہوتی ہے۔ ایسے بلند اور مفید علمی رسالے کی ادبِ اردو کو ضرورت تھی۔

مرزا محمد سعید صاحب ایم۔اے۔آئی۔ای۔ایس (ریٹائرڈ) سابق نائب معتمد تعلیمات حکومتِ ہند:۔

مضامین کا انتخاب و ترتیب، مطالب کا مفاد و تنوع۔ تصاویر کی زیبائش اردو صحافت کے لئے مایۂ ناز خیال کئے جا سکتے ہیں۔ یہ امر واقعی ہے کہ شاہکار سے بہتر رسالہ اب تک شائع نہیں ہوا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی۔ پروفیسر لسانیات عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدر آباد دکن):۔

اس قسم کے دیدہ زیب رسالے کی اردو کو بہت سخت ضرورت تھی۔ اگرچہ پنجاب سے اس طرح کے ادبی رسالے نکلتے رہے ہیں لیکن "شاہکار" اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر سب پر سبقت لے گیا ہے۔ خاص کر تحقیقی اور تنقیدی مقالات و مضامین کی وجہ سے اردو کے سنجیدہ اور علمی رسائل میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔ اس پایہ کے اعلیٰ علمی مقالات کے ساتھ ساتھ ظاہر بینوں اور عام دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے مذاق کا بھی خیال رکھنا نہایت مشکل امر ہے اور بڑی خوشی ہوتی ہے جب شاہکار میں دونوں خوبیاں ہم پہلو نظر آتی ہیں۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ۔ ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی۔ لٹ پروفیسر پنجاب یونیورسٹی:۔

"شاہکار" درحقیقت شاہکارِ صحافت ہے۔ گذشتہ بیس سال میں پنجاب کی ادبی فضا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ آج اچھا کہنے والوں اور اچھی سمجھ رکھنے والوں کی تعداد درجنوں سے سینکڑوں ہو چکی ہے۔ اس حیرت افروز انقلاب کے محرکین میں سب سے ممتاز درجہ علامہ تاجور صاحب کا ہے۔ اللہ دے تو عروسِ ادب کو ایسے ہی جاں نثار و خدمت گزار دے۔ کیا نظم اور کیا نثر۔ دونوں میں اس صاحبِ کمال نے نہ صرف خود اعجازِ قلم دکھایا۔ بلکہ بیسیوں کو ادب کی سیدھی راہ پر بھی ڈالا۔ فقیر حقیر بھی ان لوگوں میں ہے جنہیں تاجور صاحب کی تحریر اپنے حلقۂ اثر میں لا کر ہی رہی۔ خدا وہ

"شاہکار" کے متعلق

مقتدر اخبارات و رسائل کی رائوں کے اقتباسات

ڈیلی ٹریبون لاہور :-

"شاہکار" میں موجودہ ترقی یافتہ صحافت کے تمام درخشاں موضوعات
علاوہ بعض جدید ممتاز عنوانات بھی ہیں۔ یہ اپنے آغاز ہی سے
ہا ہے کہ اس کا عزم اردو زبان و ادب کی اصلاح اور اسے
مال بنانے کے سلسلے میں کچھ کر دکھانے کا ہے۔ متعدد
بی زبانوں کی دخل یابی نے یہ خطرہ پیدا کر دیا ہے کہ اردو زبان
ی دیگر غیر صرفی زبانوں کی طرح اپنی قدامت کو خیرباد نہ کہہ دے۔
س کے انسداد کے لیے فاضل ایڈیٹر "شاہکار" نے "بزمِ تحقیق"
کا عنوان قائم کیا ہے۔ ہم اردو صحافت کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اس کی
صف میں ایسا گرانقدر اضافہ ہوا ہے۔"

روزنامہ "احسان" - لاہور

"مولینا تاجور کی ادبی خدمات محتاجِ تعارف نہیں اور جو رسالہ
ان کے زیرِ ادارت شائع ہوگا اُس کے معیار کی بلندی موردِ شک
نہیں ہو سکتی۔

"شاہکار" میں ملک کے مشہور و معروف اور مسلم الثبوت ادیبوں اور
شاعروں کے مضامین نثر و نظم مدرج کئے گئے ہیں اور بجا طور پر یہ کہا جا
سکتا ہے کہ یہ بھرتی کے ایسے مضامین سے خالی ہے جنہیں "ادب"
کے نام سے اکثر رسالے اپنے صفحات پر جگہ دینے کے عادی ہیں۔
رسالے کے اجراء کی غرض ادبی سے زیادہ تعلیمی نظر آتی ہے اور اسی
نقطۂ نگاہ سے اس میں بعض ایسے مضامین بھی موجود ہیں، جو علمی اور
تاریخی تفتیش و تفحص کا نتیجہ ہیں۔"

روزنامہ سیاست لاہور :-

"شاہکار" ظاہری اور باطنی خوبیوں میں بے نظیر ہے۔ اس
پلّہ کا پرچہ آج تک ہندوستان میں جاری نہیں ہوا۔ تراجم کم ہیں اور
تخیلی مضامین کی بہتات ہے۔ علمی اور تحقیقی مضامین نہایت کوشش
سے لکھے گئے ہیں۔ ہندوستان کے تمام مشہور و معروف اہلِ قلم
حضرات کے "شاہکار" میں ایک جگہ نظر آتے ہیں۔
پرچے میں عریانی کی تھوڑی سی جھلک بھی نہیں ہے۔ اس
لئے یہ پرچہ خواتین کے لئے بھی یکساں مفید ہے۔"

روزنامہ پرتاپ - لاہور

"مولینا تاجور نجیب آبادی کے ذوقِ ادب نے پنجاب میں ہمیشہ
اردو ادب کی رہنمائی کی ہے۔ مخزن اور ہمایوں کی جلدیں اُن کے وجدان
سلیم اور ذوقِ صحیح پر شاہد ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے پنجاب کے
اردو ادب میں ایک انقلابی قدم اٹھایا اور "ادبی دنیا" جاری کر کے
رسائل کے لئے ایک بلند معیار مقرر کر دیا۔ "شاہکار" اُن کے اسی
ادبی ذوق کا ایک دل آویز اور شاندار مظاہرہ ہے۔ رسالہ اپنی ظاہری
اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے لاجواب ہے۔"

لاہور کے مشہور ایجنٹ اخبارات کی وفات

ہم نے یہ خبر نہایت افسوس اور رنج سے سُنی کہ لاہور کے مشہور
و قدیمی ایجنٹ میاں غلام محمد رہگیر عالمِ جاودانی ہو گئے ہیں۔ مرحوم
لاہور کے انارکلی چوک میں اخبارات و رسائل فروخت کیا کرتے تھے
اور اس تجارت میں اُنہیں کافی دسترس حاصل تھی۔ نہایت محنتی
دیانتدار اور وسیع الاخلاق انسان تھے۔

ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا اُنہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔
اور اُن کے وابستگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔

(ادارہ)

ایڈیٹر :- پروفیسر تاجور

آنریری ایڈیٹر :- میرزا ادیب بی۔اے

"شاہکار"

بابت ماہ مئی ۱۹۳۷ء

ادارہ :- خواجہ محمود جاوید ایم۔اے

سیّد عبدالرشید یزدانی

جلد ۵

نمبر (۲)

فہرست

تصاویر :- (سہ رنگی) بہار کا تحفہ (یک رنگی) داستانِ دل۔ بے فکری جھیل آنا ساگر (اجمیر) کا ایک منظر۔

ہادی حسن اختر پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار ۹ لوئر مال بیرون بھاٹی دروازہ لاہور سے شائع کیا۔

ایڈیٹر: پروفیسر تاجور
آنریری ایڈیٹر: میرزا ادیب بی۔ اے

ادارہ: خواجہ محمود جاوید ایم۔ اے
سیّد عبدالرشید یزدانی جالندھری

شاہکار لاہور

بابت ماہ جولائی ۱۹۳۷ء

جلد ۵ نمبر ۴

فہرست مضامین

ایم ہادی حسن اختر پرنٹر و پبلشر نے نگینہ پریس بیرون بھاٹی دروازہ گیٹ سرکلر روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر "شاہکار" واقع ۱۵ سرکلر روڈ بیرون موری دروازہ لاہور سے شائع کیا۔

"شاہکار" کے متعلق

اہلِ قلم و اہلِ علم و تعلیم حضرات کی رایوں کے اقتباسات

مولینا عشرت رحمانی رامپوری ایڈیٹر ترکستان دہلی

"درحقیقت آپ کے تجربہ کار ہاتھوں سے جس اعلیٰ و بلند پایہ رسالہ کی ترتیب ہونی چاہیئے وہ "شاہکار" ہے۔ اور صرف "شاہکار"! آپ نے ثابت کر دیا کہ اردو ادب زندہ ہے۔ اور صرف آپ جیسے چند اربابِ ادب کی کوششوں سے۔ میں اس کو آپ کی ادبی زندگی کا نہیں، بلکہ دنیا کے ادب کا شاہکار اور آپ کے حُسنِ ذوق کا کارِ نمایاں کہتا ہوں۔

ترتیبِ مضامین عام تنوع، دلکشی اور علمی مضامین کا دلچسپ انداز ——— خاص طور پر قابلِ داد ہیں۔ تصاویر میں کمال کا آرٹ پیش کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آرٹ اسی کا نام ہے۔

مولینا تمکین کاظمی حیدر آباد دکن

واللہ حد درجہ نفیس پرچہ ہے۔ ترتیب و تدوین اور خاص عنوانات دیکھ کر جی پھڑک گیا۔ خدا اس رسالہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔

مولینا سید عبد القادر ایم۔ اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

مولینا تاجور کی ذاتِ گرامی ادبی ہنگامہ خیزیوں کے لئے علمی حلقوں میں خاص شہرت رکھتی ہے۔ آپ نے اپنے قیامِ پنجاب کے دوران میں اردو علم و ادب کی وہ وہ بیش بہا خدمات انجام دی ہیں جو مستقبل میں حروفِ زریں سے لکھی جائیں گی۔

"شاہکار" کا سرورق دیدہ زیب مضامین اعلیٰ اور تصاویر نہایت عمدہ ہیں۔ دیگر عام رسائل و جرائد کے خلاف اس کے مضامین ٹھوس اور علمی ہیں۔ بھرتی کے مضامین ہنسی پیدا کرنے والے افسانوں سے جو ہنگامی ہوتے ہیں اور فنی طور پر رسالوں کی اشاعت پر اثر ڈال دیا کرتے ہیں امکانی طور پر احتراز کیا گیا ہے۔

خواجہ دل محمد ایم۔ اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

بفضلہ تعالیٰ آپ کا رسالہ اسم بامسمیٰ ہے۔ محاسنِ ظاہری و باطنی سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ نظر فریب بھی ہے اور دلفریب بھی۔ اردو ادب کے لئے آپ کی مساعی جمیلہ قابلِ قدر ہیں۔ خدا آپ کو تا دیر سلامت رکھے۔ آپ کا وجود مغتنمات میں سے ہے۔

ایک تازہ ترین رائے

کل "شاہکار" کا جون نمبر شرف ورود لایا۔ شکریہ قبول فرمائیے۔ "شاہکار" کے متعلق کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے، صرف اسقدر کہا جا سکتا ہے ؎

بہارِ عالم حسنش دل و جاں تازہ مے دارد ٭ برنگ اربابِ صورت را بہ بو اربابِ معنی را

میں علامہ کیفی دہلوی مدظلہٗ کی زبان سے یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ "مولینا تاجور میدانِ صحافت کے فردِ کامل ہیں۔" میرا خیال ہے کہ اگر اس "مجلہ" میں سے تمام مضامین نظم و نثر حذف کر دئے جائیں اور صرف مولانا کے مختصرات رکھے جائیں تب بھی یہ رسالہ اپنی نظیر آپ ہے۔

"سوال و جواب" "تازہ وارادنِ بساطِ ہوائے ادب" کے لئے ایک گرانقدر تحفہ ہے۔ آپ کی رباعی ایک نازک کیفیت کی حامل ہے۔

(سید افضال زیدی) ریاست پٹیالہ

ضروری اطلاع

رسالہ شاہکار اور اردو مرکز دو علیحدہ علیحدہ ادارے ہیں۔ اس لئے قارئینِ شاہکار سے درخواست ہے کہ وہ شاہکار کے متعلق صرف دفتر رسالہ شاہکار ۱۵ سرکلر روڈ کے پتے سے خط و کتابت فرمائیں۔

مینیجر

ایڈیٹر پروفیسر تاجور

ادارہ

رسالہ "شاہکار" لاہور

آنریری ایڈیٹر - میرزا ادیب بی اے

خواجہ محمود جاوید ایم - اے

فہرست

جلد	بابت ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۷ء	نمبر

تین (۳۰۰) سو بلاک

حُسن اور آرٹ کا ذخیرۂ بے بہا

شاہکار کے دفتر میں ۳۵ سہ رنگے اور ۲۷۵ سے اُوپر یک رنگے مطبوعہ بلاک فروخت کیلئے موجود ہیں سہ رنگے بلاک آرٹ کی بلند اور دلکش تصاویر سے بنوائے گئے ہیں۔

ان بلاکوں میں پانچ سات بلاکوں کی بنوائی ۳۵ روپے اور اکثر کی ۴۰ سے ساٹھ روپے تک ادا کی گئی تھی۔

یک رنگے بلاکوں میں تھوڑے سے بلاک پانچ روپے اور ڈھائی سو کے قریب سات روپے سے ۲۵ روپے میں بنوائے گئے تھے۔ ان سہ رنگے اور یک رنگے بلاکوں میں بہت سے بلاک اتنے شاندار ہیں کہ یورپ کے پرچوں میں بھی آرٹ کی ایسی دلکش تصاویر نہیں چھپی ہوں گی۔

کم و بیش پانچہزار روپیہ بےنظیر تصاویر کی خریداری اور اُن کے بنوائی پر صرف ہوا ہے۔

آرٹ اور حسن کے اس گنج شائگاں کو یکجائی طور پر فروخت کرنا مقصود ہے۔ اپنے اخبارات کے سنڈے ایڈیشنوں رسالوں کے عام خاص نمبروں کو معاصرین سے ممتاز بنانے کیلئے اس ذخیرہ خریدنے والے کو کئی سال کیلئے تصاویر کی فراہمی اور بلاکوں کی بنوائی سے بےفکری ہو جائے گی۔

ضرورت مند حضرات منیجر رسالہ شاہکار مزنگ لاہور کے دفتر میں خود تشریف لاکر ملاحظہ فرما سکتے ہیں

منیجر رسالہ "شاہکار" مزنگ لاہور

مختصرات

آزاد پنجاب کی جدید حکومت

پنجاب کی اتحاد پارٹی اپنے جمہوری اصول و جمہوری ساخت اور سابقہ سیزدہ ۱۳ سالہ حسن خدمات کے سبب صوبے کے رائے دہندوں کا اعتماد حاصل کرنے میں قابلِ رشک حد تک کامیاب ہوئی ہے۔ قدرتاً صوبے کی عنانِ حکومت اس کے ہاتھ میں آنی چاہیئے تھی اور آئی۔ سر سکندر حیات خاں صاحب پارٹی لیڈر نے ہر طبقے کی نمائندگی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پہلے کابینۂ وزارت میں ایسے حضرات کو شامل کیا ہے جو اپنی اپنی جگہ اپنی امتیازی خصوصیات کی بنا پر وزارت کے لئے سب سے موزوں خیال کئے جا سکتے ہیں۔

کابینۂ وزارت کی تشکیل:۔

چنانچہ جدید کابینۂ وزارت میں حسب ذیل حضرات شامل کئے گئے ہیں

(۱) سر سکندر حیات خاں صاحب۔ سابق گورنر پنجاب۔
(۲) سر سندر سنگھ مجیٹھیا سابق ریونیو ممبر پنجاب گورنمنٹ۔
(۳) راؤ بہادر چودھری چھوٹو رام سابق وزیر تعلیم پنجاب۔
(۴) میاں عبدالحی صاحب ایڈووکیٹ سابق ایم۔ ایل۔ اے
(۵) میجر خضر حیات خانصاحب ٹوانہ (کالرہ اسٹیٹ)
(۶) مسٹر منوہر لال بار ایٹ لا سابق وزیر تعلیم پنجاب۔

موجودہ حالات میں اس سے موزوں ترکیبنٹ نہیں بنائی جا سکتی تھی۔ ہمارے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں صاحب مدتوں پنجاب گورنمنٹ کے ریونیو ممبر، ریزرو بینک کے ڈپٹی گورنر رہ چکے ہیں۔ حکومتی معاملات میں ان کا تجربہ بہت وسیع ہے۔ یوں بھی وہ تمام صوبے میں بے امتیاز مذہب و ملت ہر دلعزیز ہیں۔ اُن کے گورنر ہونے پر تمام ملک کے مسلم و غیر مسلم پریس اور سیاسی رہنماؤں نے اظہار مسرت و اطمینان کیا تھا۔

راؤ بہادر چودھری چھوٹو رام ایڈووکیٹ ایک قابل قانون دان ہونے کے ساتھ رہتک ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین اور پنجاب گورنمنٹ کے وزیر تعلیم رہ چکے ہیں۔

سر سندر سنگھ مجیٹھیا کئی سال تک گورنر کی ایگزیکٹو کونسل میں ریونیو ممبر کی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

مسٹر منوہر لال بار ایٹ لا بہت بڑے ماہر اقتصادیات ہیں اور چار سال تک پنجاب کے وزیر تعلیم رہ چکے ہیں۔

البتہ اس کابینے میں دو حضرات جدید نظر آتے ہیں۔

میاں عبدالحی ایڈووکیٹ اپنی قابل رشک قانونی قابلیت کی وجہ سے سارے صوبے سے روشناس ہیں۔ لدھیانہ میونسپل بورڈ کے سالہا سال تک چیئرمین اور سات سال مجلس قانون ساز ہند (لیجسلیٹو اسمبلی) کے سرگرم کار ممبر کی حیثیت میں ملک و ملت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ جدید حکومت میں ان کا انتخاب بحیثیت وزیر تعلیم بہت موزوں انتخاب ہے

میجر خضر حیات خاں ٹوانہ ہمارے صوبے کے جواں سال و جواں بخت و جواں کار وزیر ہیں۔ پنجاب کا سب سے بڑا تعلقہ کالرہ اسٹیٹ ہے۔

میجر خضر حیات خاں صاحب اس اسٹیٹ کے مالک ہیں۔ کالرہ اسٹیٹ کا نظم و نسق میجر صاحب کی بیدار مغزی اور حسنِ انتظام کے سبب برطانوی پنجاب کے بندوبست سے بہت بہتر حالت میں ہے۔ امید ہے اپنے ریاستی انتظام کے متعلق مفید تجربات سے وہ موجودہ وزارت میں کام لیں گے۔

مذکورہ کابینۂ وزارت اپنی گوناگوں خصوصیات کے سبب موجودہ حالات میں حقیقتہً بہت موزوں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حکومت کی مخالف پارٹی بھی قابلیت و اہمیت میں اس کابینے سے کسی حیثیت میں کم نہیں اور اگر یہ پارٹی جدید دستورِ حکومت سے تعاون کر سکتی تو اس میں متعدد حضرات قلمدانِ وزارت کے مستحق تھے۔ لیکن بدقسمتی سے اس جماعت نے جدید دستورِ حکومت کی تخریب کو اپنا نصب العین بنا لیا اور اس طرح صوبہ اُن کے بہترین افراد کی خدمت سے محروم ہو گیا۔ بہرحال مخالف حکومت جماعت کی قابلیت اور قابلِ تنقید و محاسبے سے حکومت کے ارباب حل و عقد زیادہ احتیاط و حزم سے حکومتی نظام کو چلا سکیں گے۔

جدید حکومت سے پبلک کی توقعات:۔

اتحاد پارٹی نے اپنے مینوفیسٹو میں جن بلند اغراض و مقاصد کا اعلان کرکے پبلک سے اپنے لئے ووٹ طلب کئے تھے۔ پبلک اپنے اظہار اعتماد کے فرض سے سبکدوش ہو چکی ہے۔ اب جدید حکومت کی جانب سارے پنجاب کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ اہل پنجاب نئی حکومت سے بجا طور پر یہ امید رکھتے ہیں کہ

(۱) وہ حالات کی سازگاری کے ساتھ ساتھ اپنے زریں وعدوں کے ایفا میں تاخیر و تعطل کو جائز نہ سمجھے گی۔

(۲) اسی کے ساتھ یہ بھی توقع بے جا نہیں کہ صوبے کی موجودہ گورنمنٹ اقلیتوں کے جذبات و حقوق کا احترام کرتے ہوئے اپنی فراخ دلی و حق پژوہی کا ثبوت دیتی رہے گی۔

(۳) پنجاب کے ساہوکاروں اور زمینداروں، پھر زمینداروں اور کاشتکاروں کے باہمی خلفشار کو کسی ایسے منصفانہ طریق عمل کے ساتھ مٹائے گی جو ہر فریق کے لئے قابل قبول ہو سکے۔

(۴) یہ صوبہ فرقہ وارانہ مناقشوں سے مفلوج ہو چکا ہے۔ فرقہ پرست اخبارات مذہب کے نام پر صوبے کے امن و امان کو خطرے میں ڈالنے کے لئے ہر وقت آمادۂ فسق و فجور رہتے ہیں۔ جدید حکومت اس صوبے کے لئے پریس ایکٹ میں اگر کچھ ایسے قوانین کا اضافہ کر سکی جن کے نفاذ سے فرقہ وارانہ اخبار نویسی مجال نشو و نما سے محروم ہو جائے تو حکومت کی یہ خدمت پنجاب بلکہ ہندوستان کی تاریخ حکومت میں زندگی جاوداں حاصل کرے گی۔

(۵) صوبے میں بے کاری اور بے روزگاری کے انسداد کی اشد ضرورت ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بے کاری کے زیر اثر فاقہ کشی کی اٹل مصیبت خودکشی کی وارداتوں کو عام بنا رہی ہے۔ اس کے علاوہ عام بیکاری کے سبب سکہ سازی، رہزنی، جعل کاری کے جرائم کی رفتار تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ہر مہذب حکومت کا یہ فرض ہے کہ لوگوں کے لئے کام اور کام نہ میسر ہو تو قوت لایموت کا انصرام کرے۔ حکومت پنجاب کو پہلی فرصت میں اس دہشت ناک بے کاری کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہو گی۔

(۶) اہل دیہات صحت و زندگی کے مبادیات سے بھی بے خبر ہیں۔ صحت بخش آب و ہوا کے باوجود ان میں اموات کا اوسط روبہ ترقی ہے۔ ضرورت ہے کہ امکان بھر دیہاتی شفاخانوں کا جال صوبے کی ساری آبادی و فضا میں پھیلا دیا جائے۔

(۷) زراعتی پیداوار کے مقابلے میں زرعی لگان، مالکانہ و آبیانے کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ اس لئے اراضی پر لگان وغیرہ لگانے کی بجائے پیداوار کی مقدار پر لگان لگانے کا سسٹم رائج کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

(۸) ابتدائی تعلیم اگرچہ اتحاد پارٹی کی مساعی سے روبہ ترقی ہے لیکن تعلیم حتی الامکان لازمی اور مفت ہونی چاہیئے۔ اور تعلیم کی نوعیت ادبی کی بجائے زرعی اور صنعتی ہونی ضروری ہے۔ ادبی تعلیم سے طالبعلم دھوبی کے کتے کی طرح گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ بے کاری کا انسداد بھی اسی طرح ہو سکتا ہے کہ صنعت و حرفت کے کارخانے جا بجا قائم کئے جائیں۔ ہمیں بابوؤں اور کلرکوں کی ضرورت نہیں بلکہ پڑھے لکھے اور جدید زراعتی طریقوں سے واقف کسانوں اور تعلیم یافتہ پیشہ وروں کی ضرورت ہے۔

(۹) پنجاب میں تعلیم کی کمی نہیں لیکن تربیت کا فقدان افسوسناک حد تک پہنچ گیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ تعلیم بے تربیت سے جہالت ہزار درجہ بہتر ہے کہ کیرکٹر تو کچھ نہ کچھ باقی رہتا ہے۔

موجودہ طریقۂ تعلیم تو نوجوانوں کے اخلاق و عادات کو تباہ کرنے کا موجب بن رہا ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں غنڈا پن خوفناک حد تک بڑھ گیا ہے۔

اس امر خاص میں تو وزیر تعلیم کو جمہوری قوانین کو بروئے کار لانے کی بجائے ڈکٹیٹر بننے کی ضرورت ہے۔

ہمارے نئے وزیر تعلیم

جدید کابینۂ حکومت میں آنریبل میاں عبدالحی صاحب وزیر تعلیم مقرر ہوئے ہیں۔ ہم اس تقرر پر شاہکار اور اس کے قارئین کی جانب سے جن میں زیادہ تر تعلیمی کارکنوں کی ہے۔ میاں صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے نئے وزیر تعلیم کا عہد وزارت ہر حیثیت سے کامیاب ہو گا۔

آنریبل وزیر سے تعلیمی حلقوں کے حسب ذیل مطالبات، ضروریات اور مشکلات التفات طلب ہیں۔

(۱) ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے استادوں کی قلت مشاہرہ و کثرت کار کے سبب بہت ذلیل حالت ہے۔

ان کے حقوق خدمت کی حمایت و حفاظت کا کوئی ذمہ دار نہیں بنتا۔ ان کو اچھی غذا میسر نہیں، وہ عیالداری کی ختم نہ ہونے والی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ اپنے بچوں کی پرورش کے تفکرات کے سبب زندگی کے اطمینان سے محروم ہیں۔

آنریبل وزیر کو اس قابلِ رحم جماعت کے حالِ زار پر توجہ فرما کر ٹائم اسکیل سسٹم جاری فرمانا چاہیئے تاکہ ہر استاد کو اپنے وقت پر حسب استحقاق ترقی مل جایا کرے۔ اُنہیں گریڈ کے لئے افسران تعلیم کے آستانوں پر جبہ سائی نہ کرنی پڑے۔ صورت حال یہ ہے کہ اکثر اساتذہ ساری تعلیمی زندگی پہلے گریڈ ہی پر ختم کر دیتے ہیں کوئی اُن بیکسوں کا پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ پریشان خاطری، ناداری، فلاکت اور محرومیٔ استحقاق کے پامال استاد اپنے شاگردوں میں بلند نظری اور رفعت حوصلہ کیوں کر پیدا کر سکتے ہیں؟

(۲) اردو زبان اس صوبے کی تعلیمی زبان ہے اور یہی ملک کی لینگوا فرنیکا بھی ہے۔ لیکن اردو کا مستقبل اب صرف پنجاب سے وابستہ ہو گیا ہے کیونکہ دوسرے صوبوں میں اکثریت کا ظالمانہ اقتدار اس ہمہ رس وہمہ گیر زبان کو مٹانے پر تُلا ہوا ہے۔

پنجاب میں بھی اگر اردو کو مجال نشو ونما نہ ملی تو پھر اس کا خدا ہی حافظ ہے۔

پنجاب یونیورسٹی (جو اس صوبے کا مرکزی تعلیمی ادارہ ہے) اردو کے حقوق کو ابتدائے قیام سے نقصان پہنچا رہی ہے۔

اِدھر محکمۂ تعلیمات میں اس کی اشاعت کچھ نہ کچھ ہو رہی ہے مگر اس کے حقوق کی جانب سے سب کی آنکھیں بند ہیں۔ آنریبل وزیر تعلیم سے یہ توقع بیجا نہیں کہ پنجابی اور ہندی کی حق تلفی کئے بغیر پنجاب یونیورسٹی اور محکمۂ تعلیمات کو اردو زبان کی حفاظت اور حق رسی پر مجبور کریں گے۔

(۳) محکمہ تعلیم اور پنجاب کا ایجوکیشنل ایڈوائزری بورڈ جیسے پنجاب کی چند بڑی بڑی پبلشنگ فرموں کا تسلط نرغے میں لئے ہوئے ہے۔ وزیرِ تعلیم کی توجہ کا خاص طور پر مستحق ہے۔

حالت یہ ہے کہ چند سرمایہ دار پبلشر سالہا سال سے سارے محکمۂ تعلیم کے شرائین میں خون زندگی بن کر پھیر رہے ہیں۔

معمولی قابلیت کے لوگوں سے سستی اُجرتوں پر اغلاط واسقام سے معمور درسی کتابیں تیار کرا کے اپنے ہمہ رس رسوخ کے بل پر منظور کرانے والے چند اجارہ دار پبلشروں نے قابل سے قابل مصنفین اور دیانتدار کارکن مگر بے رسوخ پبلشروں کے لئے یہ راستہ بند کر رکھا ہے۔

آنریبل وزیر تعلیم کا عہد وزارت بہت ہی مبارک ہوگا، اگر وہ بڑے بڑے پبلشروں کی دائمی اجارہ داری سے محکمۂ تعلیم اور ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ کو نجات دلا سکیں گے۔ مقررڈ ریٹ کی بے مایہ درسی کتابوں کی ترویج واشاعت پنجاب کی تعلیمی عظمت ورفعت کے حق میں ہلاکت آفریں بن رہی ہے۔ صوبے کا تعلیمی مستقبل اس مردہ اور افسردہ لٹریچر کی اشاعت وترویج سے تاریک ہو رہا ہے۔

(۴) ہماری مشرقی زبانیں محکمۂ تعلیم اور پنجاب یونیورسٹی میں حفاظت حمایت اور حق رسی سے محروم ہو رہی ہیں۔

محکمۂ تعلیم پنجاب میں مولوی فاضل، منشی فاضل، شاستری پاس اور ویٹیل ٹیچروں کو۔ ایس وی اور ڈرل ماسٹروں کے ساتھ نتھی کر دیا گیا ہے۔ ان سب کا گریڈ ایک ہی ہے ابتدائی تنخواہ اور تدریجی ترقی کی شرح بھی ایک ہی ہے۔ اس سے زیادہ بدسناسی، بے شناسی اور بے امتیازی اور کیا ہو سکتی ہے۔

ایک ایس وی ٹیچر فارسی بلکہ صحیح معنی میں ہائی جماعتوں کو اردو بھی نہیں پڑھا سکتا۔ اس کے لئے موزوں مقام کار مڈل اسکول ہیں۔

مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل، شاستری، گیانی اور ہندی آنرز پاس کرنے والے اساتذہ ہی نویں اور دسویں جماعتوں کو مشرقی اور ملکی زبانوں کی تعلیم دینے کے مجاز ہو سکتے ہیں۔ ایس وی ٹیچر جائز طور پر اُن کے قائم مقام کسی طرح نہیں بنائے جا سکتے۔ مگر ہو یہی رہا ہے کہ نویں دسویں جماعتوں کی فارسی اور اردو کی تعلیم منشی فاضل اور ادیب فاضل کی بجائے ایس وی ٹیچروں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔

آنریبل وزیر تعلیم کو اس بے امتیازی کو دُور کرنے کی جانب توجہ مبذول کرنی چاہیئے۔

(۵) پنجاب کے دور دراز اضلاع میں بہت سے قابل کارکن، مستحق اور سینئر اساتذہ اور افسرانِ معائنہ "از دیدہ دُور از دل دُور" کا مصداق بن کر ترقیوں کے حق سے محروم رہنے کے سبب احساس تلخ کامی میں بیدلانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ محترم وزیر تعلیم کو نگاہ دوربین سے کام لے کر ان "دُورانِ باخبر" کی حق رسی کرنی چاہیئے!

ہمیں اپنے جدید وزیر تعلیم کی بیدار مغزی، حق رسانی اور قدر شناسی سے توقع ہے کہ وہ مذکورہ بالا عرضداشت کو پیشِ نظر رکھ کر ان حالات سے ذاتی واقفیت بہم پہنچائیں گے۔ اور جرأت وپامردی سے ان بدعنوانیوں، بے ضابطگیوں اور بے امتیازیوں کو تعلیمات کے دائرے میں زندہ رہنے اور پیدا ہونے کی اجازت نہ دیں گے۔

نواب احمد یار خاں دولتانہ

جدید کابینۂ وزارت میں خان بہادر نواب احمد یار خاں دولتانہ کا نام

نہ دیکھ کر اہلِ نظر کو متاسفانہ حیرت ہوئی ہے۔

نواب صاحب کے مسلسل ایثار، مسلسل جاں فشانی اور بے شمار زرپاشی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اتحاد پارٹی اپنے افراد کے باہمی اختلافِ طبائع کے باوجود آج تک متحد و منظم اور چٹان کی طرح اپنے مجوزہ اصول پر کاربند رہ سکی۔ اکثر مواقع ایسے درپیش ہوئے کہ نواب صاحب کی ذات ضبط کی نگراں نہ ہوتی تو پارٹی افتراق و تشتت کی نذر ہو جاتی۔ نواب دولتانہ نے تمام وقت، سرمائے، اور انرجی کو بے دریغ پارٹی کی تنظیم پر نثار کر دیا اور پھر اس قابلِ قدر ایثار کے ساتھ کہ کبھی نمایاں ہونے کی سعی نہیں کی یہ ہی نہیں بلکہ اپنی سربراہی کے جائز حقوق کو بھی پسِ پشت ڈالتے رہے۔

آپ نے پارٹی کے نصب العین، اصول اور مقاصد کا پروپیگنڈا ایسے منظم موثر، متین اور حاوی طریقے سے کیا کہ صوبے کے رائے دہندوں پر مخالف پارٹیوں کے غوغائے عام کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اور سارا پنجاب پارٹی کا حامی بن گیا۔

ایسے ایثار پیشہ، مخلص اور دیوانہ کار رہنما کا نام کابینۂ وزارت میں نہ دیکھ کر ہر سوجھ بوجھ رکھنے والے دماغ کو حیرت بھی ہے اور افسوس بھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ پارٹی کو تقسیم و تفریق سے بچانے کی خاطر نواب صاحب موصوف نے اپنے حقوقِ سرفرازی کو پھر نظر انداز کیا ہے

یہ سچ ہے کہ وہ اپنے حقِ وزارت سے دست کش ہونے پر مجبور ہوئے۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ایثار و قربانی کی ایک قابلِ صد فخر و مباہات مثال قائم کر کے انہوں نے پنجاب کی تاریخ سیاسیات میں غیر فانی عزت حاصل کر لی ہے۔

انسپکٹران مدارس کے خلاف غوغائے بے ہنگام

خدا جانے اہلِ ملک کی یہ ذلیل ذہنیت کب تک فضائے امن کو مکدر بناتی رہے گی کہ وہ کسی اچھے سے اچھے سرکاری کارکن کو صرف اس وجہ سے، کہ وہ مذہبی عقاید میں اُن کا ہمنوا نہیں ناقابلِ برداشت تصور کرنے لگتے ہیں۔

آئے دن اخبارات کے کالم کے کالم اسی قسم کی بہتان طرازیوں سے سیاہ نظر آتے ہیں کہ فلاں افسر ہندوؤں کے حقوق پامال کر رہا ہے اور فلاں سرکاری عہدیدار مفادِ ملت کو تباہ کئے ڈالتا ہے۔

تعلیمی لائن میں تو یہ مرض وبائی صورت اختیار کر چکا ہے۔

سوڈھی جگجیت سنگھ ایک مرنجاں مرنج طبیعت کے افسر تعلیم ہیں لیکن اُن کا سکھ ہونا اُن کو ہدفِ طعن و تشنیع بنائے ہوئے ہے۔ حالانکہ وہ بہت ہی غیر متعصب انسان ہیں۔ لیکن جس مدرس کو وہ ضبط قائم رکھنے کے سرزنش کر دیں اگر وہ سوءِ اتفاق سے ہندو یا مسلمان ہو تو اخبارات میں اُن کے تعصب کی فرضی داستانیں شائع کر کے ایک طوفان برپا کر دیا جاتا ہے

اب کچھ دنوں سے مولوی سید بشیر محمد ترمذی افسر تعلیم منٹگمری کے خلاف ہندو پریس میں یورش ہو رہی ہے۔ سید صاحب کو متعصب کہنا حقیقتاً ظالمانہ بہتان آرائی ہے۔ اُن کے ہزاروں واقفانِ حال میں اپنے ضمیر سے جنگ کئے بغیر انہیں متعصب کوئی نہ کہہ سکے گا۔

اُن کے مفروضہ تعصب کے خلاف ہندو پریس کا پروپیگنڈا دیکھ کر منٹگمری ڈسٹرکٹ بورڈ کی تعلیمی کمیٹی کے ذمہ دار چیئرمین کو جو سکھ قوم کے ایک معزز ممبر ہیں تردیدی اعلان کرنا پڑا۔

اس اعلان کو پڑھ کر ہر منصف مزاج آدمی بہتان تراشنے والوں کی کمینہ ذہنیت اور ہندو پریس کی غیر ذمہ داری کا اندازہ کر سکے گا۔ سردار صاحب کی حق پژوہی قابلِ صد ہزار تحسین ہے کہ انہوں نے آجکل کی ذلیل روش سے الگ ہو کر سید صاحب کے خلاف جو طوفان اٹھایا جا رہا تھا اس کی پردہ دری کی۔ سردار صاحب کا یہ بہادرانہ اقدام ہر ذمہ دار ہندو مسلم اور سکھ کے لئے قابلِ تقلید ہے۔

کسی فرقے کے شرپسند لوگ جب اپنے مذہبی تعصب کی انگیخت پر کسی دیانتدار افسر کے خلاف فرضی داستانیں تراش کر ہنگامہ برپا کرنے لگیں تو ہر ذمہ دار انسان کا فرض ہے کہ سردار صاحب کی پیروی کرتے ہوئے اس کی حمایت و حفاظت کرے۔

انسپکٹر مدارس اپنے حلقے کے مدارس، مدرسین اور تعلیم کا ذمہ دار ہوتا ہے، وہ سب کو خوش نہیں کر سکتا۔ اُسے اپنے تعلیمی ماحول پر ضبط قائم رکھنے کیلئے بعض اوقات بعض مدرسین کو الگ بھی کرنا پڑتا ہے۔ کسی کی ترقی بند کرنی پڑ جاتی ہے۔ کسی کا تنزل اُس کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کسی کا تبادلہ مقامی مصلحت کا تقاضا بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ناخوشگوار کام ہے لیکن ایک فرض کے طور پر ان کا انجام دینا ضروری ہے۔ پھر اگر اس قسم کے فرائض کی انجام دہی پر اُسے کوچہ و بازار میں رسوا کیا جانے لگے تو وہ اپنے حلقے کے تعلیمی انتظام کو کیوں کر چلا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ جو افسران تعصب کی لعنت میں واقعی طور پر مبتلا ہیں وہ ہرگز کسی ہمدردی کے مستحق نہیں۔ اس لئے کہ کسی کو مذہبی اختلاف کی بنا پر سزا دینا انتہا درجے کی درندگی ہے، ناقابلِ عفو گناہ ہے۔ اگر کسی افسر تعلیم کے تعصب کا ثبوت

مل جائے تو یقیناً محکمے کو بلا پس وپیش اُسے بتا دینا چاہیئے کہ سینکڑوں بندگانِ خدا تمہارے رحم پر نہیں چھوڑے جا سکتے ۔

لیکن ہر کس وناکس کی غیر ذمہ دارانہ شکایت پر کسی افسر کے خلاف تعصب کا فتویٰ لگا کر اُسے اخبارات میں بدنام کرنا بھی حد درجہ ناروا ہے ۔

یوپی کی صنعتی وزراعتی نمائش

ناجور

یوپی کی حکومت نے وسیع پیمانے پر ایک صنعتی وزراعتی نمائش منعقد کی تھی ۔ یہ نمائش ۱۵ دسمبر ۳۶ء کو انعقاد پذیر ہوئی تھی اور ۱۴ فروری ۳۷ء کو بکامیابی اختتام کو پہنچی ۔

اس نمائش کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ لکھنؤ کی ۱۳۰ ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی تھی اور مفصلہ ذیل شعبوں پر مشتمل تھی ۔

(۱) پارچہ بافی (۵) شکر سازی (۹) فنون لطیفہ
(۲) تعلیم (۶) کیمیا سازی (۱۰) فوٹوگرافی
(۳) برقیات (۷) آلات (انجینئرنگ) (۱۱) تفریحات
(۴) زراعت (۸) دستکاری

اس نمائش میں متعدد ریاستوں نے بھی حصہ لیا تھا ۔ چنانچہ حیدرآباد میسور ، گوالیار ، اندور وغیرہ کی مصنوعات اور زراعت سے تعلق رکھنے والی اشیاء بھی موجود تھیں ۔ غرض یہ نمائش برطانوی ہند اور ریاستوں کی بست و ہفت سالہ صنعتی وزراعتی ترقی کی آئینہ دار تھی ۔

پارچہ بافی کے شعبے نے حکومت صوبجات متحدہ کی تحریکِ اصلاح دیہات سے متعلق دستی کرگھے ، چرخے ، نیز بنائی اور کتائی کے دوسرے آلات کی نمائش کی تھی ۔ پارچہ بافی سے متعلق مشینوں کا مقابلہ بھی ہوا تھا جس میں المورہ اور بہار نے انعام حاصل کئے ۔ ریشم اور انڈی کے کیڑوں کی پرورش اور ان سے ریشم حاصل کرنے کے طریقے بھی دکھائی گئے تھے ۔

شعبۂ زراعت میں شکر سازی ، روغن سازی ، اور دودھ دینے والے جانوروں کی پرورش کے طریقے پیش کئے گئے تھے ۔ کھیت کی جتائی ، تخم ریزی ، کھیتی اور چارا کی کٹائی وغیرہ کے آلات کی نمائش کی گئی تھی ، قدیم و جدید طریقوں سے کاشت کر کے واضح کیا گیا تھا کہ جدید طریقے سے کھیتی کی جائے تو پیداوار میں کسقدر اضافہ ہو سکتا ہے ۔ فصلوں کو پتنگوں اور کیڑوں سے محفوظ رکھنے کے طریقے بھی بتائے گئے تھے ۔

انجینئری کے شعبے میں ہندوستانی سامان سے ہندوستانی انجینئروں کی ساختہ مشینیں دکھائی گئی تھیں ۔ یہ مشینیں یا تو ہندوستانیوں کی ایجاد تھیں ، یا ولایتی مشینوں کی نقل ، یا ہندوستان کی پرانی مشینوں کی تجدید ۔ ان میں سلائی کی مشین خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو "اوشا" کے نام سے پیش کی گئی تھی ۔

کیمیکل کے سلسلے میں آیورویدک ، یونانی ، ایلوپیتھی ، ہومیوپیتھی دوائیں تھیں جو بنگال کیمیکل ورکس ، ہندوستانی دواخانہ دہلی ، انڈین میڈیکل سپلائی کمپنی وغیرہ کی پیش کردہ تھیں ۔ ان چیزوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا ہندوستان نے اس شعبے میں کہاں تک ترقی کی ہے ۔

شعبۂ تعلیمات میں تاریخی اور جغرافیائی چیزیں پیش کی گئی تھیں اور بڑے بڑے چارٹروں اور تصویروں کے ذریعہ تعلیمی رفتار دکھائی گئی تھی یوپی کے ضلع اسکول کے طلبہ کی ورزشوں اور کسرتوں کی نمائش بھی کی گئی تھی ۔ اگر بچوں کے ایسے ٹورنامنٹ ہر سال ہوا کریں تو ان میں ورزش کا شوق ترقی کر سکتا ہے جس سے ان کی صحت میں مدد مل سکتی ہے ۔

نمائش کا شعبۂ فنون لطیفہ خاص اہمیت رکھتا تھا ۔ اس میں مصوری اور فوٹوگرافی کے بہترین نمونے ہیں ۔ عہد حاضرہ کے ۱۸۷ مصوروں نے ۵۰۱ تصویریں بھیجی تھیں ۔ ان تصویروں میں ۴۸ تصویریں مغربی مذاق کی تھیں باقی مشرقی مذاق کی آئینہ دار تھیں ۔ ان تصویروں کے دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ ہندوستانی مصور مغربی مذاق کے ماتحت فن تصویر کی تحصیل کرنے کے باوجود اپنے مشرقی طرز کو عزیز رکھتے ہیں ۔ اور ان کے دلوں میں اس کی بقا و ترقی کا جذبہ کارفرما ہے ۔ کچھ تصویریں یورپ سے بھی آئی تھیں ۔ ان کے دیکھنے سے مغربی فوٹوگرافی کا کمال ظاہر ہوتا تھا ۔ جو مصوری کی حد تک پہنچ رہی ہے اونندا ٹھاکر (بنگال ٹیگور اسکول) کی تصویریں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر تھیں ۔

ہندوستانی اکاڈیمی کا سالانہ اجلاس

ہندوستانی اکاڈیمی کا پانچواں سالانہ اجلاس اس سال بمقام لکھنؤ نمائش کے سلسلے میں منعقد ہوا تھا ۔ سابق وزیر تعلیم رائے راجیشور بلی نے اجلاس کی صدارت کی تھی ۔ اور سر سپرو نے اس کا افتتاح کیا تھا ۔

سر سپرو نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی کہ کسی ملک کی تعلیم غیر ملکی زبان میں نہیں ہونی چاہیئے ۔ ہندی میں سنسکرت کی کثرت اور اردو میں عربی فارسی کی بھرمار کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ اگر اسی صورت حال کو جاری رہنے دیا گیا تو ۲۵ سال کے عرصے میں ہندو مسلمان ترجمان

کے بغیر آپس میں گفتگو بھی نہ کر سکیں گے۔

صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں سر سپرو کے خیالات کی تائید کی اور مشورہ دیا کہ ہندی اردو کا ایک مشترکہ لغت تیار ہونا چاہیئے۔

اس اجلاس میں اردو ہندی میں ساتھ ساتھ اور علیحدہ علیحدہ متعدد مضامین پڑھے گئے۔ اکثر مضامین میں زور دیا گیا تھا کہ دونوں زبانیں باہم ملا دی جائیں۔ ایک مضمون اس موضوع پر تھا کہ دونوں زبانیں ایک کر دی جائیں اور رسم الخط رومن اختیار کیا جائے۔

اس پر بحث و گفتگو کا دروازہ کھل گیا، بعض اصحاب نے مذاق میں ٹال دینا چاہا لیکن پرنسپل ہیرا لال کی تقریر نے بحث میں سنجیدگی پیدا کر دی۔ انہوں نے کہا "اب وقت آگیا ہے کہ ہم رسم الخط کے مسئلے پر بھی غور کریں"۔ رائے بہادر پنڈت سکھدیو بہاری مصر نے بھی تقریر کی اور کہا کہ جب اقتضائے حال یہی ہے تو ہمیں طوعاً و کرہاً رومن کو قبول کر لینا چاہیئے۔

سر سپرو کا اندیشہ

سر سپرو کا یہ اندیشہ کہ اگر ہندی میں سنسکرت اور اردو میں عربی و فارسی کے الفاظ کا استعمال اسی طرح ترقی پذیر رہا تو ۲۵ برس میں ہندو مسلمان کو ترجمان کے بغیر گفتگو کرنا ناممکن ہو جائے گا، شاید بعض حضرات کو مبالغہ آمیز معلوم ہو، لیکن درحقیقت انہوں نے بالکل درست فرمایا ہے۔ ہندی کا مشہور ماہنامہ "مادھوری" لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے، جو اردو کا مرکز ہے۔ اور "مادھوری" کے مالک اور مدیر کی زبان یقیناً اردو ہوگی، لیکن اسی رسالہ میں اسی اکاڈیمی کے اجلاس پر ایڈیٹر نے جو شذرہ لکھا ہے اس کی زبان ملاحظہ فرمائیے:۔

"پر درشنی کے سمبندھ میں ہی ہندوستانی اکاڈیمی کے پنچم ساہتیہ سمیلن کا ادھیویشن ہوا۔ اس ادسر پر ادھیکچھ پد سے شری یت رائے راجیشوربلی کا جو بھاشن ہوا تھا وہ وچار نٹریہ ہے۔ انہوں نے اس کٹھن کا پورنٹر روپ سے پرتیواد کیا کہ اکاڈیمی کا ادیشّ ایک نئی بھاشا نکالنے کا ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہندی اردو کے سرووتم ہلیتوں کو ہانی پہنچنے کی سمبھاونا ہے۔"

چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہمارا وچار ہے کہ اس پرکار کے پرتی وادندوی وچار رکھنا اپنی دیو یک مدھی کو بھلا دینا ہے۔ آج سے آج دیچاروں کو پرکٹ کیا جائے اور بھاشا سوشٹھو اور لاستید میں کمی نہ آنے پائے۔ اس کے لئے ادشکتا ہوگی پر بیھا شک شبدوں کی۔"

بتائیے قارئین شاہکار میں فیصدی کتنے ایسے اصحاب ہوں گے۔ جو "مادھوری" کی مذکورہ بالا سطروں کا صحیح مطلب سمجھ سکیں گے؟ یہاں تک تو نوبت پہنچ چکی ہے اور ہندی کے حامیوں میں روز بروز یہ جذبہ ترقی کرتا جا رہا ہے کہ عربی و فارسی کے جتنے الفاظ ہندی زبان کا جزو بن گئے ہیں سب کو خارج کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک بڑی تعداد نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات کے وضع کرنے میں مصروف ہے اور ان کا استعمال سرعت سے ترقی کر رہا ہے۔

اردو کے مرکز میں ہندی کی ترقی

نمائش کے سلسلے میں باری باری سے دو روز اردو اور ہندی کا مشاعرہ بھی ہوا تھا۔ ہندی مشاعرہ (کوی سمیلن) کے متعلق رسالہ مادھوری لکھتا ہے:۔

"کوی سمیلن (ہندی مشاعرہ) خاص طور پر کامیاب رہا اور اس کے لئے کارکن مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس کامیابی کا معیار اس طرح اور زیادہ ہو جاتا ہے کہ لکھنؤ صدیوں سے اردو کا مرکز رہا ہے اور سمیلن (ہندی مشاعرہ) کی تاریخ سے پہلے آل انڈیا مشاعرہ کا اجلاس ختم ہوا تھا۔ دونوں روز حاضری امید افزا تھی۔ اس سمیلن سے کئی قابلِ غور باتیں واضح صورت سے سامنے آئیں۔ ایک تو یہ کہ ہندی کے متعلق لوگوں کا شوق ترقی کر رہا ہے، یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ہندی کی تعلیم کے باعث طلبہ ہندی کے اہلِ قلم اور شعراء کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے اور سننے کے خواہش مند ہیں۔" (ترجمۃً)

"مادھوری" کے لکھنے کا مطلب ظاہر ہے، جو لوگ ہندی سے بے بہرہ تھے اور اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں جن کی زبان اردو تھی وہ اب ہندی کی جانب مائل ہو چکے ہیں اور ہندی کے ساتھ ان کی دلچسپی ترقی پذیر ہے، کیا اردو خواں طبقے کے لئے یہ بات قابلِ لحاظ نہیں ہے؟

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

(ادارہ)

علی اکبرؑ

قدرت کا ہیں بے مثل کرشمہ علی اکبرؑ جنّ و ملک و حور میں یکتا علی اکبرؑ
رکھتے ہیں، عجب چاند سا چہرہ علی اکبرؑ ہمشکل محمدؐ ہیں سراپا علی اکبرؑ

اے صلِّ علیٰ آپ گزرتے ہیں جہاں سے
پڑھتے ہیں درود اہلِ نظر، دل کی زباں سے

وہ سر کہ جسے زانوئے شبیرؑ ہی بھائے پُر نور جبیں، ماہِ دو ہفتہ کو گھٹائے
اُن ابرؤوں نے دو مہِ نو نیکے دکھائے دو آنکھوں میں دو ساغرِ کوثر نظر آئے

جادو نظری کے لئے سامان بڑے تھے
بدمست ہرن پلکوں کے جنگل میں کھڑے تھے

بل کھائے ہوئے گیسوؤں کی آہ وہ نکہت سونگھے جو پری اِن کو تو سنبھلے نہ طبیعت
ژولیدہ لٹوں میں وہ عیاں چاند سی صورت مہتاب نکل آیا ہو جیسے شبِ ظلمت

یا برق نے جلوے یہ سرِ طور دئے ہیں
یا موسیِٔ عمراں ورقِ مہر لئے ہیں

وہ سبزے کا آغاز، وہ لعلِ لبِ رنگیں یاقوت کو جس طرح زمرد سے ہو تزئیں
یا لالے پہ چھائے ہوئے برگِ گلِ نسریں یا خضر نے غنچہ کو ئی سونگھا پئے تسکیں

پیہم، جو تبسم کے اشارے نکل آئے
غُل تھا وہ شفق پھول کے تارے نکل آئے

آغا شاعر قزلباش دہلوی

خواجہ حالی پانی پتی

نام وخاندان :- نام خواجہ الطاف حسین، حالی تخلص، شمس العلماء خطاب۔

خواجہ حالی کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت عبداللہ انصاری سے ملتا ہے۔

پیدائش اور وفات :- ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔

مختصر حالات :- خواجہ حالی پانی پت محلہ انصاریاں میں پیدا ہوئے۔ نو سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ سترہ سال کی عمر میں بڑی بہن کے اصرار سے شادی کرنے پر مجبور کئے گئے۔ ۱۸۵۶ء میں حصار کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں پہلی ملازمت کی۔ ۱۸۵۷ء میں ہنگامۂ غدر کے سبب یہ ملازمت چھوڑنی پڑی۔ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۰ء گویا آٹھ سال تک جہانگیر آباد میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے بچوں کے اتالیق رہے۔

اس کے بعد منشی پیارے لال آشوب دہلوی میر منشی لفٹنٹ گورنر پنجاب کی سفارش سے گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب (لاہور) میں مترجمہ کتابوں کی اردو عبارت درست کرنے کی خدمت کے سلسلے میں ملازم ہو گئے۔ یہاں سے پھر اینگلو عربک سکول دہلی میں عربی زبان کے مدرس ہو کر دہلی چلے گئے۔ ۱۸۸۸ء میں سر سید کی سفارش پر نواب سر آسماں جاہ مدار المہام (وزیر اعظم) حیدر آباد نے ریاست حیدر آباد سے ۷۵ روپے ماہانہ خواجہ حالی کا وظیفہ مقرر فرما دیا جو بعد کو ترقی دے کر سو روپیہ کر دیا گیا۔ اس وظیفے کے حاصل کرنے کے بعد حالی نے مدرسی سے استعفٰا دے کر اپنے وطن میں سکونت اختیار کر لی اور زندگی بھر وہیں رہے۔

۱۹۰۲ء میں انہیں گورنمنٹ سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں میں حالی کی نظم سننے کے لئے دور دور سے اہل شوق شریک ہوا کرتے تھے۔

۱۹۰۸ء میں اس کانفرنس کے اجلاس کراچی کے حالی صدر بنائے گئے۔

۱۹۱۴ء میں پانی پت میں انتقال فرمایا۔

ان کی وفات پر سارے ملک میں ماتم ہوا۔ حالی میموریل ہائی اسکول پانی پت ان کی یادگار میں جاری ہوا جو آج تک جاری ہے۔ ان کی ولادت کو سو سال ہو گئے گزشتہ سال ان کی صد سالہ برسی ملک میں جگہ جگہ منائی گئی۔ خود پانی پت میں ہز ہائی نس نواب صاحب بھوپال کی صدارت میں ان کی صد سالہ برسی کی تقریب پر ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جس میں ملک کے مشہور ادیب شریک ہوئے۔ سر اقبال نے بھی اس جلسے میں شریک ہو کر حالی پر نظم پڑھی۔ اسی جلسے میں نواب صاحب بھوپال نے میموریل ہائی اسکول کو بیس ہزار روپیہ بطور امداد عنایت فرمایا۔

حالی کی تعلیم :- ابتدا میں قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر فارسی کی چند کتابیں اپنے وقت کے مشہور قابل اساتذہ سے پڑھیں۔ پھر عربی شروع کی۔ عربی علوم کی تکمیل دہلی جا کر کی۔

حالی کے ادبی ذوق کی تربیت :- حالی کے ادبی ذوق کی تربیت زیادہ تر :-

(۱) نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے فیض صحبت کی ممنون ہے۔ نواب شیفتہ بڑے بلند پایہ ادیب۔ اردو فارسی کے شاعر اور قابل قدر نقاد تھے۔ ان کے فیض صحبت سے حالی نے اپنے ادبی ذوق کو ترقی دی

(۲) حالی نے مرزا غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ غالب کی رہنمائی سے حالی کے ذوق شعری میں امتیاز پیدا ہو گیا۔ ان کی پہلی ہی غزل دیکھ کر مرزا غالب نے فرمایا کہ

"تم شاعری نہ کرو گے تو اپنے اوپر ظلم کرو گے"۔

(۳) گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب میں حالی کے سپرد یہ خدمت تھی کہ بک ڈپو میں جو انگریزی علم و ادب و تنقید کی کتابیں اردو میں ترجمہ کی جاتی تھیں۔ خواجہ حالی ترجمے کی زبان کو درست کیا کرتے تھے۔ اس ذریعہ سے حالی کو مغربی مصنفین و ادباء کے خیالات اور جدید اصول تنقید سے واقفیت پیدا ہوئی اور ان کا ادبی مذاق مشرق و مغرب

کے ادبیات کی خوبیوں سے بہرہ اندوز ہوا۔

(۴) سر سیّد کی معیت بھی حالی کے ذوق ادبی کو بلند کرنے کا باعث بنی۔

سر سیّد نے انہیں ہدایت کی کہ "حسن وعشق کی داستانیں تو بہت کچھ کہہ چکے۔ اب قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی طرف توجہ کرو!"

چنانچہ حالی نے سر سیّد ہی کے حکم کی تعمیل میں اپنی مشہور لسیط نظم "مد وجزرِ اسلام" جو مسدّس میں ہونے کی وجہ سے مسدّس حالی کے نام مشہور ہے لکھی۔ سر سید ہی کے ایما سے رسالہ تہذیب الاخلاق میں اصلاحی، مذہبی، اخلاقی، مضامین لکھتے رہے۔

(۵) ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے زیر انتظام اور کرنل ہال رائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کے زیر سرپرستی، مولینا آزاد دہلوی کی تحریک سے جدید قسم کے مشاعرے کی بنیاد پڑی۔ یہ مشاعرے درحقیقت اردو شاعری کے جدید دَور کی بنیاد ثابت ہوئے اور خواجہ حالی کی جادو بیانیوں نے انہیں فروغ دیا۔ اس کے بعد سے حالی نے قدیم رنگ کی عشقیہ شاعری کو ترک کر دیا۔ اور اس وقت سے اخیر دم تک جدید رنگ کی مسلسل نظمیں کہتے رہے۔

جدید اردو شاعری کا یہ اسکول جو اِن نئے انداز کے مشاعروں سے ۱۸۷۴ء میں شروع ہوا۔ درحقیقت قدیم رنگ کی غزلیات کا خاتمہ اور ہر نوع کی مسلسل نظموں کا آغاز اسی سے ہوا۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو اردو شاعری کو فرسودہ خیالات کا سرمایہ دار خیال کر کے اس سے بیزار ہو چکا تھا ان جدید مشاعروں نے اُسے اردو شاعری کی جانب متوجہ کر لیا۔ آزاد اگرچہ اس جدید شاعری کے اسکول کا پہلا بانی ہے اور اس حیثیت سے اردو شاعری اس کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ لیکن چونکہ قدرت نے اُسے اقلیم نثر کی شہنشاہی کے لئے چُن لیا تھا اس نے اپنی شاعرانہ جولانیوں کو بھی نثر ہی کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اردو نظم اُس کے دائرہ نصیب سے باہر رہی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شاعر نہ تھے۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ اس درجے کے شاعر نہ تھے کہ ان کی شاعری کسی مفید تحریک کو فروغ دے سکے۔ یہ کمی حالی کی جادو بیانیوں سے پوری ہوئی۔ حالی کی شاعری یا ساحری نے اس جدید اسکول کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ جدید ہندوستان کے گوشے گوشے میں اُسے ہردلعزیز بنا دیا۔

ان شاعروں سے پہلے اردو شاعری عموماً عشق کی ترجمانی، حسن کی قصیدہ خوانی اور امرا کی خوشامدوں تک محدود تھی۔ جدید طرز کے ان مشاعروں نے اس کے لئے ایک وسیع میدان مہیا کر دیا۔ اور اب نیچرل، اخلاقی، اصلاحی، ملکی، ملّی، تاریخی اور سیاسی نظمیں اردو میں رواج پانے لگیں۔ مولینا حالی نے ہر صنف نظم پر طبع آزمائی کر کے تمام اصناف نظم کو مقبول عام بنا دیا۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولینا حالی جدید اردو شاعری کے کامیاب بانی تھے۔

حالی کی جدید شاعری اگرچہ مطالب وخیالات کی رو سے جدید تھی لیکن اُس کا اندازِ بیان قدیم ہی رہا۔

بیسویں صدی کے آغاز نے جب کہ ترقی یافتہ مغربی شعراء کے خیالات مغربی ادبیات کے ترجموں کے ذریعہ عام ہوئے اردو شاعری میں نئے نئے اسالیب نگارش کا اضافہ کر کے اُسے اُس کی قدیم طرزادا سے بالکل جدا کر دیا۔ اب قدیم اور جدید اردو شاعری بالکل دو جدا اور ایک دوسری سے ممتاز صورت میں نظر آنے لگیں۔

(۶) غدر کے بعد مسلمانوں کی قومی پستی کے دردناک مناظر کا بھی حالی کے ذوق شاعری پر کچھ کم اثر نہیں پڑا۔

(۷) آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کی شرکت اور ان میں مسلمانوں کی قومی ترقی کے متعلق رہنمایانِ قوم سے تبادلہ خیالات سے بھی حالی کا ذوق ادب و شاعری بہت کچھ متاثر ہوا۔

مختصر یہ کہ حالی کے مذاق شاعری وذوق ادبی کی تربیت اور نشوونما مندرجہ بالا حالات اور افراد کے زیر سایہ ہوئی۔

حالی کے تصنیفی کارنامے:-

خواجہ حالی نے نثر میں حسب ذیل کتابیں تصنیف کی ہیں:-

(۱) حیات سعدی :- ایشیا اور ایران کے سب سے بڑے فارسی مصنف اور شاعر شیخ سعدیؒ شیرازی کی سیرت پر۔ اردو میں مولینا حالی کی حیات سعدی سے بہتر کوئی کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔

حیات سعدی میں شیخ سعدی کی سوانح عمری۔ ان کے متعدد سفروں کے حالات۔ ان کی نظم و نثر پر تنقید۔ ان کی مشہور عالم گلستان اور بوستان پر تبصرہ ان کی تصانیف کا اُن کے معاصرین کی تصانیف سے مقابلہ اور اُن کی نثر ونظم کا اُن کے ہم عصروں کی نظم و نثر سے موازنہ کیا گیا ہے۔ یہ معرکتہ الآرا کتاب حالی کو ایک بے مثل سیرۃ نگار، بے نظیر نقاد اور عالی جاہ

مصنّف کا درجہ دیتی ہے۔

(۲) **حیات جاوید:۔** حالی کی قابلِ قدر تصنیف "حیاتِ جاوید" ہے۔ اس کی ضخامت ایک ہزار صفحات کے قریب ہے۔ سرسید کی زندگی کے ہر قابلِ ذکر پہلو کا اس میں بیان ہے۔ سرسید کی ملکی، ملی، مذہبی، اصلاحی، علمی، ادبی، تعلیمی، سیاسی خدمات مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ درحقیقت سرسید بڑے خوش نصیب تھے کہ اُن کی سیرۃ حالی جیسے بلند مرتبہ سیرۃ نگار نے لکھی اور اپنی سحر نگاری سے سرسید کو زندہ جاوید بنا دیا۔

(۳) **یادگارِ غالب:۔** اپنے استاد مرزا غالب سے حالی کو محبت نہیں عشق تھا۔ حالی نے غالب کی وفات پر جو دردناک مرثیہ لکھا ہے اُس کے ہر شعر سے حالی کا عشق ٹپکا پڑتا ہے۔ یادگارِ غالب میں خواجہ حالی نے مرزا غالب کے حالات، ان کے لطائف و ظرائف، ان کی نظم و نثر کے خصوصیات، اُن کے درجۂ شاعری و ادب اور اُن کی فارسی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

ان کے علاوہ تریاقِ مسموم، طبقات الارض، مجالس النساء، اور کچھ علمی، تنقیدی اور مذہبی مضامین بھی حالی کی تصنیف و تالیف میں شامل ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا تین کتابیں حالی کے تین تصنیفی شاہکار ہیں۔ جن سے خواجہ حالی کی تصنیفی و تنقیدی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حالی کی شاعری:۔ خواجہ حالی کی شاعری کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) **قدیم شاعری:۔** اس میں قدیم رنگ کی غزلیات، رباعیات کچھ قصیدے وغیرہ شامل ہیں۔

جدید شاعری:۔ اس میں جدید طرز کی نیچرل، قومی، اخلاقی، اصلاحی مسلسل نظمیں اور قطعات ہیں۔

دیوانِ حالی:۔ (مرتبہ ۱۸۹۳ء) قدیم غزلیات اور جدید طرز کی نظموں کا پہلا حصّہ ہے جو حالی نے اپنی زندگی ہی میں ترتیب دیا تھا۔

مسدسِ حالی:۔ سرسید کے ایماء پر مدّوجزرِ اسلام کے نام سے یہ طویل و بسیط نظم کہی گئی۔ یہ نظم مسدسِ حالی کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں قومِ مسلم کو اس کے شاندار ماضی، بدنما حال اور تاریک مستقبل سے روشناس کیا ہے۔ مسلمان کیا تھے، کیا بن گئے اور اگر اسی بد روش پر قائم رہے تو ان کا انجام کیا ہوگا۔ یہ موضوع ہے اس یادگار زمانہ نظم کا۔

اِس نظم کو کہے ہوئے نصف صدی سے زیادہ مدّت گزر گئی۔ مگر اس انداز اعجاز سے کہی گئی تھی کہ آج نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی جب کہ اردو شاعری خاک سے اُٹھ کر افلاک سے چشمک زنی کر رہی ہے۔ اس نظم کے پائے کی کوئی اردو نظم نہیں کہی گئی۔

مسدسِ حالی، جوشِ اصلیت، سادگی، اور اعلیٰ شاعرانہ مصوّری کے اعتبار سے اس قدر موثر ہوگئی ہے کہ آج بھی مسلمانوں کی قومی مجالس میں جب پڑھی جاتی ہے تو اہلِ جلسہ اشکبار ہو جاتے ہیں۔ حالی نے اس نظم کی مطبوعہ کاپی جب سرسید کے پاس علی گڑھ بھیجی تو سرسید نے اسے پڑھ کر کتاب کی رسید بھیجتے ہوئے مولینا حالی کو لکھا کہ

"خدا قیامت میں جب مجھ سے پوچھے گا کہ تو نے دنیا میں کون سا نیک کام کیا تو کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔"

سرسید جیسے بلند نظرت النثار پرداز اور رفیع القدر نقّاد کی یہ قابلِ ناز رائے حالی کی شاعرانہ عظمت کی شاہد ناطق کہی جا سکتی ہے۔

مسدسِ حالی میں اگرچہ مسلمانوں کے زرّیں ماضی، بدترین حال اور دہشت آگیں مستقبل کی ساحرانہ مصوّری کی گئی ہے اور اس کی تحریر کا مقصد امتِ مسلمہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنا تھا۔ لیکن ہندوستان کی ہر قوم چونکہ مسلمانوں کی طرح اپنے ماضی سے بے خبر، حال سے غیر مطمئن اور مستقبل سے نڈر حیثیت میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس لئے ہندوستان کی تمام اقوام نے اپنی ناگفتہ بہ حالت کا نقشہ مسدسِ حالی کے آئینے میں دیکھ کر مسدسِ حالی کو اپنی ضرورت قومی سمجھا اور اس ملک کی ہر ہر قوم نے اپنی اپنی زبان میں اس کا منظوم ترجمہ کرنا ضروری سمجھا۔

اس کے علاوہ غیر ملکی مستشرقین نے انگریزی اور فرانسیسی میں بھی اس کا ترجمہ کر لیا۔ جاپانی زبان میں بھی مسدسِ حالی کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ آنریبل سر شہاب الدین صدر مجلس قانون ساز پنجاب نے پنجابی زبان میں اس مسدس کو منظوم سانچے میں ڈھالا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "مدّوجزرِ اسلام" حالی کا غیر فانی شاہکار ہے اور اسی کی بدولت حالی خواجہ الطاف حسین سے حالی بنے۔ مسدس

حالی ۱۸۷۹ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔

نظمِ حالی:۔ دیوان حالی کی اشاعت کے بعد خواجہ حالی نے جو نظمیں کہیں، ان کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین بی۔اے نے ان کو مرتب کر کے نظمِ حالی کے نام سے شائع کیا۔ ان نظموں کا اندازِ نگارش دیوان حالی کی جدید طرز کی نظموں ہی کا سا ہے۔

حالی کی شاعرانہ خصوصیت:۔ (۱) حالی کی قدیم شاعری جو زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے۔ جذبات کی پاکیزگی، الفاظ کی موزونیت، اندازِ بیان کی طُرفگی اور ندرت، تغزّل کی رنگینی، خیال کی نفاست و متانت، قواعد فن کی رعایت، مشق تحریر کی پختگی میں معاصرانہ تفوق اور استادانہ امتیاز کی حامل ہے۔

اس کے اشعار مطالب کی پیچیدگی، خیالات کی ژولیدگی، زبان کی تعقید اور گنجلک، بیان کے اغلاق و اشکال، ابتذال، عریانی، ہوس آرائی اور چھچھورپن سے یکسر پاک ہوتے ہیں۔

(۲) حالی کی جدید شاعری چونکہ عشق و محبّت کی چاشنی نہیں رکھتی۔ اس لئے رنگِ تغزّل قدرۃً پھیکا ہے اور بعض نظمیں تو جوابِ مضمون کی طرح ذوقِ سماعت کے لئے بار ہوگئی ہیں۔ واعظانہ ترغیب و ترہیب، ناصحانہ اندازِ تخاطب، پیشوایانہ اوامر و نواہی نے جدید طرز کی اکثر نظموں کو تعلیمی اور نصابی کتب میں درج کرنے کے قابل بنا دیا ہے۔ البتہ مسدس "مدوجزرِ اسلام" حالی کی ایک شاعرانہ کرامت ہے۔ حد درجہ مؤثر، دل گیر اور پُرجوش ہے اور جدید رنگ کی کئی مثنویاں بھی داخلی و خارجی عناصر کے اعتبار سے معیاری درجے کی ہیں۔

حالی کی نثر:۔ قانون کی زبان سب سے زیادہ احتیاط کی طلب گار ہوتی ہے۔ کیونکہ قانون سے لوگوں کی موت و زندگی اور حقوق باہمی کا فیصلہ متعلق ہوتا ہے اس لئے قانون کی زبان فصاحت و بلاغت اور شاعرانہ لطافتوں کی متحمل نہیں ہوتی۔

قانون کے بعد تنقید اور پھر تاریخ کی زبان بڑی احتیاط چاہتی ہے۔ کسی کے کمالِ فن اور شخصیت پر تنقیدی نظر ڈالنا بڑی ذمہ داری اور احتیاط کا کام ہے۔ بے جا ستایش اور ناروا مذمت، تنقید اور تاریخ کو ساقط الاعتبار بنا دیتی ہے۔

خواجہ حالی کی تنقید نگاری اور تاریخ نویسی کی زبان بہت ہی محتاط ہے۔ وہ کسی کے محاسن و نقائص بیان کرتے ہوئے اس طرح دامن بچا کر گزر جاتے ہیں کہ پڑھنے والا یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا کہ نقّاد ان محاسن و معائب سے خود بھی متاثر ہوا ہے یا نہیں؟ یہیں سے حالی، آزاد و شبلی سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ آزاد کسی کے نقائص بھی اس لہجے میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو مغالطہ ہو جاتا ہے کہ وہ تعریف کر رہے ہیں یا تعریف کے پردے میں تنقیص۔ بخلاف علامہ شبلی کے کہ وہ اظہارِ محاسن و شمارِ معائب میں تنقید کے حدود کا خیال نہیں رکھ سکتے۔ کسی کے محاسن بیان کرتے ہیں تو اپنے تاثر اور شمارِ معائب میں اپنی بیزاری کو چھپا نہیں سکتے۔ حالی کا اندازِ تنقید و بیانِ تاریخ ایک محتاط نقاد اور ایک مستند مورخ کی طرز کا ہوتا ہے۔ اسی طرح سیرت نگار آزاد بھی ہیں اور شبلی بھی لیکن اردو ادب کی سیرت نگاری صرف حالی کا حصّہ تھی۔ وہ تنقید نگاری میں جس درجے کی محتاط زبان استعمال کرتے ہیں۔ سیرت نویسی میں بھی اُسی درجے کی احتیاط اور اس کے ساتھ اندازِ نگارش میں دلچسپی بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

اگرچہ حالی کا اندازِ بیان نہ آزاد کی طرح سہل الممتنع نہ شبلی کی طرح بلند و پُرزور کہ یہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں بے نظیر ہیں۔ مگر تنقید و تاریخ کو جس محتاط زبان و معتدل اندازِ بیان کی ضرورت ہے۔ وہ زبان و بیان آزاد کو میسر نہ شبلی کو نصیب۔ یہ امتیاز خاص صرف خواجہ حالی کو حاصل ہے۔

حالی کی "حیاتِ سعدی"، اور "یادگارِ غالب" کے تنقیدی حصّے کا مقابلہ آزاد کی "آبِ حیات" اور شبلی کی "شعر العجم" کے تنقیدی حصوں سے کیا جائے تو مندرجہ بالا موازنے کی صداقت روشن ہو جاتی ہے۔

حالی کی نثر نگاری کی دوسری خصوصیت جو اُسے شبلی اور آزاد سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ حالی کی طرزِ نگارش کی بنیاد عموماً استدلال و عقلیت پر ہوتی ہے اور شبلی اور آزاد استدلال کی بجائے اکثر جذبات کی آمیزش سے کام لیتے ہیں۔ حالی اپنے قاری کو اپنی قوتِ استدلال سے ساتھ ساتھ ہمنوا بناتا چلا جاتا ہے اور آزاد و شبلی اُس کے جذبات سے اپیل کر کے اُسے ہم رائے بنانے کی سعی کرتے ہیں۔

حالی کے اندازِ تحریر کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بے مثل ذہانت اور انتقال ذہنی سے مدد لے کر بات سے بات پیدا کرنے پر قدرت تام رکھتا ہے - اسی لئے وہ کسی تصنیفی موضوع کے متعلق تھوڑے سے معلومات سے بھی کام نکال کر اس موضوع پر ایک مستند اور حاوی تصنیف تیار کر کے رکھ دیتا ہے - بخلاف شبلی کے کہ وہ جب تک کسی موضوعِ تصنیف سے متعلق تمام مسالہ اور مواد فراہم نہ ہو - اُس پر قلم اٹھانے کے عادی نہیں اور آزاد اگرچہ فراہمی مواد کی فکر نہیں کرتے - لیکن ان کی کوئی تصنیف کسی موضوع پر آخری تصنیف قرار نہیں دی جا سکتی -

تاجور

نوائے آتش

کئے جا کام ہاں اے گردشِ دورِ زماں اپنا　　ہمیں بھی دیکھنا ہے کیسے مٹتا ہے نشاں اپنا

عدو ہیں بجلیاں اپنی نہ دشمن آسماں اپنا　　ہمیں خود اپنے ہاتھوں پھونکتے ہیں آشیاں اپنا

جو ہم چاہیں تو زندانِ غلامی آج بہہ جائے　　ابھی اتنا گیا گزرا نہیں سیلِ رواں اپنا

جو فقدانِ ہم آہنگی ہے خود ہی ہمصفیروں میں　　زمانہ کس لئے ہونے لگا پھر ہمزباں اپنا

عروسِ منزلِ مقصود مل ہی جائیگی اک دن　　یونہی چندے رہا گر جادہ پیما کارواں اپنا

بسانِ کوہکن راہِ طلب سے منہ نہ موڑوں گا　　پڑھیں افسوں نہ میرے عزم پر ناکامیاں اپنا

چمن کے پتے پتے پر ہیں یارب بجلیاں قابض　　کہاں لے جائیں مرغانِ چمن اب آشیاں اپنا

نہ کھو دے سست گامی ہم کو بازی گاہِ ہستی میں　　نہ گردِ کارواں رہ جائے بن کر کارواں اپنا

یہ غفلت دوستی ایسا نہ ہو برباد کر ڈالے　　نہ خوابِ مرگ ثابت ہو کہیں خوابِ گراں اپنا

جلا دیں ہم قفس کی تیلیاں شعلہ نوائی سے
ہر اک مرغِ چمن آسی اگر ہو ہمزباں اپنا

آسی رامنگری

وجدانیات

وہ شوخ روزِ حشر بھی فتنہ خرام ہے ۔۔۔ اے دیدہ! الوداع کہ نز کی تمام ہے

ہرچند میکدے میں دل و دیدہ دام ہے ۔۔۔ ساقی کو التفات میں پھر بھی کلام ہے

واں حُسنِ بے نقاب کو تسخیرِ جاں کی دھن ۔۔۔ یاں میکشانِ دید کو مستی سے کام ہے

وہ چاہتے ہیں عشق کا مضموں ہو دل پہ نقش ۔۔۔ یاں درسِ ناظرہ بھی ابھی ناتمام ہے

واں بے طلب ہے مکرمتِ نعمتِ وصال ۔۔۔ یاں سر بسجدہائے ریا عقلِ خام ہے

یاں شکل و رنگ و بو سے نہیں ایک دم فراغ ۔۔۔ واں ہر نفس حضوریٔ دل کا پیام ہے

واں نامِ آرزو سے شکن بر جبیں ہیں وہ ۔۔۔ یاں صبح و شام خواہش حال و مقام ہے

یاں نفس و حس کو لذتِ بہیم کی جستجو ۔۔۔ واں حکم ہے کہ عشق میں جینا حرام ہے

ساقی سے ہے تغافلِ دیرینہ کا گلہ ۔۔۔ اور تفرقے سے چُور خود اپنا ہی جام ہے

عشاق پیشہ ور میں خودی کا ہے اعتبار ۔۔۔ اس کے سوا جو چاہو تو اللہ کا نام ہے

اپنے تاثرات کے ہاتھوں ہے عاشقی! ۔۔۔ کوئی ہے شاد کام کوئی تلخ کام ہے

آزاد ہے نہ صوفیِ صافی نہ رندِ مست!! ۔۔۔ ہر اک کو اپنے خبط میں حبسِ دوام ہے

ثابت ہوا لبیب! ترا عشق بے خلوص
بس ایسی عاشقی کو ہمارا سلام ہے

لبیب تیموری

شعر العرب

مولینا عرشی نے جس خواہش کا اظہار کیا ہے یہ خواہش عہد طالب علمی سے میری آرزو رہی ہے۔ میں نے اپنے استاد علامہ مفتی محمد عبداللہؒ ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ سے اس آرزو کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ "ادب العرب" کے نام سے عربی ادب کی ایک ضخیم تاریخ لکھی جانی ضروری ہے جس میں عہد بہ عہد کے شعراء و مصنفین پر عالمانہ انداز میں تنقید کی جائے اور مختلف ممالک میں جو عربی زبان کی خدمت ہو رہی ہے اس پر بھی تبصرہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں مستشرقین مغرب کی جانکاہیوں پر بھی نظر ڈالی جائے۔ حضرت علامہ مرحوم نے اس ضرورت کو تسلیم کیا تھا۔ ادھر بدقسمتی سے مجھ پر پنجاب میں اردو کے جنونِ خدمت کی لعنت طاری ہوگئی۔

یہ آرزو "لیتَ الشبابَ یعودُ" کی طرح کبھی کبھی اب بھی دل میں کھٹکنے لگتی ہے۔ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

یہ اہم خدمت کسی فرد واحد کے بس کی نہیں بلکہ اہل علم و فضل کی ایک منتخب جماعت اس مہم کو کم از کم پانچ سال لگا کر سرانجام دے سکتی ہے۔ پھر اس جماعت میں عربی ادب کے فضلاء کے علاوہ انگلش، فرنچ، خصوصاً جرمن زبان کے اُن ڈاکٹرۂ علم کی شمولیت بھی ضروری ہے جو یورپ کی یونیورسٹیوں میں رہ کر عربی ادب کے مطالعے پر کچھ سال صرف کر چکے ہیں۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی توجہ ادھر مبذول ہو جائے تو یہ علمی و اسلامی خدمت کامیاب انجام تک پہنچ سکتی ہے۔ (تاجور)

(ادبائے عربی توجہ فرمائیں)

میرا خیال تھا کہ علامہ شبلی مرحوم شعر العجم سے فارغ ہو کر شعر العرب کی طرف متوجہ ہوں گے اور یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں تنہا وُہی اس امر اہم کے اہل تھے اور اس میں بھی شک نہیں کہ عجم کی نسبت عرب اُن کی توجہ کا زیادہ مستحق تھا۔ لیکن وقت اور عمر نے انہیں موقع نہ دیا۔ ع

اے بسا راز کہ ناگفتہ بماند

ان کے بعد ان کے صاحبِ کمال تلامذہ سے اس کی توقع ہو سکتی تھی۔ لیکن انہوں نے "شعر الہند" لکھ کر تحصیل حاصل میں اپنی سعی گرانمایہ صرف فرمائی اور یہ قصر رفیع و لیسے کا و لیسا گنبد بے در بنا رہا۔

گذشتہ سال اجلاس ادارہ کے موقع پر لاہور میں ملک کے ارباب کمال جمع تھے، میرے بعض دوستوں نے مجھے شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن صاحب سینٹ سٹیفن کالج دہلی سے متعارف کرایا، میں نے اپنی دیرینہ آرزو ان کے سامنے ظاہر کی اور انہیں اس مبارک کام کی ترغیب دلائی۔ تھوڑی مدت بعد ایک مکتوب کے ذریعے انہیں یاد دہانی بھی کرائی، لیکن صدا بر نخاست۔

آج میں "شاہکار" کے ذریعے مذاق عربیت کے لذت شناسوں کے کان تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں کہ اس وقت دنیا کے ہر گوشہ میں اپنی زبان کی حفاظت و احیا کی آواز بلند ہو رہی ہے، لیکن مسلمان عربی کی (اہمیت) سے غافل ہیں۔ ایران و ترکی میں فارسی و ترکی کو عربی سے بے نیاز کیا جا رہا ہے۔ اسلامی ہند میں صرف ایک رسالہ (رضوان) عربی زبان میں لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے، جس کی ادبیت پر مذہبیت غالب ہے۔ اردو رسائل میں انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمنی، بنگالی، مرہٹی، ناگری، بھاشا وغیرہ زبانوں کی نظم و نثر ترجمہ کر کے پیش کی جاتی ہے لیکن عربی جس کس مپرسی کی حالت میں ہے ظاہر ہے۔ حالانکہ قدیم و جدید کتب عربی کا سرمایۂ غرائب و نوادر کسی زبان سے کم نہیں۔ کوئی صاحبِ فرصت و استطاعت بزرگ تنہا اس کام کو اپنے ذمہ لیں یا کوئی علمی مجلس، بہرحال یہ کام کرنے کا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر مجلس دار المصنفین اعظم گڈھ اس سعادت کے حصول میں سبقت کرے ــــ اور اردو رسائل میں جہاں اردو فارسی وغیرہ زبانوں کے شعراء پر مضمون لکھوائے جاتے ہیں وہاں عرب شعرا کی طرف بھی توجہ کی جائے۔ عربی کے خزانہ میں بہت سے ایسے جواہر موجود ملیں گے جن سے ہماری مروجہ زبانوں کے دامن یکسر خالی ہیں۔

ذیل میں کسی خاص مضمون اور زمانہ کی قید کے بغیر چند اشعار پیش کرتا ہوں جو عربی ایرانی اور ہندی شاعروں نے عربی زبان میں لکھے ہیں۔ یہ اشعار مختلف علوم کی کتابوں سے دوران مطالعہ میں اخذ کئے گئے ہیں۔ اس وقت مجھے عموماً شعراء و کتب کے نام بھی مستحضر نہیں ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں عہدِ

جاہلیت سے لے کر زمانہ حال تک کے نمونے موجود ہیں اور ہر قسم کے مضمون پر حاوی ہیں۔

سورہ مزمل کی آیت قم اللیل (رات کو جاگ) کی تفسیر میں ایک مفسر نے ذیل کا شعر لکھا جو میرے دل پر نقش ہو گیا:۔

اللیل للعاشقین سترٌ — یالیت اوقاتہٗ تدومٗ

(مطلب) رات عاشقوں کے لئے پردہ ہے۔ اے کاش رات کبھی ختم نہ ہوتی۔

مجاز ہو یا حقیقت جو لوگ شب خیزی کی لذت سے واقف ہیں وہی اس کی قدر کر سکتے ہیں۔

شربنا، طربنا، سکرنا، لھونا — الی ان بدا الفجر والنجم آفل

(مطلب) ہم نے شرابیں پیں، مزے اڑائے، مخمور ہوئے اور خوب کھل کھیلے۔

صبح کے پھوٹنے اور ستاروں کے غروب ہونے تک یہی شغل جاری رہا۔

شعر کو پھر پڑھیں اور روانی، ترنم اور بے ساختگی پر نظر کریں۔

ایک تصوف کے رسالہ کے حاشیہ پر ایک ہندی صوفی کا یہ شعر دیکھا جس کا سرور مدتوں دل و دماغ پر چھایا رہا۔

لکل شیءٍ اذا فارقتہ عوض — ولیس للہ ان فارقت من عوض

(مطلب) ہر اعلیٰ سے اعلیٰ چیز، ہر عزیز سے عزیز ہستی جس سے تمہیں جدا ہونا پڑے، اس دنیا میں کسی نہ کسی شکل میں اس کا عوض مل سکتا ہے۔ لیکن یاد رکھو اگر اللہ سے جدا ہو جاؤ گے تو اس کا بدل کہیں نہیں پاؤ گے۔

ذیل کا قطعہ اور شعر بھی ایک تصوف کی کتاب کے دیباچہ میں دیکھا تھا۔

برح بی ان علوم الوریٰ — اثنان ما فیہما من مزید

حقیقۃٌ یعجز تحصیلہا — و باطلٌ تحصیلہ ما یفید

(مطلب) شاعر کی تحقیق یہ ہے کہ تمام کائنات کے علوم صرف دو قسموں میں محدود کئے جا سکتے ہیں۔ حقیقت اور باطل ــ حقیقت کا سراغ لگانا محال ہے اور باطل کا حصول فضول ہے ـــ کتنی بڑی صداقت کو دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔

الشھرۃ آفۃٌ وکلٌ یھویھا — والخمولۃ راحۃٌ وکلٌ یاباھا

(مطلب) شہرت ایک آفت ہے اور ہر شخص اس کا آرزو مند ہے اور گمنامی سراسر راحت ہے لیکن کوئی اس کو پسند نہیں کرتا۔

[illegible] میں ایک بے نظیر شعر بھی کسی تصوف کی کتاب میں دیکھا تھا۔

ما ان مدحت محمداً بمقالتی — لکن مدحت مقالتی بمحمدٍ

اس کا مفہوم اسی وقت ایک شعر کی صورت میں بن گیا تھا۔

کب میں نے کی ہے مدح محمدؐ کلام سے
زینت ہوئی کلام کو اس پاک نام سے

متنبی اپنے ممدوح کے متعلق کہتا ہے:۔

لیس علی اللہ بمستنکر — ان یجمع العالم فی الواحد

"اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں کہ وہ سارے جہان کو ایک شخص کی ذات میں جمع کر دے" کتنی شاندار مدح ہے۔ تمام دنیا کے قصائد ایک شعر میں سمیٹ لئے گئے ہیں۔

عشق و محبت کے بیان میں بھی زبان عرب کسی سے پیچھے نہیں:۔

لیس الفؤاد محل شوقک وحدہٗ — کل الجوارح فی ھواک فؤادٗ

اے محبوب تیرے شوق کا محل تنہا دل ہی نہیں ہے۔ بلکہ ہر ہر عضو تیری محبت میں دل بنا ہوا ہے۔

کتنا پاکیزہ، کتنا سچا، اور کتنا عمیق جذبہ ہے۔ سبحان اللہ۔

تداویتُ من لیلیٰ بلیلیٰ عن الھویٰ — کما یتداوی شاربُ الخمر بالخمر

میری بیماری لیلیٰ سے تھی اور لیلیٰ ہی سے مجھے شفا حاصل ہوئی ٹھیک اس طرح جیسے رند شراب خوار خمار شراب کا چارہ شراب ہی سے کرتا ہے ـــ یہ تشبیہ شاعر کی تلاش اور رسائی ذہن پر برہان قطعی ہے۔ غالب کا ایک شعر اسی مفہوم کا حامل ہے۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتا ہوں جس کافر پہ دم نکلے

علامہ جوزی نے تلبیس ابلیس میں شعر کی گمراہ کن تاثیر کے ثبوت میں ایک قطعہ لکھا ہے، جو شاعر کے کمال فن کا بھی بہترین ثبوت ہے:۔

ذھبی اللون تحسب — من وجنتیہ النار تقتدحٗ

خوفونی من فضیحتہ — لیتہٗ وافی وافتضحٗ

طلائی رنگ محبوبہ کے رخساروں سے گویا شعلے برس رہے ہیں۔ وہ مجھے رسوائی سے ڈراتی ہے۔ کاش وہ مجھے مل جائے اور کاش میں رسوا ہو جاؤں۔

اسی کتاب میں ایک قطعہ ہے جو امام احمد بن حنبل کے سامنے

مستفسرانہ پیش کیا گیا کہ ایسے اشعار کے متعلق آپ کی شرعی رائے کیا ہے۔ آپ سنتے ہی اپنے حجرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ مستفسر کافی انتظار کے بعد دروازہ کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ امام صاحب رو رہے ہیں اور اس قطعہ کی تکرار کر رہے ہیں:۔

اذا ما قال لی ربی   اما استحییت تعصینی؟
وتخفی الذنب من خلقی   وبالعصیان تاتینی

جب میرا رب مجھے کہے گا مجھ کو نافرمانی سے شرم نہ آئی
تو میری مخلوق سے گناہ چھپاتا تھا اور میرے سامنے گناہ
کرتا تھا۔

سعدیؒ کہتے ہیں:۔

ہلک الناس حولہ عطشاً   ھو ساقٍ یری ولا یسقی

لوگ اس محبوب کے گرد پیاس سے ہلاک ہو رہے ہیں۔
وہ مجسمہ استغنا ساقی ہے۔ سب کچھ دیکھ رہا ہے، لیکن
نہیں پلاتا۔

لبیدؓ کا ایک شعر جو بارگاہِ نبوت سے سند قبول حاصل کر چکا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

الا کل شیئٍ ما خلا اللہ باطل   وکل نعیم لا محالۃ زائل

یاد رکھو اللہ کے سوا جو کچھ ہے باطل ہے اور ہر نعمت ناچار
آمادۂ زوال ہے۔

اسی لبید کے ایک شعر پر مشہور شاعر فرزدق نے سجدہ کر دیا تھا، لوگوں نے کہا یہ کیسا سجدہ ہے، اُس نے کہا تم قرآن مجید کے سجدوں کو جانتے ہو۔ میں شعر کے سجدوں کو جانتا ہوں۔ شعر یہ ہے:۔

وجلا السیول عن الطلول کانہا   زبرٌ تجد متونہا اقلامہا

شاعر نے تشبیہ کو اعجاز کی حد تک پہنچا دیا ہے یعنی سیلابوں کی آمد و رفت نے مسکن محبوب (محبوبہ) کی اقامت گاہ کے کھنڈرات کو اس طرح نمایاں کر دیا ہے جیسے پرانے مخطوطات کو مکرر قلم پھیر کر روشن کیا جائے۔

ذیل کے بے نظیر قطعہ پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

کانت لنفسی اھواء مفرقۃ   فاستجمعت اذ راتک العین اھوائی
فصار یحسدنی من کنت احسدہ   وصرت مولی الوریٰ اذ صرت مولائی
ترکت للناس دنیاھم و دینھم   شغلاً بحبک یا دینی و دنیائی

میرے دل میں بہت سی متفرق خواہشیں تھیں۔ جب تجھے دیکھا تو سب ایک مرکز پر جمع ہو گئیں۔ جو لوگ کبھی میرے محسود تھے میرے حاسد ہو گئے۔ جب تو میرا مالک بن گیا تو میں کائنات کا مالک بن گیا۔ میں نے لوگوں کے حوالے کر دیا اُن کے دین و دُنیا کو تیری محبت میں محو ہوتے ہوئے۔ اے میری دین و دُنیا۔

ان چند اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شعر عرب کس قدر جاذب توجہ ہے۔

عرشی امرتسری

غزل

زہے قسمت گلستانِ تمنا میں بہار آئی
مری اُجڑی ہوئی راتوں میں سوزِ جانفزا لائی

کسی کے سرمئی گھونگھٹ میں جلوے تلملا اُٹھے
کسی کے دل کے ناسوروں پہ اک بجلی سی لہرائی

پسینہ آ گیا کالی گھٹاؤں کی جبینوں پر
جو اُن شانوں پہ لی زلفوں نے متوالی سی انگڑائی

مرے افکار کی قندیل سے کونین روشن ہیں
میری تخئیل سے شمس و قمر نے ہے ضیا پائی

سنبھل اے رونے والے آہ تیری چُھپ کے راتوں کو
فلک سے بربطِ ناہید کے نغمے چرا لائی

خدارا اس طرح نہ دیکھنا، پھر دیکھنے والے!
تیری ترچھی نظر الطاف کے دل میں اُتر آئی

الطاف مشہدی

کرنول کے آخری تاجدار

کی حکومت سے بیدخلی کے اسباب

کرنول کے شاہی خاندان کا بانی داؤد خاں نامی شخص تھا جس کو شہنشاہ دلّی بہادر شاہ یا شاہ عالم اوّل نے ۱۷۱۰ء میں دکن کا صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ ادھونی، پاکٹور، نندرگ، تموتی اور موجودہ ضلع کرنول کا پورا علاقہ صوبہ دار موصوف کی ذاتی جاگیر میں داخل تھا۔ داؤد خاں کے انتقال کے بعد جاگیرات کا یہ پورا علاقہ ایک چھوٹی سی حکومت میں تبدیل ہو گیا۔ جس کی نگرانی مرحوم کے حقیقی بھائی ابراہیم کے ذمہ تھی۔ ابراہیم کا خاندان قریب ڈیڑھ سو صدی کے اس علاقہ پر حکمراں رہا اور آخری نواب غلام رسول خاں سے حکومت چھین کر حکومت برطانیہ میں شامل کر لیا گیا۔

اس خاندان سے حکومت کے چھن جانے کی تاریخ عجیب و غریب ہے اور ایک نقّاد کی توجّہ اپنی طرف خاص طور پر مبذول کراتی ہے۔ جاگیر یا حکومت مذکورہ کے الحاق کے واقعات کچھ اس طرح کے واقع ہوئے ہیں کہ ایک مؤرخ ان کے یاد رکھنے پر مجبور ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کے متعلق کچھ لکھا جائے۔ حکومت برطانیہ کی پالیسی ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ دیسی ریاستوں کے ساتھ اپنے معاملات کو نہایت صبر و استقلال کے ساتھ، رحم اور عام پسند صلح کے پیرایہ میں ختم کر دے۔ لیکن کرنول کے آخری حاکم کے ساتھ برطانوی حکومت کا سلوک روادارانہ نہیں بلکہ ان کی عام پالیسی کے بالکل برعکس تھا یعنے اس سلسلے میں جو بھی کارروائی کی گئی نہایت ہی عجلت اور سرسری انصاف کے ساتھ۔ یہ ایک عام اصول ہے کہ جب کسی کو اہم ترین معاملات سے سابقہ پڑتا ہے تو ان پر غور کرنے یا اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس شخص کا فرلضیہ ہے کہ واقعات متعلقہ سے پوری طور پر واقفیت حاصل کر لے ورنہ اس کا فیصلہ کسی عنوان فیصلہ کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ حسب ذیل مبحث کا مقصد اصل موضوع کو ان تمام الجھنوں سے آزاد کرانا ہے۔ جو متعدد قسم کے مختلف الرائے بیانات اور خود غرضانہ نمائندگی کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان تمام حالات کو باریک بین حضرات کے روبرو پیش کر دیں اور دیکھیں کہ ان حقائق کے ظاہر کر دینے سے ہماری موجودہ مہربان حکومت کس حد تک اپنے پچھلے کارناموں سے متاثر ہوتی ہے۔

قصّہ یہ ہے کہ ۱۸۳۸ء میں حکومت برطانیہ کے خلاف "وہابی فرقہ" کی ایک سرگرم سازش کی خبریں گشت لگا رہی تھیں۔ اس سازشی جماعت کے خلاف ایک اور جماعت تھی جس کی سرکردگی نواب کرنول کا بھائی احمد خاں کر رہا تھا۔ اس شخص نے نواب سے متعلق کئی ایک جھوٹی خبریں حکومت تک پہنچا دیں، تاریخ کرنول میں انقلاب پیدا کرنے والی دراصل یہی ایک تحریک تھی، اس وقت کی مدراس کی حکومت بلا سوچے سمجھے اور بغیر اس امر کے دریافت کئے کہ مخبر کے اخلاق و عادات کیسے ہیں اور نواب کی سنی سنائی بدراہی کی حقیقت کیا ہے، انصاف کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ اپنے طرزِ عمل کو نبھانے کے لئے حکومت نے نواب پر چند مکروہ الزامات عائد کئے اور انہیں اس امر کا ملزم قرار دیا کہ وہ چند ایسی اسکیمیں تیار کر رہے تھے جو برطانوی قوت کے مقابلے کے لئے تصوّر کی جا سکتی تھیں، مثلاً فوجی ساز و سامان کا ضرورت سے زیادہ مہیا کرنا اور برطانوی رعایا مقیم کرنول کے ساتھ نواب کی بدسلوکی اور انہیں تکالیف پہنچانا۔ تیسرے یہ کہ حکومت برطانیہ نے کرنول کی حکومت سے متعلق چند اصلاحات کی ایک اسکیم پیش کی تھی۔ لیکن حکومت کرنول نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

نواب پر ایک یہ بھی جرم عائد کیا گیا تھا کہ انہوں نے اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ بہت زیادہ مظالم کئے ہیں اور عیاشی میں پڑ کر حکومت کا نظم و نسق خراب کر دیا ہے۔ الحاصل حکومت برطانیہ نے نواب کو ان تمام بدتمیزیوں کا مرتکب پایا جس کا حوالہ لارڈ ولزلی کے خط بنام نواب الفخاں

مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۸۰۲ میں موجود ہے۔

مختصر یہ کہ ان واقعات اور مخبریوں کی جانچ پڑتال کے لئے حکومت کی جانب سے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس کے ارکان مسٹر بلّین (Mr. B. Lemes) سیولین اور مسٹر اسٹیل (Mr. S. Steel) معتمد افواج حکومت ہند تھے۔ اس کمیشن کا اہم کام یہ تھا کہ مذکورہ بالا واقعات کی صداقت کی تحقیق کرے اور ان مختلف خبروں کے ثبوت میں کافی شہادتیں فراہم کرے اس کمیشن کی امداد اور نواب کو خوف زدہ کرنے کے لئے بلاری سے فوج کا ایک دستہ کرنل ڈائس کی سرکردگی میں روانہ کیا گیا۔ کمیشن کو حکومت نے یہ اختیار دے رکھا تھا کہ نواب کی سلطنت کو عارضی طور پر اپنے قبضہ میں کر لے، اگر نواب نے اطاعت سے انکار کیا یا قلعہ حوالہ کرنے میں تساہل برتا یا حقیقی واقعات کی تحقیقات میں مدد نہیں دی یا کمیشن اور فوج کو قلعہ میں داخل ہونے سے باز رکھا تو کمشنروں کو پوری آزادی حاصل تھی کہ وہ کمپنی کی جانب سے نواب کی پوری جائداد ضبط کر لیں۔"

ان حالات اور ان ارادوں کے ساتھ شاہی کمیشن کرنول کو روانہ ہوا، ہم کمیشن ہی کی رپورٹوں سے معلوم کر سکتے ہیں کہ نواب نے کس حد تک دوستانہ تعلقات کا خیال رکھا تھا۔ گویا موجودہ نواب نے اپنے آباء اجداد کی ان روایات کو قائم رکھا جو معزز کمپنی اور حکمرانان کرنول کے مابین خوشگوار دوستانہ تعلقات پر مبنی تھے، انہیں رپورٹوں سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ نواب نے بہ حیثیت ایک نائب حکمران کے کس حد تک ان شرائط کا پاس و لحاظ رکھا اور اس کو کس حد تک اپنے مفاد کا خیال تھا یا یہ کہ برطانوی حکومت کے کمشنروں کا نواب نے جس طرح استقبال کیا ہے۔ اس کی کیفیت خود کمیشن کی رپورٹ مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۸۳۹ء ~~۱۲۴~~ میں حسب ذیل طریقہ پر مندرج ہے:۔

"قلعہ کے دروازہ سے نواب کے محل تک دو طرفہ رستے مختلف قسم کی فوجوں سے آراستہ تھے، ان رستوں سے جیسے جیسے ہمارا گزر ہو رہا تھا فوجیں سلامی دے رہی تھیں۔ جب ہم دیوان خانہ کے قریب پہنچے تو خود نواب ہمارے استقبال کے لئے کچھ دور تک چل کر آگے آ گئے، اور ہم دونوں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہماری مقررہ نشستوں تک لے گئے۔ رسمی تعارف کے کچھ دیر بعد ہم نے حکومت برطانیہ کا خریطہ نواب کی خدمت میں پیش کیا جس کو نواب نے بڑے ادب و احترام کے ساتھ قبول کیا۔ وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ خریطہ بھیج کر گورنر بہادر نے ان کی عزت افزائی کی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ہم سے لارڈ صاحب کی مزاج پرسی کی ہمارے قیام کے دوران میں مختلف موقعوں پر نواب نے کمپنی سے اپنی وفاداری اور ماتحتی کا اقرار کیا اور اس امر کا بھی اعتراف کیا کہ وہ بچپن سے عہدہ داران کمپنی ہی کی نگرانی میں پلے پھولے ہیں اس اعتبار سے بھی کمپنی کی فرماں برداری ان کا اہم ترین فرض ہے۔ جب ہم وہاں سے چلے ہیں تو نواب نے ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا جیسا کہ ہمارا استقبال کیا گیا تھا۔ ہمارے قیام کے دوران میں ہر وقت ہم نے یہ محسوس کیا کہ نواب بظاہر بھی کمپنی سے بہت خوفزدہ ہیں اور ہر موقعہ پر ان کی یہ کوشش رہتی تھی کہ ہم کو پورے احترام کے ساتھ دیکھیں اور ہماری نظروں میں نیک نام ٹھہریں۔"

کمیشن کی آمد کے دوسرے ہی دن نامدار خاں نے کمشنروں سے ملاقات کی اور کہا کہ وہ نواب کے احکام کی تعمیل میں یہ کہنے کے لئے آئے ہیں کہ نواب نے گورنر کا خط مورخہ ۱۲ اگست ۱۸۹۳ء بنام خود بغور اور پوری احتیاط کے ساتھ پڑھا اور اس کے مفہوم کو بخوبی سمجھا ہے اور وہ کمپنی کے ہر مطالبہ کی تعمیل کے لئے تیار ہیں، جس کی تصدیق کمیشن کی رپورٹ نمبر ~~۱۷~~ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۸۳۹ء ضمن ۳ اور ضمن ۷، رپورٹ نمبر ~~۲۶~~ مورخہ ۲ اکتوبر ۱۸۳۹ء سے ہو سکتی ہے۔

"نواب نے حکومت برطانیہ پر کامل بھروسہ کرتے ہوئے بغیر کسی کشمکش و پیچ کے اپنی پوری جائداد کے ساتھ پایہ تخت کو چھوڑ دیا۔ اور اپنے ڈیرے شہر کرنول اور قلعہ سے باہر زوراپور میں ڈالے گویا انہوں نے خود بخود قلعہ اور پورے ضلع کرنول کا قبضہ اٹھا دیا، محض اس امید پر کہ حکومت برطانیہ منصف مزاج ہے۔ اس سے ان کا مقصد صرف یہی تھا کہ گورنر کی خواہش کے مطابق تحقیقات ہونے تک وہ شہر کے باہر رہیں گے۔ ان کے ہٹتے ہی حکومت برطانیہ نے قلعہ کرنول پر اپنا قبضہ جما لیا۔"

چنانچہ اس طرح کمشنروں نے بلا کسی دقت کے قلعہ پر اپنا قبضہ جما لیا، اس کے بعد انہوں نے کمپنی کے حکم کے مطابق نواب پر عائد کردہ الزامات کی تحقیقات شروع کی، اور آخر میں اپنے کارنامہ کی ایک رپورٹ لکھی جس کے نتیجہ کی بنا پر نواب کو ان تمام ذمہ داریوں اور الزامات سے بری کر دیا گیا جو ان پر عائد کئے گئے تھے، سرکار کمپنی نے نواب پر ایک الزام یہ بھی عائد کیا تھا کہ وہ حکومت کمپنی کے خلاف سازش کرنے کے خیال سے بارود گولی اور اسلحہ جمع کر رہے ہیں۔ لیکن کمیشن اس

بات کے ثابت کرنے سے قاصر رہا اور اپنی رپورٹ میں لکھ دیا کہ نواب نے اسلحہ کا ذخیرہ جمع تو کیا ہے لیکن اس کا مقصد کسی قسم کی سازش وغیرہ نہیں تھا بلکہ نواب کو ان چیزوں کے فراہم کرنے کا شوق ہے جو جنون کی حد تک پہنچ گیا ہے اس کے استدلال کے طور پر کمیشن نے بعض اور چیزوں کا حوالہ دیتے ہوئے بیان کیا کہ اسلحہ کی طرح نواب کو دوسری چیزوں کے بھی جمع کرنے کا ویسا ہی شوق ہے، کمیشن کی رپورٹ کے چند جملے نمونہ کے طور پر ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:۔

"ہمارے کرنول جانے سے پیشتر نواب کے دماغ کی جو کیفیت بیان کی گئی تھی۔ اس کی پوری پوری تصدیق نواب سے ملاقات کرنے پر ہو گئی۔ اس کی عادات وحرکات بالکل ان واقعات کے مطابق ہیں جو پہلے ہم سے بیان کئے گئے تھے۔"

"ہم نے یوں تو بہت سے خود غرضوں کو دیکھا ہے لیکن نواب کے جیسا خود غرض شخص شاید ہی دیکھنے میں آیا ہو، جس کے چہرہ سے سراسر خود غرضی ٹپکتی تھی اور اس کے ہر فعل سے خود غرضی کی بو آتی تھی۔ تحقیق کرنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ خود غرضی اور پگلا پن اس کے خاندان کی دو خصوصیتیں ہیں جو ورثہ میں چلی آ رہی ہیں۔"

"جنگ کی غیر معمولی تیاری جس کے لئے اس نے اسلحہ کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کر رکھا تھا محض پگلے پن کی دلیل ہیں، اس لئے کہ جنگ کب اور کس سے ہوگی اس کا جواب خود نواب کا ضمیر تک نہیں جانتا۔"

"نواب کے متعلق جو بیانات پہلے دئے گئے ہیں اور ہماری ملاقات کے دوران میں ہم نے اس کی عادات واطوار کا جس قدر بھی غائر مطالعہ کیا ہے اگر یہ سب کچھ واقعیت پر مبنی ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ نواب کی ذات پر کسی قسم کی بداخلاقی کا جرم عائد نہیں کیا جا سکتا، بالفاظ دیگر اس کی ہر حرکت کو معصومیت پر محمول کرنا چاہیئے۔"

"نواب نے اس امر کا فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی فوج کا ایک بیڑا بحر ہند سے بحیرۂ آنک کو روانہ کیا جائے اور پوری فوج کا آب ودانہ ساتھ کر دیا جائے لیکن خود اس کے فوجی عہدہ داروں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ ایک ایسے خبطی انسان کے ارادہ کا کیا حشر ہوگا جس کے منصوبوں میں کسی قسم کا استقلال نہ ہو چنانچہ نواب کا یہ خیال ایک ہوائی قلعہ سے زیادہ ثابت نہ ہوا۔"

بعض ذرائع سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ نواب بازی کے مرغوں کو جواہر کے گہنے پہناتا تھا اور ان کے پنجرے اس کے بستر کے بازو اور اطراف دہرے رہتے تھے، اور پیسے کو پانی کی طرح اس لئے بہاتا تھا کہ ایک فقیر نے اس کو کیمیا کی کامیابی کے دھوکے میں رکھا تھا۔ ایک دفعہ اس کے سر میں یہ بھی سودا سما گیا تھا کہ نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے لیکن یہ دیوانہ پن دیرپا ثابت نہ ہوا۔ اس کے بعد اس کو خیال پیدا ہو گیا کہ وہ بہت بڑا حکمران ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی ایک شبیہ خاص طور پر تیار کروائی۔ جس کے چہرہ کے اطراف سورج کی کرنیں تھیں۔ اس فعل سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ وہ بادشاہوں کا بادشاہ یا شہنشاہ ہے گویا یہ تمام افعال اس کے پاگل پن کی دلیل تھے۔"

اس تحقیق میں سب سے اہم چیز نواب کا ظلم وستم اور بد اخلاقی تھی جس کا کمیشن کو کوئی ثبوت نہ مل سکا اور اس میں وہ ناکام رہا۔ برطانوی حکومت کے مقابل میں نواب نے نہ کبھی جنگ کی اور نہ وہ اس قسم کا ارادہ ہی رکھتا تھا اس رپورٹ سے نہیں نواب کی جو بھی برائی کا پتہ چلتا ہے صرف یہی کہ وہ ایک مستقل مزاج، اپنی دھن کا پکا اور تلون مزاج آدمی تھا، حکومت کی لگام بعض ناقابل اور خود غرض عہدہ داروں کے ہاتھ میں تھی جو اپنی ناعاقبت اندیشی سے رعایا پر آئے دن ظلم کرتے رہتے تھے، اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ نواب کی عیاشی اور طمطراق کے باعث سلطنت کا نظم ونسق بہت بُری حالت میں تھا اور یہ بدنظمیاں اس وقت روا ہیں جب خود حکمران مجنوں صفت انسان ہو۔ یہ امر بلاشبہ حقیقت پر مبنی ہے کہ نواب غلام رسول خاں حکومت کرنے کے قابل ہرگز نہیں تھا وہ سلطنت سے بے تعلق کر دیا گیا تھا اور اس کا گدی سے اتار دیا جانا بالکل واجبی تھا، اس وقت کی حکومت کا یہ فعل اگر محض اسی نقطہ نظر سے ہوتا تو کسی کو اعتراض کی کبھی گنجائش نہ پیدا ہوتی۔ لیکن اس کی آڑ میں کئی ایک خود غرضیاں بھی پوشیدہ تھیں جن کو حکومت برطانیہ نے بڑی پالیسی کے ساتھ نبھایا۔ بہرحال ان جھوٹ سچ واقعات کی بنا پر نواب کو تخت سے ہٹا کر ترچناپلی روانہ کر دیا گیا۔ جہاں حکومت برطانیہ کی سخت ترین نگرانی میں رہنے کے باوجود وہ اپنے ہی آدمیوں میں سے ایک کے ذریعہ قتل کر دیا گیا۔ نواب کے انتقال کے بعد اس کے ورثاء کے نام وظیفے جاری ہوئے جن کی جملہ مقدار رقم ۲ لاکھ ۲۲ ہزار ۶ سو ۵۱ روپے سالانہ تھی جس میں صرف ۸۱ ہزار روپے نواب کے بالکل قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کئے گئے جن میں نواب کے چار لڑکے، پانچ لڑکیاں، چار بیوہ بیگمات، اور ۲۶ بیسوائیں تھیں۔ الحاصل نواب کرنول کے واقعات اور ان کا فیصلہ نہایت ہی بے رحمی پر مبنی ہے۔

اس لئے کہ نواب کو ناکردہ گناہوں کی سزا جبریہ طور پر بھگتنی پڑی اور آخر وقت تک اس کو سختیوں اور مختلف قسم کے مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ تکالیف صرف اس پر ختم نہ ہوئیں بلکہ اس کے اثرات مرحوم نواب کی آئندہ نسلوں پر بھی مترتب ہوتے رہے۔

اس طریقہ کار کی بجائے حکومت برطانیہ کے لئے فیصلہ کی بہتر صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ نواب کے ساتھ یہ سلوک روا رکھتی کہ اس نے برطانوی حکومت کے لئے جو امدادی فوج رکھی تھی اس کو برخاست کرکے نواب کی فوجی قوت کو توڑ دیا جاتا جس سے نواب کے اختیارات اور عمل میں ایک بڑی حد تک کمی واقع ہو جاتی، یا اس کو ایک معمولی زمیندار یا جاگیردار کی حیثیت سے رکھا جاتا یا بطور جرمانہ کے اس کی سالانہ پیشکش میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا جاتا۔ ان امور کے علاوہ ایک اور یہ صورت بھی ہو سکتی تھی کہ نواب کو تخت سے اتار کر اس کے لڑکے یا خاندان کے کسی اور قابل فرد کو تخت پر بٹھا دیا جاتا۔ حکومت یہ بھی کر سکتی تھی کہ ایسے شخص کو اس شرط کے ساتھ گدی پر بٹھائے کہ وہ بعد میں چل کر اپنے آپ کو سلطنت کا اہل ثابت کرے، حکومت کے اس طرز عمل سے کم از کم یہ ہوتا کہ رعایا میں حکومت سے متعلق عام طور پر بدظنی نہ پھیلتی، ہماری نظر میں حکومت کے لئے یہ آخری طریقہ بہترین تھا۔ چنانچہ حکومت نے حال میں بیگن پلی اسٹیٹ کے ساتھ وہی آخری طریقہ کار اختیار کیا جو فی الواقع انصاف پر مبنی ہے لیکن نواب کرنول کے ساتھ حکومت برطانیہ کا جو برتاؤ رہا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ .. .. وہ برطانوی پالیسی اور ہندوستانی مفاد کے بالکل خلاف تھا۔ اس واقعہ سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ حکومت ہر کام کو بہت تیزی کے ساتھ انجام دینا چاہتی تھی جس سے اس کا اصل مقصد مرکزی حکومت سے دیسی ریاستوں کا الحاق تھا۔

ایک کمزور رئیس کو دیکھ کر اس نے اپنی کارروائی کی ابتدا کرنول ہی سے کی۔ کرنول کی حکومت اگرچہ مقامی حکومت تھی لیکن وہ بجائے ... خود ایک خود مختارانہ حیثیت رکھتی تھی، والئ کرنول کے ساتھ حکومت کا رویہ کسی عنوان نظر استحسان سے نہیں دیکھا گیا۔ معزز ارکان کمپنی ڈائرکٹرس، فوجی بورڈ اور کمشنروں کی سفارش کو اس وقت کی برطانوی حکومت نے بالائے طاق رکھ دیا۔ اور نواب کے معاملات میں ذرہ برابر رعایت سے کام نہ لیا۔ ان تمام سختیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کے معزز ارکان نے مراسلہ نشان ۱۵ ضمن ۲۲ مورخہ ۹ ۱۸۳۹ء کے ذریعہ حکومت وقت کے فیصلہ کو مسترد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"اگر وہ واقعی پاگل ہے تو یہ بڑی ناانصافی ہوگی کہ اس کی بدبختی کے سبب اس کی آئندہ نسلوں کو بھی سزا دی جائے اور اگر وہ دیوانہ نہیں ہے جیسا کہ ہم اب تک سمجھے ہیں تو پھر یہ بات قابل ثبوت رہ جاتی ہے کہ آیا وہ اس سزا کا مستحق ہے جیسا برتاؤ اس کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔"

اس مراسلہ میں آگے چل کر لکھا ہے کہ:۔

"اب کسی قسم کی مزید سختی اس پر نہ ہونی چاہئیے۔ سوائے اس کے کہ نواب کا کوئی معقول گناہ ثابت نہ کیا جائے یا کسی اہم ضرورت کے مدنظر جب تک کہ اس قسم کے مقدمہ کو بروئے کار نہ لایا جائے۔"

یہ امر خود کمشنروں کی رپورٹ سے ظاہر ہے کہ نواب ایک کمزور دماغ کا آدمی تھا اسی وجہ سے اس کا ہر فعل پاگل پن کی دلیل تھا۔ لیکن اس کے باوجود کمیشن یہ ثابت نہ کر سکا، کہ آیا نواب نے سابقہ رپورٹوں کے مطابق اپنی رعایا اور رشتہ داروں کے ساتھ ظلم کیا تھا۔ اور یہ کہ اس کا چال چلن اخلاقی حالت سے بہت ہی گرا ہوا تھا۔ رہی یہ بات کہ اس نے کبھی کوئی جنگ نہیں کی اور نہ اس کا ارادہ ہی تھا۔ کہ اپنے حلیف یعنے برطانوی حکومت کے ساتھ کوئی جھگڑا کرے چنانچہ یہ بات کمیشن کی مندرجہ ذیل رپورٹ نمبر ۱۲۳ ضمن ۳۲ مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۸۳۹ء سے بخوبی واضح ہو جائے گی۔

"اس تحقیقات کے آخری حل طلب مسئلہ کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ نواب نے حکومت برطانیہ یا اس کی حلیف سلطنتوں کے مقابل میں جنگ یا اس قسم کی کوئی چھیڑ چھاڑ کرنے کا ارادہ تک نہیں کیا تھا۔ اس واقعہ سے متعلق سرکار کمپنی کو جو بھی رپورٹیں ملی ہیں سب کی سب جھوٹ اور بالکل غلط ہیں، اس لئے کہ نواب کے احکامات کے پورے کاغذات ہمارے دیکھنے میں آئے لیکن کسی تحریر سے بھی اس قسم کا شائبہ تک نہیں گزرا۔ حضور نظام کے علاتی بھائی مبارز الدولہ (جو آجکل نظر بند ہیں) سے نواب کے اکثر خط و کتابت رہا کی ہے۔ لیکن مبارز الدولہ کے خانگی خطوط سے بھی اس قسم کا گمان تک نہیں ہوتا کہ نواب نے انہیں کوئی سازشی خط لکھا ہے یا کسی قسم کی امداد طلب کی ہے یا حکومت برطانیہ یا اور کسی دوسری سلطنت سے جنگ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے جوابی خطوط میں ان کی روزمرہ زندگی کے حالات اور آپس کے دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس اعتبار

سے ہم پورے یقین کے ساتھ اس سازشی خط کی تردید کرسکتے ہیں کہ رزیڈنٹ مقیم حیدرآباد نے نواب کا جو خط مبارز الدولہ کے نام تھا اس کو حکومت برطانیہ کے پاس بھجوایا ہے۔ سچ پوچھو تو یہ فعل ایک خاص سازشی جماعت کی کارگزاریوں کا نتیجہ ہے۔ ورنہ نواب نے اس مضمون کا کوئی خط مبارز الدولہ یا کسی اور کے نام ہرگز روانہ نہیں کیا۔"

اس کے بعد بھی کیشن نے ۱۸ دسمبر ۱۸۳۹ء اور ۷ فروری ۱۸۴۰ء نمبر ۱۶۳ کے حوالہ سے دو رپورٹیں حکومت برطانیہ کے پاس پیش کی ہیں۔ ان رپورٹوں کے ضمن میں بھی اس واقعہ کی تردید کی ہے کہ نواب نے کسی قسم کی سازشی تحریر کسی شخص کے نام بھی روانہ کی تھی۔ (بحوالہ کرنول اسے مونوگراف صفحات ۲۶ و ۲۷)۔

ہمارے خیال میں اس وقت کی حکومت کو نواب کرنول سے متعلق جو بھی شبہات پیدا ہوئے شاید "وہابی بغاوت" کا نتیجہ ہوں۔ ان باغیوں کا کوئی مستقل مزاج سردار موجود نہیں تھا۔ حکومت ایسی کمزور تو نہیں تھی کہ اس بغاوت کی شورش کو نہ مٹا سکے اور سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ خود نواب کرنول کا اس ہنگامہ میں کوئی ہاتھ نہ تھا اس طرح باغیوں کی حالت بہت ہی نازک تھی جن کا سر نہایت ہی آسانی سے کچل دیا جا سکتا تھا۔ آگے چل کر نواب کو جو بے جا سزائیں بھگتنی پڑیں اس کا سبب شاید یہ ہو کہ بغاوت نواب کے ملک میں ہوئی تھی اس لئے حکومت نے غلام رسول خاں اور اس کے ورثا کو جلاوطن کر کے پوری جائداد سے محروم کر دیا۔ مشرقی ممالک میں یہ کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ اس لئے کہ اس سے پیشتر بھی مختلف ممالک میں بالکل اس قسم کے ناجائز واقعات عمل میں آ چکے تھے۔ چنانچہ اسی قسم کی ایک مثال پیش کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علاقہ کرناٹک میں امن دامان قائم کرنے اور وہاں کے محاصل حاصل کرنے میں معزز سرکار کمپنی کو کن کن دقتوں کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ نواب غلام رسول خاں کے بعد رعایا نے عہدہ داران کمپنی کو کیا کیا تکلیفیں نہیں پہنچائیں، کمپنی یا عوام نے نواب غلام رسول خاں کے دورِ حکومت میں وہابیوں کی گڑبڑ کو جو بغاوت کے نام سے تعبیر کیا ہے اگر وہ حقیقت میں بغاوت تھی تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بغاوت بہت ہی معمولی ہنگامہ کا نام ہے۔ اگر اس شورش کو بغاوت کا نام دیا جائے تو اودھ، تانجور اس قسم کے اور ہنگاموں کو کس نام سے یاد کیا جائے گا ہم سمجھتے ہیں کہ حکومت کمپنی کرنول کے الحاق کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہی تھی اس کو یہ موقع اتفاق سے ہاتھ آ گیا اور اس نے اپنے دل کی مراد نکال لی۔

کیشن نے نواب کو ان تمام الزاموں سے بری کر دیا جو بلاوجہ نواب پر عائد کئے گئے تھے۔ اسلحہ اور بارود گولی کی خفیہ فراہمی کا ایک ایسا الزام تھا جس سے نواب کسی طرح نہ بچ سکا۔ اس الزام کی اصلیت پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ ایک معاہدہ کی رو سے نواب پر ضروری تھا کہ اپنے ملک کی حفاظت اور وقت ضرورت کمپنی کو مدد دینے کے لئے سوار اور پیادوں کی ایک معین فوج ہر وقت تیار رکھے۔ لارڈ ولزلی کے خط مورخہ ۲۲ جولائی ۱۸۰۲ء سے واضح ہو جائے گا کہ کمپنی نے کس حد تک فوج جمع کرنے کے لئے نواب کو مجبور کیا تھا۔ ذیل میں ہم اس خط کا اقتباس درج کرتے ہیں:۔

علاقہ دکن کے حالات حاضرہ کے مدنظر میں آپ کو یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ اپنی نگرانی میں ایک ایسی فوج ہر وقت تیار رکھیں جو ضرورت کے وقت انگریزی حکومت کی مدد کرے گی اور ہماری ہدایات کے مطابق اس فوج کا ساتھ دینا ہوگا۔ مجھے کامل اطمینان ہے کہ آپ کی فوج ہر طرح سے مسلح رہے گی۔"

(باقی آئندہ)

غلام محمد خاں (عثمانیہ)
حیدرآباد دکن

رباعی

دشوار ہے دہر میں مظفر ہونا — اسباب دلاوری میسر ہونا

(ترجمہ) اک جام شراب ارغوانی پی لے — وہ شخص جو چاہتا ہو خاور ہونا

یزدانی

نو بادۂ ساغر

ساقی نہیں، ساغر نہیں وہ جام نہیں ہے   میخانے کی اگلی سحر و شام نہیں ہے
مرنا رہِ الفت میں کوئی کام نہیں ہے   آغاز ہے آغاز یہ انجام نہیں ہے
اک کیفِ مسلسل ہے تری نیم نگاہی   آغاز یہ شرمندۂ انجام نہیں ہے
اس کارگہِ شوق کے آئین نہ پوچھو   وہ پختہ نہیں ہے جو یہاں خام نہیں ہے
کیا حُسن سے اب رشتۂ باقی بھی ہُوا قطع   کیوں سلسلۂ نامہ و پیغام نہیں ہے
یہ حُسن کی ضد دیکھ کہ اوراقِ کرم کیا   فہرستِ ستم میں بھی مرا نام نہیں ہے
دُنیا ہی نہیں عکسِ دو عالم نظر آتا
زاہد ترے ہاتھوں میں مرا جام نہیں ہے

مستی مری خود ہے مری لغزش کا سہارا   ساقی کا کرم بھی نہیں اس وقت گوارا
بازی گہِ ہستی میں مری چال نہ پوچھو   اُلفت کا کھلاڑی کبھی جیتا، کبھی ہارا
آسودۂ ساحل سے کوئی بڑھ کے یہ کہہ دے   ساحل ہی نہیں موجِ رواں بھی ہے کنارا
ساغر کبھی پینے سے نہ چوکے ہیں نہ چوکیں
گنگا کا کنارا ہو کہ کوثر کا کنارا

ساغر نظامی

فلسفۂ محبّت

[وِل ([illegible]) بچپن سے ایک مِل پر کام کرتا تھا۔ مِل کے مالک نے اس کو متبنّیٰ بنالیا۔ مِل کے علاوہ اس کے یہاں ایک چھوٹی سی سرائے تھی۔ جس میں مسافر آکر ٹھہرتے تھے۔ مِل والے کے مرنے پر وِل بہ حیثیت وارث کے تمام ترکہ کا مالک قرار پایا۔ مندرجہ ذیل حقیقہ مضمون کی ابتدا یہیں سے ہے!]

(۱)

کچھ مدت کے بعد عمر رسیدہ چکّی والے کا انتقال ہوگیا اور اُسی موسم سرما میں اُس کی بیوہ کی بھی موت واقع ہوئی۔ وِل نے اپنے مقدور بھر اُن کی تجہیز و تکفین کی اور خاموشی کے ساتھ اُن کا ماتم کرلیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اب وِل تمام سامان فروخت کر کے دریا کے اُس پار جابسے گا۔ لیکن وِل کی طرف سے اس ارادہ کا کچھ اظہار نہ ہوا۔ بلکہ اس کے برعکس اُس نے چکّی کا کام اور مضبوط کرلیا اور اپنی مدد کے لئے دو ملازم بھی رکھ لئے۔ وہ اپنے گردونواح میں ایک "وہمی" مشہور تھا۔ اس لئے کہ اُس کا دماغ ہمیشہ سے توہمات کا مسکن تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ پادری کی لڑکی مارجری سے اُس کا ارتباط و اخلاص بڑی تعجب کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ مارجری کی عمر تقریباً انیس۱۹ سال تھی۔ جبکہ وِل تیس۳۰ سال کا تھا۔ مارجری قبول صورت اور تربیت یافتہ تھی۔ اُس کا سر ہمیشہ بلند رہتا تھا۔ اور اُس نے کئی نوجوانوں کی شادی کی درخواست کو مسترد بھی کردیا تھا۔ جس وجہ سے لوگ اُسے "سنگدل حسینہ" کہتے تھے۔

وِل کبھی اُس سے خصوصیت کے ساتھ نہیں ملا تھا۔ حالانکہ گرجا اور اُس کے مکان کا فاصلہ مشکل سے دو میل ہوگا اور ہر اتوار کو گرجے جانا اُس کا معمول بھی تھا۔

اتفاقاً پادری کے مکان کا کچھ حصہ گر گیا۔ جس کی مرمت کی وجہ سے اُن کو مکان خالی کرنا پڑا اور ایک مہینہ کے لئے کسی دوسری جگہ اقامت کرنے کے لئے اُن کو مکان کی جستجو ہوئی۔ وِل نے واجبی کرایہ پر اُن کو اپنی سرائے میں جگہ دے دی۔

وِل علاوہ چکّی کے ایک سرائے کا مالک اور ملکہ کے تمام ترکہ کا وارث تھا۔ اس۔ لیے لوگوں کا یہ خیال کہ پادری نے اپنا عارضی قیام بغیر کسی مقصد کے نہیں کیا، کچھ غلط نہ تھا۔ لیکن وِل ہی شاید وہ آخری شخص ہو جس کو شادی کے قیدو بند میں جکڑا جا سکتا تھا۔ وِل کے چہرہ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوجاتی کہ اُس کی آنکھوں میں دل کی گہرائیوں سے ایک روشنی آتی ہے، جو حوض کے پانی کی طرح ان کو چمکا دیتی ہے۔ نیز یہ کہ وہ اپنے آپ کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اور جو تہیّہ وہ ایک دفعہ کرلیتا ہے، اُس سے وہ کبھی نہیں ہٹتا۔

مارجری بھی ضعیف طبیعت عورت نہ تھی۔ اُس کی آنکھوں سے استقلال، عزم اور خاموشی ٹپکتی تھی۔ ممکن ہے وہ وِل کے مقابلہ میں کم صاحبِ عزم و استقلال ہو۔

(۲)

ابھی موسم کا آغاز تھا اور وِل کی سرائے میں اِکّا دُکّا ہی مسافر نظر آتا تھا۔ موسم ملائم تھا اور وِل مع اپنے مہمانوں کے صحن ہی میں کھانا کھاتا۔ دریا کا شور، جنگلوں کی سنسناہٹ، پرندوں کے نغمے اُن کے کانوں تک پہنچتے۔ وِل کو اس مہمان نوازی میں ایک خاص لطف آنے لگا تھا۔ پادری ایک مجہول الکیفیت انسان تھا۔ وہ میز پر بیٹھ کر غنودگی کے عالم میں پہنچ جاتا اور کوئی مفید، غیر مفید بات اُس کی زبان سے نہ نکلتی۔ لیکن مارجری کی ہر بات سے اُس کی قابلیت اور ذہانت کا پتہ چلتا۔ وِل نے مارجری کے متعلق ایک بلند خیال قائم کیا۔ جب وہ میز پر آگے کو جھکتی تو وِل اُس کا چہرہ دیکھتا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک ہوتی۔ اُس کے بال روشنی میں چمک اُٹھتے۔ اُس کے سُرخ لبوں پر تبسم کھیلتا نظر آتا۔ وِل اُس کو اکثر گھورتا ہوا دکھائی دیتا۔ مارجری اپنے خاموش ترین لمحات میں بھی پیکرِ حیات معلوم ہوتی۔ سر سے پاؤں تک زندگی کی لہر اُس میں دوڑتی ہوئی نظر آتی۔ یہاں تک کہ دُنیا کے تمام جاندار اُس کے مقابلہ میں بے زیست نظر آتے۔ وِل جب مارجری سے نظر ہٹا کر اُس کے اِرد گرد دیکھتا۔ تو درخت اُس کو بے حس اور مردہ نظر آتے۔ اور بادل آسمان میں مردہ اجسام کی طرح لٹکے ہوئے دکھائی دیتے۔ یہاں تک کہ پہاڑ کی چوٹیاں بھی بے کیف معلوم ہوتیں۔ تمام وادی کی فضا اس ایک لڑکی کے

مقابلہ میں، ہیچ اور بے کیف تھی ۔

وِل اپنے مشاہدات کی وجہ سے بھی مشہور تھا - اور مارجری کے معاملہ میں اُس کے مشاہدات اس کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوئے تھے وہ ہر اس لفظ کو جو مارجری کی زبان سے نکلتا غور سے سنتا اور سا تھ ہی اُس کی آنکھوں کو غور سے دیکھتا - بہت سی سادہ اور پُرخلوص باتیں اُس کے کانوں میں گونجتی رہتیں - اُس کے جسم میں ایک ایسی روح ساری تھی - جو خواہشات اور سوءِ ظن سے پاک اور محبت سے لبریز تھی - وہ مارجری کی شکل کو خیالات سے جُدا نہیں کرسکتا تھا - اُس کی گول کلائی، اُس کی مترنم آواز، اُس کی آنکھوں کی روشنی، اُس کے جسم کی رعنائی، اس پر ترنم ریز لہجہ گویا ایک سحر کار مغنیہ تھی جو جملہ لوازمات سے آراستہ تھی - اُس کی موجودگی وِل کو عہد ماضی کی یاد دلاتی تھی جبکہ وہ بچہ تھا - پانی کی روانی، طلوعِ سحر، لالہ و بنفشہ کی شگفتگی میرے بچپن کے خیالات اور اب مارجری کا وجود اُس کے دماغ میں ایک حشر برپا کرتا تھا۔

(۳)

ایک رات کھانے کے بعد وِل باغ میں چہلقدمی کر رہا تھا - رنگین فضا میں محو ہو کر اُس نے مسکرانا شروع کیا - دریا کا پانی پتھروں سے ٹکرا کر بہہ رہا تھا - کہیں جنگل میں دُور کوئی پرندہ گیت گا رہا تھا - پہاڑ کی چوٹی آج بہت بلند نظر آرہی تھی - وہ ٹہلتا ہوا ایسی بلندی پر جا پہنچا جہاں سے نشیبی میدان صاف نظر آرہا تھا - وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر خوشگوار خیالات میں محو ہو گیا - میدان اپنی آغوش میں خوبصورت شہر اور ایک نقرئی دریا لئے ہوئے تھا - ہر ایک چیز خاموش اور سوئی ہوئی معلوم ہوتی تھی - بجز چند پرندوں کے جو فضا میں چکر لگا رہے تھے - اُس نے زور سے "مارجری" پکارا، اور صدائے بازگشت نے اس کے کانوں کو نغمہ سے بھر دیا - اُس نے آنکھیں بند کیں، مارجری کا خوبصورت مجسمہ اُس کے سامنے تھا - دریا بہتا رہا - پرندوں کی پرواز کی آواز بلند ہوئی یہاں تک کہ اُنہوں نے تاروں کو جا چھوا - لیکن اُس کے لئے یہ سب ہنگامہ بے کیف تھا۔

دوسرے روز کھانے کے وقت وِل نے اعلان محبت کیا۔

پادری میز کی دوسری طرف بیٹھا ہوا تمباکو سے پائپ بھر رہا تھا "مس مارجری!" وِل نے کہا "مجھے یاد نہیں کہ کبھی میں نے تم سے زیادہ کسی سے محبت کی ہو - میں سرد دل اور نا مہربان قسم کا انسان ہوں - اس لئے نہیں کہ میرے پہلو میں دل نہیں - بلکہ اپنے عجیب خیالات کی بنا پر جو مجھے دوسرے لوگوں سے غیر اور اجنبی بنائے ہوئے ہیں اور علیحدہ بھی - گویا ایک دائرہ ہے جو میرے اور تمہارے گرد محیط ہے - اور تمام دنیا اس سے الگ ہے - مجھے لوگ ہنستے اور بولتے سنائی دیتے ہیں - لیکن تم میرے بالکل قریب ہو - شاید یہ بات تمہارے خلافِ مزاج ہو؟" اُس نے استفسار کیا۔

مارجری خاموش تھی۔

"جواب دو" پادری نے کہا۔

"نہیں اس وقت نہیں پادری صاحب" وِل نے کہا "میں ان کو جواب کے لئے مجبور نہ کروں گا - خود میری زبان خلافِ معمول بند ہے اور وہ تو عورت ہے - اتنا کہہ سکتا ہوں اور جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں محبت میں گرفتار ہوں - میں قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا - ممکن ہے یہ غلط ہو اور اگر مس مارجری کو مجھ سے محبت نہیں تو کیا مہربانی فرما کر وہ انکاری طور پر سر ہلا سکتی ہیں؟"

مارجری خاموش تھی - گویا اُس نے سنا ہی نہیں۔

"اس کی کیا وجہ ہے! پادری صاحب!" وِل نے پوچھا -

"لڑکی کو ضرور جواب دینا چاہیئے" پادری نے پائپ رکھتے ہوئے کہا "مارجری یہ ہمارے ہمسائے ہیں - تم سے محبت کرتے ہیں - کیا تم کو بھی ان سے محبت ہے - ہاں یا نہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ مجھے ان سے محبت ہے" مارجری نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے صرف اسی قدر مطلوب ہے" وِل نے کہا اور مارجری کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"تم دونوں کی شادی ہو جانی چاہیئے" پادری نے پائپ منہ میں لیتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کے خیال میں یہ صحیح ہے؟" وِل نے پوچھا۔

"یہ لازمی امر ہے" پادری نے کہا۔

"بہت خوب" وِل نے جواب دیا۔

(۴)

دو تین دن وِل کے لئے مسرت سے بھرے ہوئے پیغام لائے جن کا اظہار وِل کے چہرہ سے ناممکن تھا - وہ مارجری کے ساتھ کھاتا پیتا اور اس کے باپ کی موجودگی میں اُس سے ہمکلام بھی ہوا لیکن اُس نے کبھی اُس سے تنہا ملنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اپنے طرزِ عمل کو بدلا - غالباً لڑکی اس طرزِ عمل سے مایوس ہوئی اور وہ حق بجانب تھی - اگر وِل کی زندگی میں انقلاب آجاتا تو شاید وہ مطمئن ہو جاتی - وہ بدستور دریا کے

کنارے بیٹھتا۔ ریت، مچھلیوں اور گھاس کو دیکھتا۔ وہ روشوں پر ٹہلتا۔ وہ جنگل میں پرندوں کے جھنڈ کے قریب پھرتا۔ علی الصبح سویرے اٹھتا اور آسمان کی سیاہی کو سنہرا ہوتا ہوا دیکھتا اور سورج کی شعاعوں کو پہاڑی چوٹیوں پر رقص کرتے ہوئے دیکھتا۔ گویا یہ سب چیزیں نئی تھیں۔ اپنی چکی کی آواز، درختوں میں ہوا کی سنسناہٹ، یہ سب چیزیں کیف انگیز تھیں۔ وہ اسقدر خوش تھا کہ راتوں بیدار رہتا اور اسقدر بے چین کہ بغیر مارجری کے شاید ہی قرار پایا ہو۔ لیکن اس پر بھی وہ اس سے بچنا چاہتا تھا اور کبھی اُس کا متلاشی نہ ہوا!

ایک دن جبکہ وہ چہل قدمی سے واپس آرہا تھا۔ اُس نے مارجری کو باغ میں پھول توڑتے پایا۔ وہ اُس کے پاس آیا اور اُس کے ساتھ ٹہلنے لگا۔

"کیا تم پھول پسند کرتی ہو؟" وِل نے پوچھا۔

"درحقیقت وہ مجھ کو بہت پیارے ہیں۔" اُس نے جواب دیا "کیا تم بھی پسند کرتے ہو؟"

"کیوں نہیں!" وِل نے کہا "لیکن اسقدر نہیں۔ توڑنے کے بعد وہ بے حقیقت چیز ہیں۔ میں نے لوگوں کو پھولوں کی قدر کرتے سنا ہے۔ لیکن ایسا سلوک کرتے نہیں دیکھا جیسا تم کر رہی ہو۔"

"کیسا؟" مارجری نے پوچھا اور وِل کی طرف دیکھا۔

"پھولوں کا توڑنا" اس نے کہا "وہ جس جگہ ہیں وہیں زیادہ خوبصورت اور بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ اگر تم اُن کو وہیں رہنے دو۔" "میں اُن کو اپنانا چاہتی ہوں" مارجری نے جواب دیا "میں اُن کو اپنے دل کے قریب رکھوں گی اور اُن سے کمرہ سجاؤں گی۔ وہ یہاں شاخ پر اُگے ہوئے مجھے بلاتے ہوئے معلوم دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ "آؤ اور ہم سے کھیلو۔" جب میں اُن کو ایک دفعہ توڑ لیتی ہوں گویا تمام خوبصورتی حاصل کر لیتی ہوں اور پھر اطمینانِ قلب کے ساتھ ان کو دیکھتی رہتی ہوں۔"

"اُن پر قبضہ جمانا گویا تمہاری خواہش ہے۔" وِل نے پوچھا۔ "تاکہ پھر اُن کا خیال بھی نہ کرو گویا سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو قتل کرتی ہو۔ بچپن میں میرے بھی ایسے ہی خیالات تھے۔ میری بڑی تمنا تھی کہ میدان کے اُس پار جاؤں۔ جہاں پہنچ کر میں اُسے پھر ایک نظر بھی نہ دیکھتا۔ یہی دلیل میرے وہاں نہ جانے کی تھی میری پیاری اگر دوسرے بھی ایسا خیال کریں تو سب میری طرح ہو جائیں۔ اور پھر تم بھی پھولوں کو اپنی جگہ رہنے دو۔" اتنا کہہ کر وہ رُک گیا۔

"معاذاللہ" وِل نے پھر کہا۔ قبل اس کے کہ مارجری کچھ پوچھتی۔ وہ سلسلہ کلام منقطع کر کے مکان کے اندر چلا گیا۔ اس کا چہرہ متبسم تھا۔ وہ دسترخوان پر خاموش رہا۔ جب رات کی تاریکی چاروں طرف پھیل گئی، ستارے آسمان پر چمک اُٹھے، وہ گھنٹوں صحن اور باغ میں بے ربط قدموں سے ٹہلتا رہا۔ مارجری کے کمرہ کی کھڑکی سے اب بھی روشنی آرہی تھی۔ جو چاندنیوں کی تاریک فضا کو قدرے روشن کئے ہوئے تھی۔ وِل کا دماغ کھڑکی کے متعلق سوچنے لگا۔ لیکن اُس کے خیالات عاشقانہ نہ تھے۔ "وہ اپنے کمرہ میں ہے۔" اُس نے سوچا "اور سر کے اوپر آسمان میں ستارے!۔ خدا دونوں پر رحمت نازل کرے" اس لئے کہ ان دونوں کا اثر اُس کی زندگی پر بہت پڑا تھا۔ دنیاوی آلام میں اُس نے ان دونوں سے تسکینِ قلب حاصل کی تھی اور اس سے زیادہ وِل کو اُن سے کیا توقع ہو سکتی تھی۔ اُس نے آسمان پر ستاروں میں ایک جھٹکا محسوس کیا، شاید اُس کی سر کی جنبش کا نتیجہ ہو اور ایک منتشر روشنی ایک سرے سے دوسرے تک پھیل گئی۔ کھڑکی کا پردہ ہلا، اُٹھا اور پھر نیچا ہو گیا۔ اُس نے قہقہہ لگایا۔

"ستاروں میں لرزش، پردہ میں جنبش۔ خدا کی پناہ میں بھی کیسا جادوگر ہوں۔ یا ایک بڑا بے وقوف......"

وہ فوراً ہی بستر پر چلا گیا اور کہتا رہا "کاش میں بے وقوف ہی ہوتا!......"

(۵)

دوسرے دن علی الصباح وِل نے مارجری کو باغ میں دیکھا۔ "میں اب تک شادی کے متعلق سوچتا رہا" اُس نے اچانک کہا۔ "اور بار بار سوچنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ کوئی قابلِ قدر چیز نہیں۔"

ایک لمحہ کے لئے مارجری نے اُس سے نظر ملائی۔ لیکن پھر خاموشی سے زمین کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اس کو کانپتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ "تم کو حیران نہیں ہونا چاہیئے" وِل نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے بار بار اس سوال پر غور کیا اور ہر دفعہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس میں کچھ نہیں۔ ہم اس سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب نہ ہو سکیں گے، جتنا کہ اب ہیں اور اگر میں عقلِ سلیم رکھتا ہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ اب سے زیادہ اُس وقت خوش بھی نہ رہ سکیں گے۔"

"تیر سے متعلق سوچنا اب بے سود ہے۔" مارجری نے

کہا۔ "مجھے خوب یاد ہے کہ تم نے قطعی طور پر اپنے کو پابند کرنا نہیں چاہا۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم غلطی میں مبتلا تھے۔ تم نے درحقیقت مجھ سے کبھی محبت نہیں کی اور اس بات سے مجھے رنج ہے کہ مجھے بھی غلط فہمی میں ڈال دیا گیا تھا۔"

"معاف کیجئے۔" ول نے پُر زور الفاظ میں کہا۔ "تم میرا مطلب ہی نہیں سمجھ سکیں اور نہ یہ کہ مجھے تم سے محبت ہے یا نہیں۔ میں اس کا فیصلہ دوسروں پر چھوڑتا ہوں۔ مجھے ناز ہے کہ میرے جذبات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور تمہیں اس بات کا غرور ہوگا کہ تم نے میری تمام زندگی اور طرزِ عمل کو بدل ڈالا۔ لیکن شادی مجھے قابلِ قدر چیز نہیں معلوم ہوتی۔ مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ تم اپنے والد ——— کے ساتھ رہو تاکہ میں تم کو ہفتہ میں ایک دو بار دیکھ آیا کروں۔ جس طرح لوگ گرجا جاتے ہیں اور اس وقت میرا خیال ہے کہ ہم زیادہ خوش نظر آئیں گے۔ یہ میرا خیال ہے۔ لیکن میں تم سے شادی بھی کر لوں گا اگر تمہاری مرضی ہوگی۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ تم میری عزت پر حملہ کر رہے ہو!" مارجری نے بگڑ کر کہا۔

"نہیں نہیں" ول نے کہا "میرا دل قطعی صاف ہے۔ میں اپنی بہترین محبت تم کو پیش کر رہا ہوں۔ تم اس کو لے سکتی ہو۔ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ یہ میری یا تمہاری طاقت سے باہر ہے کہ گذشتہ واقعات کو بدل دیا جائے اور خیالات میرے دل سے نکل جائیں۔ میں تم سے ضرور شادی کر لوں گا۔ اگر تمہاری مرضی ہو۔ لیکن میں تم سے پھر کہوں گا کہ یہ قابلِ وقعت چیز نہیں، اور اگر ہم دوست کی حیثیت سے رہیں تو یہ کہیں بہتر ہے۔ اگرچہ میں ایک خاموش انسان ہوں۔ لیکن میں نے زندگی میں بہت تجربے حاصل کئے ہیں۔ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے جو میں کہتا ہوں مان لو۔ اور اگر تم کو پسند نہیں تو کہہ دو میں تم سے فوراً شادی کر لوں گا۔"

تھوڑی دیر دونوں خاموش رہے۔ ول کے دل میں الجھن پیدا ہونے لگی۔

"شاید تم کو اپنے خیالات کے اظہار میں کچھ دریغ ہے۔" ول نے کہا۔ اقرارِ گناہ زندگی کا بار ہلکا کر دیتا ہے۔ کیا مجھ سے زیادہ کوئی شخص عورت کے معاملہ میں اسقدر بے باک ہو سکتا ہے۔ میں اپنی رائے کا اظہار کر چکا۔ کیا تم شادی کی تمنا میں ہو؟ یا تم میری دوستی قبول کرنا چاہتی ہو جو اُس سے بہتر ہے۔ یا تم مجھ سے سیر ہو چکی ہو؟ بولو! خدا کے لئے کچھ کہو۔ تمہیں یاد ہوگا۔ تمہارے والد نے .... کہا تھا کہ ایسے مواقع پر لڑکیوں کو اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیئے۔"

اتنی دیر میں مارجری نے اپنے ہوش ٹھکانے کئے، اور بغیر ایک لفظ کہے جلدی سے باغ سے نکل کر مکان میں چلی گئی اور ول ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ وہ باغ میں نیچے اوپر پھرتا رہا۔ کبھی وہ آسمان کو دیکھتا اور کبھی پہاڑ کی چوٹیوں کو۔ وہ پانی کے کنارے بیٹھ کر بے وقوفی سے پانی کو دیکھتا رہا۔ اُس کو یہ تمام واقعات اپنے خلافِ عادت معلوم ہوئے اور مارجری کی آمد کے دن کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ "پہلے میں بہت خوش تھا" اس نے کہا۔ "میں یہاں آکر تمام دن مچھلیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ میں اپنی جگہ تِل کی طرح قائم تھا۔"

(۶)

مارجری کھانے پر آئی۔ لیکن نہایت خاموش۔ جب تینوں جمع ہو گئے۔ پلیٹ پر آنکھ جمائے ہوئے مارجری نے کہا:۔

"ابا جان! مسٹر ول کے ساتھ میں مدّت تک معاملات پر گفتگو کرتی رہی۔ ہم نے ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ میری درخواست پر وہ شادی نہ کرنے کے لئے راضی ہو گئے ہیں۔ اور اب وہ مجھ سے ایک دوست کی حیثیت سے ملا کریں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے مابین کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ ہم اسی طرح اُن سے ملتے رہیں گے۔ میں اُن کا خیر مقدم کروں گی لیکن میں مناسب سمجھتی ہوں کہ ہم مسٹر ول کا مکان فوراً خالی کر دیں۔ اس لئے کہ واقعاتِ موجودہ کی بنا پر شاید اب ہم خوشگوار وقت نہ گذار سکیں۔"

ول جس نے اب تک اپنے آپ پر مشکل سے قابو پایا تھا۔ غیر مربوط الفاظ میں برس پڑا۔ گویا وہ مداخلت کر کے مارجری کو جھٹلا دینا چاہتا تھا۔ لیکن مارجری نے ہاتھ سے اس کو وہیں روک دیا اور ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔ اس کے رخساروں پر حیا کی سرخی جھلک رہی تھی "میں ممنون ہوں گی۔ اگر آپ دورانِ گفتگو میں رکاوٹ پیدا نہ کریں۔" اس نے کہا۔

مارجری کے اندازِ بیان اور لب و لہجہ نے ول کو حیرت میں ڈال دیا۔ وہ یہ سوچ کر خاموش ہو گیا، کہ لڑکی کے اندر کچھ باتیں ضرور ہیں جو اس کی سمجھ سے باہر ہیں۔ درحقیقت وہ ٹھیک سمجھا تھا۔

ضعیف پادری کو بیحد ملال ہوا۔ اس نے یہ بات ثابت کرنے کی بے سود کوشش کی کہ یہ محبت کے جھگڑے ہیں جو ایک رات بعد ختم ہو جائیں گے اور جب کوئی جھگڑا نہیں تو مکان چھوڑنا کیا معنی! وہ ول

... بے نیاز تھے۔ جبتک
... اور جمعیت خاطر کا کوئی سہارا نہ
... سے پہ اُس کو غصہ آیا۔ لیکن پھر بھی وہ اس کا مداح
... لو مارجری کے پیکر میں ملکوتی صفات کا عکس نظر آتا تھا جس کے
ادراک سے وہ قاصر تھا۔ اگرچہ وہ اُس کی مصنوعی خاموش زندگی کا جزو
بننے کے قابل نہ تھی۔ تاہم وہ اُس کی آرزو کرتا رہا۔ ڈل مثل اُس انسان کے
تھا جس کی نشوونما سایہ میں ہوئی ہو اور آفتاب میں آجانے سے جو مسرت یا
تکلیف اُس کو ہو سکتی ہے، وہ اس وقت ڈل کو محسوس ہو رہی تھی۔ دن
گزرتے رہے۔ اب ڈل انتہا پسند ہو گیا تھا۔ کبھی وہ اپنے عزم بالجزم
کو بنظر [illegible] دیکھتا اور کبھی اپنی احتیاط پہ نادم ہوتا۔ غالباً پہلی بات اُس کے
اصلی کیرکٹر کا عکس تھی اور دوسری اُس کے جذبات کا مظاہرہ۔ تاہم رنج
وغم نے اُس کو مجنون بنا دیا تھا۔ خیالات نے مجبور کیا کہ وہ موجودہ زندگی
کا خاتمہ کر دے۔ اس لئے ایک دن شام کو اس نے اپنا بہترین لباس
زیب تن کیا اور ہاتھ میں چھڑی لے کر دریا کے کنارے کنارے نیچے وادی
کی طرف چل دیا۔ اس نتیجہ کے ساتھ اُس کا قلب تسکین پذیر ہو گیا اور اُس نے
قدرتی مناظر اور موسم کی دلفریبی سے کافی حظ حاصل کیا۔ وہ ہر نتیجہ کا اقدام
کرنے کے لئے تیار تھا۔ اگر مارجری اُس کو قبول کرتی ہے۔ تو بہتر ہے اور
اگر وہ اُس کی درخواست رد کرتی ہے۔ تب بھی وہ مطمئن تھا۔ کہ اُس نے
حتی الامکان معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی۔ زیادہ تر اُس کو ناامیدی کی توقع
تھی۔ جب اس کو مارجری کے مکان کا حصہ درختوں کے درمیان نظر آیا تو
وہ اپنے اس اقدام پر شرمندہ ہو رہا تھا۔ تاہم وہ وہاں پہنچ گیا۔

مارجری نے خندہ پیشانی کے ساتھ ڈل کا استقبال کیا اور بغیر کسی
حجاب کے ہاتھ بڑھا دیا۔

"میں شادی کے متعلق سوچتا رہا ہوں۔" ڈل نے کہنا شروع کیا۔

"میں بھی" مارجری نے جواب دیا۔ "اور میں تمہاری دانائی کی بیحد
قدر کرتی ہوں۔ تم نے مجھ کو مجھ سے زیادہ سمجھا اور اب میں اس نتیجہ
پر پہنچی ہوں کہ موجودہ حالات ہی بہتر ہیں۔"

... رو دیتے ہوئے کہا
۔ دوپہر سخت ہے۔ میں نہیں
... ملاقات تکلیف دہ ... آیا کرو کم از کم ہفتہ وار۔ میں
اپنے دوستوں سے مل کر بیحد خوش ہوتی ہوں......"

"بہت خوب" ڈل نے سوچا "میں درحقیقت راستی پر تھا۔" اُس
دن کی ملاقات سے اُس کو بیحد مسرت ہوئی اور واپسی پر اس کا دل مسرت
سے لبریز تھا۔ اُس کے بعد اُس نے معاملات پر ذرا بھی غور نہیں کیا۔

تقریباً تین سال تک مارجری اور ڈل اسی مدار پر دن گزارتے
رہے۔ دونوں ہفتہ میں ایک یا دو بار ملتے رہے۔ اس عرصہ میں
محبت کا لفظ تک زبان پہ نہ آیا۔ ڈل نہایت مسرور معلوم ہوتا تھا۔ اب
اس نے ملاقاتوں کا سلسلہ کم کر دیا۔ اب وہ اکثر نصف راستہ سے واپس
آجایا کرتا۔ اسے محرومی دید میں لذت آنے لگی۔

اسی طرح تین سال گزر گئے۔ مارجری نے اچانک دوسرے
شخص سے شادی کر لی اور ڈل کے دل کو ناقابل تلافی صدمہ پہنچا۔ لیکن
اس نے صدمہ کو بہادری سے برداشت کیا۔ صرف اتنا کہا "کہ عورتوں سے
[illegible] جو کچھ علم مجھ کو تھا۔ اُس کی بنا پر مارجری سے تین سال قبل شادی نہ
کر کے غالباً میں نے دانشمندی کا کام کیا۔" اس نے اس عقلمندی پر اپنے
آپ کو مبارکباد دی۔ اور اپنی عقل کو آفرین کہا۔ لیکن اس کا دل مغموم تھا۔
اور ہونا چاہیئے تھا۔ ایک دو ماہ تک اس رنج وصدمہ سے اس کا حال
بہت پریشان رہا اور جسم لاغر ہو گیا۔ اُس کے نوکر اس انقلاب پر حیرت زدہ
تھے۔

شادی کے تقریباً ایک سال بعد رات کے پچھلے حصہ میں کسی سوار
کے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز نے اسے بیدار کر دیا۔ اُس کے فوراً [illegible]
کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ اس نے کھڑکی کھولی اور ایک کسان کے
لڑکے کو دیکھا جو ایک گھوڑے پر سوار تھا اور ایک خالی گھوڑا ساتھ تھا۔
لڑکے نے ڈل سے کہا۔ "حتی الوسع جلد چلنے کی تیاری کیجئے۔ کیونکہ مارجری کا آخری
وقت ہے اور اُس نے آپ کو بلانے کے لئے بھیجا ہے۔"

ڈل کوئی سوار نہ تھا۔ اس لئے وہ اسقدر کم رفتار سے چلا کہ بیکس مارجری
کے آخری لمحات تھے جب وہ وہاں پہنچا۔ تاہم کچھ منٹ اُن کی خلوت میں گفتگو ہوئی۔ ڈل
کے سامنے غریب مارجری نے آخری سانس لی۔ ڈل کی آنکھیں رشک ریز تھیں۔ ...

؎ ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(آزاد ترجمہ)

بات چیت کھیٹ اردو یہ

مہاتما جی! پرنام - ڈاکٹر تارا چند جی سے میں نے جو باتیں کیں وہ آپ نے سُنی تو ہوں گی - انہیں باتوں میں "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" پر چار کی بات چیت بھی چھڑ گئی تھی جس پر میں نے ان سے یہ بھی کہا تھا - میں کبھی کھل کر اس پر گاندھی جی سے الگ باتیں کروں گا - اسے کئی مہینے ہو چکے - جب سے ابتک آپ سے باتیں کرنے کا رہ رہ کے دھیان تو آتا رہا - پر ادھر اُدھر کے بکھیڑوں میں ایسا پھنسا جو ادھر آنا چاہنے پر بھی ابتک نہ آسکا - کچھ دنوں سے ان جھمیلوں سے چھٹکارا ملا ہے - آج چاہتا ہوں جو کچھ بیت رہا ہے اور جو ابتک نہ کہہ سکا وہ سب ایک سانس میں آپ سے کہہ دوں - پر اتنا کرے آپ ٹھنڈے جی سے اسے دیکھ سکیں - کس نے کہا اسے دیکھنے والے تو بہت ہیں اور کیا کہا اس کے پر کھنے والے بہت تھوڑے ہوئے اور ہیں اور ہوں گے - کون کہہ رہا ہے اسے چھوڑ کر کیا کہا جا رہا ہے اسی کو جانچیے اور پرکھ لیجئے -

پہلے یہ جتا دینا چاہتا ہوں - دیس کے پیچھے آپ نے اپنا سکھ چین سب کچھ کھو دیا - اسی کے لئے آپ نے جوگ سادھا - نئے نئے ڈھب سے اس سنسار نے آپ کو جھنجھوڑا اور دُکھ پہ دُکھ دئے - دوسرا ہوتا تو سٹ پٹا جاتا اور ہڑ بڑا کے نہ جانے کیا کر بیٹھتا - پر آپ ٹس سے مس بھی نہ ہوئے اور آپ نے یہ دکھا دیا:-

"نہیں لگتی ہے جونک پتھر کو"

دیس کے سُدھرنے کے لئے جو آپ نے اپنے جی میں ٹھان لی - اُٹھتے بیٹھتے وہی دھیان ابھی تک ہے اور اپنا سب کچھ تج کے اس کے پیچھے آپ دھونی رمائے بیٹھے ہیں - ایسا بات کا دھنی اور دُھن کا پکا ہونا ہنسی کھیل نہیں - ہند ماتا کی دُکھ بھری کہانی میں سے یہ آپ کی باتیں کیسے بھلائے سے بھلائی نہیں جا سکتیں - یہ میں نے اس لئے لکھا کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں لکھنے والا مجھے اور آج تک جو میں نے کیا اسے جانتا ہی نہیں - جو کچھ کہنا ہے وہ تو پھر کہوں گا پہلے یہ ایک کہانی سُن لیجئے -

ایک برہمن ، ایک چھتری ، ایک ویش ، ایک شودر یہ چاروں الگ الگ گھرانوں کے نہ جانے کیسے جنگل چلے - چلتے چلتے پیاس لگی - اِدھر اُدھر ڈھونڈے پر کہیں ایک بوند تک نہ ملی اور آگے بڑھے تو سامنے ایک ایکھ دکھائی دی - لمبے لمبے اور موٹے موٹے پونڈے کھڑے جھومتے دیکھ کر سبھوں کے منہ میں پانی بھر آیا - لپک کے ایک نے چٹاخ سے ایک گنا توڑ لیا - دوسرے نے پٹاخ سے دوسرا - جو دو رہ گئے تھے، انہوں نے بھی ساتھیوں کی دیکھا دیکھی بڑھ بڑھ کے اپنے اپنے لئے ایک ایک توڑ لیا - گنے توڑتے ہی ایک دوسرے کو سراہنے لگا -

بھئی کیا کہنا اتنا موٹا اور ایسا لمبا گنا ایک ہی جھٹکے میں یوں جڑ سے اُکھیڑ پھینکا - کیوں نہ ہو، ہونا برہمن - برہمن نے کہا اور تم اپنے چھتری پن کو تو کہتے ہی نہیں - کتنا بڑا بانس کا بانس گنا کس پھرتی سے اُکھیڑ لیا - ویش اور شودر میں بھی ایسی ہی باتیں ہوئیں

ایکھ والا وہیں کہیں آڑ میں کھڑا یہ سب سُن رہا تھا - سنتے ہی جی ہی جی میں کہنے لگا - ارے یہ تو سب کے سب الگ الگ گھرانوں کے ہیں - ان سے گنّے چھین لینا کوئی بڑی بات نہیں - یہ کہہ کے چلا اور ٹھٹکا - پھر کچھ سوچ سانچ کے ایک لمبا سا چکر کاٹ کے ان چاروں کے سامنے آتے ہی ڈنڈوت کی اور ڈنڈوت کر کے ایک سے کہنے لگا - آپ تو ہمارے مائی باپ برہمن ہیں - دھرم اور اس کی پوجا پاٹ آپ ہی سے ہے - آپ نہ ہوں تو جگ میں دھرم پرچار کا اُجالا ہی نہ رہے اور پورے سنسار میں ایسا اندھیرا گھُپ ہو جائے جو ہاتھ سے ہاتھ نہ سجھائی دے - پھر چھتری سے بولا آپ ہی کے بھروسے پر راج جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے - آپ ہی کی تلوار کی چھاؤں میں راج پاٹ پھولتا پھلتا ہے - یہ چھاؤں نہ ہو تو وہ جھلس جائے - آپ لوگوں سے بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں - ویش سے کہا تمہاری کھیتی باڑی کا کہنا - دھندا بھی ایسا نہیں جو کوئی اس کا گُن نہ مانے - اس سے سارا جگ بھلا چنگا دکھائی دے رہا ہے - نہیں تو گھڑی بھر میں ادھر ٹھوا ہو جائے - پتر، تم سے بھی

کچھ نہیں کہتا - تم نے جو کیا اچھا کیا -

اب ایک شودر ہی رہ گیا تھا - اسے گھور کے کہنے لگا - کیوں بے ملیچھ تیری یہ ڈھٹائی - تجھے تو کچا ہی چبا جاؤں [illegible] بتا - تو نے کیا سمجھ کے گنا توڑا - یہ کہتے ہی اسے کھینچتا اور گھسیٹتا ہوا اپنی جھونپڑی میں لے جا ہاتھ پاؤں باندھ کے ڈال آیا -

چار میں سے ایک کی تو یوں چھٹی ہوئی جو تین بچے، وہ اپنے اپنے گنے لئے لمبے لمبے ڈگ رکھتے آگے بڑھ ہی رہے تھے جو وہ ایکھ والا جھپٹ کے دیش سے آ کے بھڑ گیا اور ڈانٹ کے کہنے لگا - او ہل چلانے والے تجھے بھی یہ دن لگے جو دن دھاڑے یوں ڈاکا ڈالنے لگا - یہ گنے کیا تیرے ماتا پتا کے لگائے ہوئے ہیں - برہمن چھتری یہ تو ہمارے مائی باپ ہیں - ہم ان کے منگتا اور انہیں کا دیا کھاتے ہیں - لو - تو نے بھی پیٹ سے پاؤں نکالے اور ان کی ریس کرنے لگا - یہ کہہ کے اسے بھی پکڑ دھکڑ کے لے گیا -

جب وہاں سے وہ چمپت ہوا تو برہمن، چھتری دونوں کے دونوں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگے - چلو ہماری تو کر کچھ بھی تو نہیں ہوئی - یہ کہہ ہی رہے تھے جو وہ پھر دوڑتا ہوا آگے بڑھ کے چھتری سے جا بھڑا اور اسے روک کر کہنے لگا - کیوں جی کیا تم چھتری ہو - چھتری کیا ایسے ہی لٹیرے ہوا کرتے ہیں - بڑے آئے وہاں سے چھتری بن کے - ایسے چھتری ونتری بہت سے دیکھے ہیں - یہ کہتے کہتے اس کی بھی کولی بھر لی - چھتری نے بہت ہچر مچر کی اور پنڈت جی نے بھی بہت چھڑانا چاہا، پر اس نے کسی کی بھی نہ مانی اور اسے بھی جھونپڑی میں لے جا باندھ بوندھ کے ڈال آیا -

برہمن کہنے لگے - ساتھی گئے تو گئے ہم تو بچ گئے - وہ کٹھیان ہٹے کٹے اور منہ پھٹ ایکھ والا بھلا ایک کو کیسے چھوڑ دیتا - پنڈت جی ہانپتے کانپتے بھاگوں بھاگ بڑھے چلے جا رہے تھے جو وہ پھر جھونپڑی سے نکلا اور نکلتے ہی وہیں سے للکارا - للکارتا ہوا جھپٹا - اور جھپٹ کے پنڈت جی کو بھی جا دبوچا -

کہنے کو تو یہ ایک کہانی ہے - پر سمجھ والوں کے لئے اسی میں بہت سی سیکھنے کی باتیں چھپی ہوئی ہیں - اپنی اپنی پڑی ہونے سے ایک دھن کے پکے نے اپنے سے چوگنوں کو کیسے باندھ کے ڈال دیا - ان میں اتنا ہی ایکا ہوتا جیسے یہ سب مل کے ساتھ آئے تھے تو بھلا ایک تو ایک دوگنے چوگنے بھی ایسے جھٹ پٹ ان کا بال بیکا نہیں کر سکتے تھے -

آجکل دیس میں بھی ایسی ہی آپا دھاپی کی ہولی کھیلی جا رہی ہے - انگریز نے کسی کو ڈھیل دی اور کسی کو جکڑ دیا - جدھر ڈھیل آئی - ادھر والے اپنے آپے میں نہیں —— مونچھوں کو تاؤ دے دے کے لگے ہنکارنے اور ٹوپیاں اچھالنے - یہ دھیان ہی نہیں آتا - ڈھیل دی تو کیا ہوا ہیں تو سب کے سب بندھے ہوئے - اس کا بھروسہ ہی کیا آج کی ڈھیل کل کھنچ بھی تو سکتی ہے - ایک جگہ کا اٹھنا بیٹھنا رہنا سہنا - اس پر آپس میں آئے دن کی دانتا کلکل - "ساہتیہ پرشد" میں جو آپ نے کہا - کوئی اور اس سے بڑھ کر بھی کہتا تو اسے کوئی دیکھتا بھی نہیں - اچھا تو اسی کا ہے آپ کے منہ سے ایسی ایسی باتیں نکلیں جو کوئی دوسرا کہے تو سب انہیں الٹکل پچو سمجھیں -

پہلے تو یہی دیکھ لیجئے - دیس کے لئے ابھی کیا کچھ کرنا نہیں آپ برسوں سے نیند کے ماتوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کے جگانا چاہتے ہیں - پھر کیا سب کے جاگ اٹھے - بہت سے بہت ہوا تو یہی، گھوڑے بیچ کے سونے والوں نے آپ کے جھنجوڑنے سے ہوں ہوں کر کے کروٹیں لیں - ہاتھ ادھر جھٹکے پاؤں ادھر ٹپکے جمائیوں پہ جمائیاں اور انگڑائیوں پہ انگڑائیاں لیتے لیتے پھر آنکھیں میچیں اور پھر خراٹے لینے لگے اور آپ کا جھنجوڑنا ان کے لئے لوری بن گیا -

"ساہتیہ پرشد" کی دھوم دھام تبا رہی ہے - دیس کے لئے جو کچھ ہونا چاہیئے تھا وہ سب ہو چکا - سب کے سب انند اور نچنت ہو کر نئی بھاشا کے پرچار میں لگے ہوئے ہیں - بھاشا واشا کی دیکھ بھال جانچ پڑتال ناپ تول کا کھڑاگ اس گھڑی کیلئے ہے - جب کٹھن باتوں میں سے ایک ایک کر کے سب کی سب پوری ہو چکی ہوں -

دیس کس جنجال میں پھنسا ہے - کنگلاپن کتنا بڑھتا چلا جاتا ہے اور پورا دیس کیسا اپاہج ہو کے رہ گیا ہے - اپنے بل بوتے پر آج تک نہ یہ کچھ کر سکا اور آپس میں یہی تنا ریری رہی تو آگے بھی یہ کچھ کرتا دکھائی نہیں دیتا - جب ابھی تک دیس کی کسی بات کا بھی ٹھیک ٹھاک نہیں تو سب چھوڑ چھاڑ کے پہلے دیس ہی کو سدھاریئے - پھر جو جی چاہے کیجئے -

گھر میں تو پتّس پڑی ہے - کہرام مچا ہوا ہے - بھیانک چیخوں سے کان پھٹے جا رہے ہیں - جیسے بھیڑوں کا ریوڑ تتر بتر ہو کے ادھر ادھر مارا مارا پھرتا ہو - ایسے ہی دیس والے بھی ہیں - آپ ہیں جو تی [illegible]

گالم گلوچ اور بھوگ سنائے جا رہے ہیں -

ایسے دنوں میں "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" کی نیو رکھنا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کے پرچار پر اڑنا ایسا ہی ہے - جیسے کسی گھر میں تو آگ لگی ہوئی ہو - دھڑ دھڑ گھر جل رہا ہو اور اس کے رہنے والے آگ بجھانے کی جگہ نئے گھر کا ڈیزائن، چھت کی اونچائی، چھپت کی بناوٹ، انگنائی کی چوڑائی، جھروکوں کھڑکیوں کی لمبائی، اور پورے گھر میں کہاں کہاں پھول پتیاں بنائی جائیں گی، گھر سجنے کے لئے اور کیا کیا ہونا چاہیئے - ایسی ایسی باتیں کھڑے سوچتے رہیں - گھر بنے پیچھے اس کے سجنے کے لئے آپ جو چاہیں کریں - کوئی ٹوک نہیں سکتا - گھر بنا کیسا ابھی تو بھرا گھر اجڑ رہا ہے اور اس کے بچنے کی گھڑی آنے تک نہ جانے ابھی کیا کیا ہونا ہے - تو ایسی کھچڑی پکانا تو آپ کے لئے ٹھیک نہیں یہ تو سوچئے - آپ کدھر جا رہے تھے اور لوگوں کے بہکانے سے بھٹک کے کدھر چلے آئے - چلے

کوئی بڑا لکھیت، جیالا پھکیت، منچلا سورما، اپنا سب کچھ لٹا کے دہری تہری بیڑیوں ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے دیس والوں کے چھڑانے کی دھن میں جھٹ پٹ اٹھ کھڑا ہو اور لڑائی کی بھڑکتی ہوئی آگ میں کود کے سوجھ بوجھ اور نت نئی گھاتوں سے جم کے ایسا لڑے جو دوسروں کے دانت کھٹے کر دے اور چھکے چھڑا دے - پھر وہی ایکا ایکی لڑائی بھڑائی چھوڑ چھاڑ گھومتا گھامتا بھاشا کے پرچار کرنے والوں میں آ بیٹھے اور ان کے سکھانے پڑھانے سے انہیں کا ساتھ دینے پر اڑ جائے تو اسے یہاں بیٹھا دیکھ کے دیکھنے والے اپنی اپنی سی بکنے لگیں گے - کوئی کہے گا لڑائی بھڑائی کے جوکھوں میں پڑنا منہ کا نوالا نہیں جو چپ چاپ نگل لیا جائے - دیکھا نا جو کہتے تھے وہی ہوا - پہلے کیسی اکڑ تکڑ دکھائی اور پھر ٹائیں ٹائیں فش - جب وہاں نہ ٹھہر سکا تو لڑائی سے جی چرا کے یہاں بیٹھنا ہی پڑا -

دوسرا کہے گا - نہیں بھئی یہ بات نہیں - لڑائی کو بھی تو دیکھو گھنٹے دو گھنٹے، ایک دن دو دن، مہینے دو مہینے کی نہیں برسوں ہو چکے - ہاتھ پاؤں کب تک چل سکتے ہیں - گھڑی بھر انگلی ہلا کے تو دیکھو کتنی سوجھتی ہے - لڑتے لڑتے ہاتھ پاؤں تھک کے چور ہو گئے ہوں گے - ستانے کے لئے کہیں بیٹھنا بھی کیا بودا پن ہے - تیسرا کہے گا بیٹھنا تو بوداپن نہیں پر جم کے بیٹھنا وہ نہیں تو پھر کیا ہے -

جتنے منہ اتنی باتیں ہوں گی - ساتھ ہی سوجھ بوجھ والے بھی یہی کہیں گے - ایسے منچلے کے لئے سب سے پہلے دیس ہی کی سیوا چاہیئے، دیس کے پورے بندھن جب کھل چکیں تو بھاشا واشا کا پرچار سب کچھ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کے ہو سکتا ہے - اور جب تک دیس نہ سنبھلے تب تک ایسے الجھاوے میں الجھنا نہ چاہیئے -

بحتر کی لڑائی سے ایک بانکے منہ موڑ کے چلے - دیکھنے والے نے ٹوکا - ہائیں یہ کیا! - آپ کی بکیتی پھکیتی کی تو دھوم تھی - بڑے بڑے جیالے لوہا مانتے تھے - جب آپ ہی نہ جم سکے تو پھر کون جمے گا اور اس گھڑی کو پھر کون جیتے گا اس ٹوکنے پہ بانکے پلٹے اور جھنجلا کے کہنے لگے کیا کہتے ہو - تم کیا جانو - تمہیں تو یہی آتا ہے جو منہ میں آیا بک دیا - کیا کہیں ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھ لیا - ایسے ایسے بیٹھے جونک سُک سے ٹھیک ڈیل ڈول کے اچھے پورے اور ایسے سجیلے جدھر سے نکل جائیں دیکھنے والوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جائیں اور چھوٹے بڑے سب کی ٹکٹکی بندھ جائے - ان میں کا ایک ایک سینکڑوں پہ بھاری نہتا بھی ہو تو لاکھوں کے ٹڈی دل میں گھس کے دانتوں سے بوٹیاں کاٹ کاٹ کے تھوک دے اور منچلوں کا پتا پانی کر دے - ایسے ایسے جیالوں کے دھڑ گولیوں سے چھلنی چھلنی ہوتے ہوئے دیکھے - اس سب کچھ ہونے پر بھی دیکھنے کی بات یہ ہے جس جگہ ان کے پاؤں جم گئے پھر وہاں سے نہ ہٹے اور وہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے ٹھنڈے ہو گئے - بھلا یہ بھی کوئی لڑائی ہے - اس سے تو ہیجڑوں کی لڑائی اچھی - کوس بھر سے دن دن ہونے لگی اور یہاں، جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی - تلوار کے دھنی تھے تو منہ کیوں چھپایا - آمنے سامنے ہو کے دو دو ہاتھ ہمارے بھی دیکھ لئے ہوتے - کھیرے ککڑیاں جیسے کٹتی ہیں ایسے ہی گھڑی بھر میں پرے کے پرے کاٹ کے نہ رکھ دیتے تو یہ اپنی مونچھیں منڈوا ڈالتے -

اب یہ جگہ منچلوں کے ٹھہرنے کی نہیں اور سچ تو یہ ہے اب جینا دوبھر ہو گیا -

پہلے کبھی بانکوں کی بڑی دھاک تھی اور ہوتے بھی تھے بڑے بڑے تلوریئے - پھر بھی ان میں اول جلول پن بہت ہوا کرتا تھا پر آپ تو ایسے نہیں - آپ میں جو سمجھ، سوجھ بوجھ اور اچھی اچھی باتیں پرمیشور نے اکٹھی کر دی ہیں - وہ پہلے کے بانکوں میں کہاں - آج آپ ہی ہند ماتا کے انوکھے بانکے ہیں - دیس کا اکھاڑا کھلا ہوا ہے اور اس میں برسوں سے راج کے ساتھ آپ کی گتھم گتھا ہو رہی ہے - دونوں ایک دوسرے کو رگید رگید کے جیت کرنے کی گھات میں لگے ہوئے ہیں - دیکھنے والوں کے جتھے کے جتھے اور ٹولیاں کی ٹولیاں پرا جمائے آپ کے اس بڑھنے کو بڑے اچنبھے سے دیکھ رہی ہیں - پر کچھ دنوں سے جو آپ اس اکھاڑے سے

نکل کر دوسرے دھندے میں لگ گئے - اس پر اپنے پرائے سب میں کانا پھوسی ہو رہی ہے اور کہا جا رہا ہے مہاتما جی سیدھے جاتے جاتے یہ کدھر مڑ گئے -

آپ کے اِدھر آنے سے دیس کی بات کیسی ادھوری ہو کے رہ گئی تو پھر اُدھر ہی جائیے نا ، اور دیس ہی کے لئے جوبن پڑے وہ کیجئے - رہا بھاشا کی گتھیاں سلجھانا اسے پھر کے لئے اٹھا رکھئے - بھاشا کیا کہیں بھاگی جا رہی ہے - جو اس کی روک تھام ابھی ہو سکتی ہے پھر نہ ہو سکے گی - جدھر آپ جا رہے تھے اس کے سامنے بھاشا واشا ہے کیا - انند ہو کے ایسے سیکڑوں کھیل کھیلے جا سکتے ہیں -

گاؤں میں دیکھا ہو گا جو ہاٹ آج بھرا پھر سات دن تک یونہی سنسان پڑا رہتا ہے - اس سنسار میں جو جو دھندے لوگ کر رہے ہیں - کچھ ہی دنوں کے لئے ان دھندوں سے انہیں الگ رکھا جائے تو وہ پہلے سے نہیں رہتے - سینے پرونے والوں سے سلائی ، بڑھیوں سے لکڑی کی چیر پھاڑ ، لہاروں سے لوہے کی پیٹ پاٹ ، کمہاروں سے مٹی کی تھوپ تھاپ ، لکھنے پڑھنے والوں سے لکھت پڑھت ، سوچ بچار بہت نہیں ، تھوڑے دنوں کے لئے یہ ان سے چھڑا کے دیکھ لیجے ان میں سے کسی میں بھی پہلے کی سی بات نہیں رہے گی -

آج جو کرنا ہے اسے کل کے لئے اُٹھا رکھتے یہ بات آ ئی گئی ہو جاتی ہے ، آج کا دھندا آج ہی کے ساتھ ہے اسے آج ہی پورا ہو جانا چاہیئے - کل کا دھندا آج سے الگ ہو گا - آج کی بات کل پر چھوڑ دی تو کل کی پرسوں اور پرسوں کی اترسوں پر چھوٹتی رہے گی اور یونہی چھوٹتے چھوٹتے پھر وہ بات ہی چھوٹ جائے گی - بات ادھر ٹھنڈی پڑی تو پھر دھیان کبھی کھٹر کے رہ جاتا ہے - تو ابھی دیس کی بات ٹھنڈی نہیں پڑی ہے - یہ سماں ابھی ایسا ہے - جس میں بھاشا واشا کو چھوڑ چھاڑ کے پھر آپ دیس کو بچا سکتے ہیں اور اس کے لئے ان تھک دوڑ دھوپ کر سکتے ہیں - آپ کی دوڑ دھوپ باسی کڑھی کا اُبال نہیں جو کچھ نہ ہو سکے آج کچھ نہیں ہے تو کل کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا اور آگے بڑھ کر آنکھیں یہ سُہانا سماں دیکھیں گی -

دیس میں میل ملاپ کے جھنڈ کے جھنڈ ایسے چھائے ہوئے ہیں - جن کی گھنی چھاؤں میں پریم جل انگڑائیاں لیتا بہہ رہا ہے - ایک کے من کی ٹہنیاں دوسرے کے من میں کھچڑی ہو رہی ہیں - پیار کی بیل میل جول کے جھپکتے ہوئے پودوں پر چڑھی جا رہی ہے - پریم کے پھولوں کے گچھے کے گچھے اِدھر اُدھر لٹک رہے ہیں - سکھ چین کے پھولوں کی بھینی بھینی باس سے دیس کا دیس بسا ہوا ہے - مَن ریانے والی گھنگھور گھٹائیں سنسار کی آنکھوں میں کاجل لگا رہی ہیں - کالے کالے بادلوں کے بھاٹ رہ رہ کے دیس کے گیت گا رہے ہیں - کوئل کی کوک ، موروں کی جھنکار ، پپیہوں کی پکار ، ہلکی ہلکی پھوار ، سلونی سانولی گھٹاؤں کے اندھیرے گھپ میں رہ رہ کے بجلی کی چمک جیسے کسی جوبن کی متوالی کے بھیگے ہوئے بال سکھانے کے لئے جھٹکے ہیں گھڑی گھڑی منہ پہ آ جاتے ہیں - ایسے دھندلکے میں دیس کے سپوت آپ کے چرنوں میں جھکے ہوئے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور آپ دیس کی ہری بھری پھلواری کے منڈوے میں ایسی سُبھ گھڑی کو دیکھ دیکھ کے مُسکرا رہے ہیں -

اچھا - لگے ہاتھوں اپنی اس نئی بھاشا کو بھی دیکھتے چلئے - جس کے پرچار کی دھن میں آپ اپنا اب تک کا کیا کرایا سب اکارت کر دینا چاہتے ہیں - اردو میں عربی فارسی بولوں کی بہتات سے ایسا دھوکا کھایا جو کھُلم کھُلا آپ یہ کہہ اُٹھے -

" اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے - قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا - مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں - "

یہ آپ سے کس نے کہہ دیا - کہاں مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا اور کہاں اردو ، دونوں میں کوئی تُک بھی ہے - ایسی بات منہ سے نکالنے سے پہلے آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو ہی سے پوچھ لیا ہوتا -

ہندی اور اردو کے جھگڑے پہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ڈاکٹر سید محمود کو جو ایک لمبی چوڑی چٹھی لکھی تھی - اس میں ایک جگہ پنڈت جی یہ لکھتے ہیں :-

> " عجیب بات تو یہ ہے کہ نہ جانے ہمارے ملک میں کتنی چیزیں ہیں جو فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیتی ہیں - زبان کا مسئلہ بھی مذہبی بن گیا اور بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے - میں بصد ادب عرض کروں گا کہ میں اسے ماننے کے لئے تیار نہیں - اردو کو اپنی زبان سمجھتا ہوں جسے میں بچپن سے بولتا چلا آیا ہوں - "

لیجئے پنڈت جی تو اردو کو اپنی ایسی بھاشا سمجھ رہے ہیں جسے وہ

بچپن سے بولتے چالتے ہیں اور آپ اسے مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا کہنے پر اڑے ہوئے ہیں - اب آپ ہی بتائیے - سُننے والا کس کا کہا مانے کسے جھٹلائے اور کسے سچ جانے - اس کے ساتھ ساتھ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے مسلم یونیورسٹی یونین میں اردو کانفرنس کے اسٹیج پر "اردو ہماری زبان" کہہ کر جو لمبی چوڑی اسپیچ پڑھی اسے بھی کہیں کہیں سے سُن لیجئے - پنڈت جی اسی میں ایک جگہ یہ کہتے ہیں :-

"اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اردو قوموں کے میل جول اور دیسی بدیسی زبانوں کے اختلاط سے پیدا تو ہوگئی لیکن بعد میں بھی ہندو اس کو اپنی زبان سمجھتے رہے اور اس کو استعمال کرتے رہے حضرات میں اس تنقیع کو مُبہم میں رکھنا پسند نہیں کرتا - سنئیے ہندوؤں میں تبلیغ مذہب تو عرصہ سے بند ہو چکی تھی قریباً دو ہزار برس کے بعد اب پھر تازہ ہوئی ہے - اس واقعہ کو نظر میں رکھ کر دیکھنا یہ ہے کہ ہندوؤں میں دھرم پرچار کے سلسلے میں اردو اختیار کی گئی یا نہیں - اگر تحقیق سے اس کا جواب اثبات میں ملے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو کو ہندوؤں نے اپنے ہندو بھائیوں کی دینی ہدایت کے لئے استعمال کیا - انیسویں صدی عیسوی کے اوّل برسوں میں اچھوت ادھار اور ہریجنوں کی تبلیغ یا شدھی کا نام تک کوئی نہ جانتا تھا - مگر ۱۸۱۹ء میں سری بھاگوت کا دسواں اسکند یعنی باب اردو کی ایک ضخیم مثنوی مسمی "آئینۂ مستور" کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے - یہ کئی سو صفحے کی قلمی کتاب میرے کتب خانہ میں موجود ہے - یہ مذہبی اور اعتقادی کتاب ایک ہندو اپنے ہندو بھائیوں کے لئے اچھی اردو نظم میں تصنیف کرتا ہے -"

پھر پنڈت جی نے ہندو دھرم کی لائبریری میں سے ایسی بہت سی چھوٹی بڑی اردو لکھتوں کا اتا پتا دیا ہے، جو پوری کی پوری ہندو دھرم کی باتوں سے بھری پڑی ہیں - گھر کے بھیدی کی یہ باتیں بھی سننے کی ہیں :-

"سنسکرت اور ہندی بھاشاؤں کے ہوتے ساتے ہندوؤں نے اردو کو اوراد و وظائف سے یا زیادہ احتیاط سے یہ کہئے کہ مذہبی اور ملّی تقریبوں سے خارج نہیں کیا - شکنت چالیسی ایک اردو کی کتاب "استوتر" یعنی وظیفہ کی ہے - یہ اردو کے مخمّس ترجیع بند کی صنف سے ہے - ہر بند کے چار مصرعے ٹھیٹ اردو میں ہیں اور ترجیع کا مصرع "مخمّس تسعی" چار بار آتا ہے - اس کو میں نے پوجن کے سلسلے میں وظیفہ یا مناجات کی طرح پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ دھیان میں رکھنے کی بات ہے کہ تلسی داس، راماین لکھ چکے تھے - اس کی کتھا برابر ہو رہی تھی - مہابھارت اور بہت سے پران اور دوسری مذہبی کتابیں ہندی میں منتقل ہو چکی تھیں - لیکن اپنے اہالیِ ملّت میں دھرم پرچار کی کمی محسوس ہوئی جب تک کہ اردو سے کام نہیں لیا گیا - اس ضمن میں وہ، تمام اردو دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں - جنہوں نے مہابھارت، راماین گیتا، مہاتم، شو پران، گنیش پران اور جانکی بجے وغیرہ دھرم پستکیں اردو میں تصنیف اور ترجمہ کیں - یہ کتابیں منشی نول کشور کے مطبع سے چھپ کر آج تک شائع ہو رہی ہیں اور ہندوؤں میں ان کے مذہب کی تلقین اور روایاتِ ملّی کے زندہ رکھنے کا زبردست آلہ ہیں - ان نظم کی کتابوں کے علاوہ بہت سے اپنشد اور جوتش شاستر اور سمرتیاں اردو نثر میں منتقل ہو کے شائع ہوئیں اور آج تک ان کی مانگ برابر جاری ہے - یہی حال آریہ سماج کے لٹریچر کا ہے -"

یہ کہانی کہتے کہتے پنڈت جی نے کہی ہوئی باتوں کو پھر ایک جگہ اکٹھا کر کے ایک چیلنج بھی دیا ہے جس کا نچوڑ یہ ہے :-

"آپ نے دیکھا کہ اردو کی تعمیر و تدوین اور ترویج میں ہندوؤں کا کتنا معتد بہ حصّہ ہے - آپ نے دیکھا کہ ہندوؤں کی مذہبی اور ملّی کتابیں کس کثرت سے اردو میں لکھی گئیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ بھگوت گیتائیں* ہر سال بلا ناغہ شائع ہوتے رہتے ہیں - اگر کوئی ہندی والا (میرا مطلب ہے اردو ہندی کے جھگڑے کا علمبردار) اس وقت یہاں موجود ہے تو سامنے آ کر بتائے کہ جو واقعات ابھی پیش کئے گئے ان میں سے کونسا صداقت سے محروم ہے -"

پنڈت کیفی کی باتیں سنتے سنتے آپ اُکتا گئے ہوں گے - یہاں تک

* کے ایک سے زیادہ نسخے ترجمے اور تفسیریں اردو نظم اور نثر

تو آپ سُن ہی چکے ۔ گنتی کی دو ڈھائی باتیں اور سُن لیجئے ۔ یہ لکھت کسی مسلمان کی ہوتی تو سچ مانئے اس میں سے دو بول بھی کبھی بیان نہ لکھتا۔ پر اس کا لکھنے والا ہندو اور ہندو بھی ایسا ویسا نہیں بڑی سُوجھ بُوجھ کا پنڈت ہے جس کی آنکھیں سچائی پر جمی ہوئی ہیں ۔ اپنے ساتھ کے بھٹکے ہوؤں کو پکار پکار کے ادھر ہی بلانا چاہتا ہے ۔ جدھر سچائی کا اُجالا ہے۔ اس کی لکھت کے ایک ایک بول سے یہی دکھائی دیتا ہے ۔ جن باتوں سے دلیں نڈھال ہوتا جارہا ہے ۔ ان پر وہ جی ہی جی میں کڑھ رہا ہے ۔ اونٹ رہا ہے اور بپھرا بیٹھا ہے ۔ اس لکھت میں جی کی بھڑاس نکالی ہے اور پتے پتے کی باتیں ایسی ایک جگہ اکٹھی کر دی ہیں جنہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ اس میں ایک جگہ پنڈت جی نے یہ بھی لکھا ہے :۔

"جب مہاتما گاندھی نے اپنے سابرمتی کے آشرم کی بھجناولی مُرتّب کرنے کا حکم دیا ۔ اس وقت بھارتیہ ساہتیہ کا یہ لشکر جرار جو ناگپور میں ہنگامہ آرا ہوا ۔ کہاں چلا گیا تھا ۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ مہاتما جی کے مرحوم سابرمتی آشرم کے بھجنوں کے اس ہندی کے مجموعے میں کل ۱۸۱ بھجن ہیں ۔ جن میں ۱۰۲ بھجنوں کو ہندوستانی نام دیا گیا ہے ۔ باقی ۷۹ بھجن گجراتی، مرہٹی وغیرہ دوسری زبانوں کے ہیں اور یہ واضح رہے کہ ان ۱۰۲ ہندوستانی بھجنوں میں کئی غزلیں بھی ہیں ۔ جیسے :۔

ہے بہارِ باغِ دنیا چند روز
دیکھ لو اس کا تماشا چند روز

یہ بھجناولی ہندی میں چھپی ہے ۔ اب اگر اردو کے لفظ سے کسی وجہ سے بے اعتنائی ہوگئی تھی تو بھارتیہ ساہتیہ میں ہندوستانی ہی سے کام رکھتے ۔"

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی کیا یہ سب باتیں ٹھیک ہیں ۔ اچھا نہیں چھوڑیے ۔ بیچ میں بات میں سے بات نکل آئی اور جو کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا۔ میں یہ کہہ رہا تھا اردو میں آپ نے عربی، فارسی بولوں کی ریل پیل دیکھ کے اسے مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا سمجھ لیا ۔ دیکھئے بات یہ ہوئی ۔ اردو کی جب نیو ڈالی جارہی تھی تو یہاں کے چھوٹے بڑے جتنے سب ہی اس میں لگے ہوئے تھے اور مسلمانوں کا راج تھا ۔ اس لئے عربی، فارسی کے بول اردو میں آئے اور بہت آئے اور جو مسلمان راج کی جگہ کوئی اور راج ہوتا تو اُس راج کی بھاشا کے بولوں کی بھیڑ کی بھیڑ اردو میں لگ جاتی ۔ کسی بھاشا میں اور دوسری بھاشا کے بولوں کی بھرمار دیکھ کر بے سوچے سمجھے کہہ دینا یہ بھاشا اس جتھے کے دھرم کی بھاشا ہے سوچئے تو یہ کتنی بڑی بھول ہے آجکل اردو میں انگریزی بول بڑھتے جارہے ہیں ۔ کوئی نہ جاننے والا انگریزی بولوں کی بہتات دیکھ کر اردو کو انگریزوں کے دھرم کی بھاشا کہنے لگے تو سچ کہئے اس کے اس کہنے پر کیا آپ اپنی ہنسی روک سکیں گے ۔

دھرم اور بھاشا ان دونوں کے ڈانڈے الگ الگ ہیں ۔ ان دونوں کے گھال میل کو جس سے پوچھئے یہی کہے گا یہ کوئی اچھی بات نہیں ۔ جب دھرم اور بھاشا کا آپس میں گڈ مڈ کرنا ٹھیک نہیں کہا جاتا تو منہ سے جو کہا جارہا ہے وہ کیا کیوں نہیں جاتا ۔ چبا چبا کے باتیں کرنا کس لئے دونوں کا میل جول اچھا لگتا ہے تو کھُل کر کہہ دیجئے دھرم اور بھاشا کو ہم الگ الگ نہیں دیکھ سکتے اور دونوں کو ملا دینا چاہتے ہیں ۔ اس کہنے پہ بھی کوئی آپ کو ٹوکے ۔ تو اسے جو جی چاہے کہئے ۔ پر جبتک آپ منہ سے یہ نہ کہیں گے تب تک پوچھا گچھی کی لے بڑھتی ہی رہے گی ۔

پہلے پہل جو بھاشا کے جھگڑے کی بھنک کانوں میں پڑی تو میں نے جی میں کہا ۔ کہیں ایسا تو نہیں نئے نئے مولوی، مُلّا اپنی بڑائی جتانے کے لئے چھانٹ چھانٹ کے ایسے موٹے موٹے اور بھاری بھاری عربی فارسی کے بول بات چیت میں ٹھونستے ہیں جو بہت سے ہندو نہیں سمجھ سکتے ۔ یہ بات ہندوؤں کو بُری لگی ہو اور جھلاّ کہ انہوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ چننے کی ٹھان لی ہو ۔ ساتھ ہی یہ بھی دھیان آیا ایسا تھا بھی تو اس کا یہ توڑ تو نہ تھا جو کیا جارہا ہے ۔ وہ بات ہی کیا تھی ۔ دونوں جگہ کے لکھے پڑھے سمجھ والوں کو بلا لیا ہوتا، یہ سب ایک جگہ بیٹھ بٹھا کے گھڑی دو گھڑی میں یہ جھگڑا چکا دیتے ۔

یہ بھی آج کا اک نیا ڈھکوسلا ہے ۔ جسے دیکھئے "اردو" اور "ہندی" کا منتر پڑھ رہا ہے اور اسی کی مالا جپ رہا ہے ۔ بہت سے پڑھے لکھوں سے یہ پہیلی بوجھی جا چکی ۔ میرا بوجھنا یہی تھا اور ہے ۔ جب اردو کا ڈیل ہندی ہی کی مٹی سے بنا ہے تو پھر اردو کے ساتھ اور "ہندی" لکھنا کس لئے ۔ اردو میں ہندی ایسی پیری ہوئی ہے جو کبھی اس سے الگ ہی نہیں ہو سکتی ۔ اور کیسے الگ ہو سکتی ہے ۔ جب اردو کی کھال، چمڑا، ہڈیاں، ڈھانچہ جو کچھ ہے وہ ہندی ہی ہے ۔ اپنی اپنی سب کہہ رہے ہیں اور اسے کوئی دیکھتا ہی نہیں یہ ہے کیا ۔ جانچئے تو گھڑی بھر میں دودھ کا دودھ، اور پانی کا پانی الگ الگ دکھائی دینے لگے گا ۔ اس کے پرکھنے اور جانچنے کا ڈھب یہ ہے ۔ دو اچھے پڑھے لکھے سامنے بٹھا کے ایک سے کہئے تم ایسی

اردو لکھو - جس میں عربی فارسی بولوں ہی کی ریل پیل ہو اور بھولے سے بھی کہیں ہندی کا ایک آدھ بول تک نہ آئے - ہندی کے کسی بولوں کے نہ آنے پر بھی پوری لکھت اردو ہی رہے - دوسرے سے کہا جائے تم عربی، فارسی کو ہاتھ نہ لگاؤ اور ایسی اردو لکھو جس میں عربی، فارسی بولوں کی کہیں چھان نہ آئے اور پوری کی پوری لکھت ٹھیٹ اردو رہے - تو پہلا ایسے ڈھائی بول بھی نہیں لکھ سکتا۔ جس میں اردو بن رہ سکے - پہلے لکھنے والے کی لکھت عربی، فارسی بولوں کی ایسی کھچڑی ہو کے رہ جائیگی جسے اردو سے نہ کوئی لگاؤ ہوگا اور نہ کوئی اسے اردو کہہ سکے گا -

دوسرا لکھنے والا عربی، فارسی بولوں کی بھیڑ چیرتا ہٹاتا آگے بڑھ کے ٹھیٹ اردو لکھ سکتا ہے - تو اردو لکھنے اور بولنے میں ہندی سے کترا کے کوئی کتنا ہی نکلنا چاہے کبھی نہیں نکل سکتا اور کیسے نکل سکتا ہے جب اردو کے پتلے میں پوری مٹی ہندی ہی کی لگی ہوئی ہو - باہر والی بولیوں میں سے عربی، فارسی بول اس میں بہت سہی پر ہندی کے آگے وہ ایسے ہی ہیں جیسے موسلا دھار مینہ کے سامنے پانی کی کچھ بوندیں -

یہ کبھی نہیں ہو سکتا جو ہندی کو نہ چھوا جائے اور عربی، فارسی بولیوں ہی کی الٹ پلٹ سے اردو لکھت اور بات چیت ہو سکے - ہندی کو ہاتھ نہ لگانے اور عربی، فارسی کے اکٹھا کر دینے سے اردو نہیں ہو سکتی - اردو میں سے عربی، فارسی بول نکال کے یوں لکھا جا سکتا ہے - جیسے لکھنے کا یہی ڈھنگ جس میں آپ سے باتیں کی جا رہی ہیں - جب کسی جتن سے بھی ہندی کو اردو سے الگ نہیں کیا جا سکتا تو پھر اردو کے ساتھ ساتھ "اور ہندی" کا ٹکڑا کس لئے بڑھایا جا رہا ہے - کیا یہ بتا سکیں گے -

اور سنئے - پھول گیندا نہ مارو لگت کلجوا میں چوٹ، سائیں سے سچا رہ اور بندہ سے ست بھاؤ، موہے ڈار دیو سارے رنگ کی گگر - یہ سب اور لکھنے کا یہ ڈھب جس میں بات چیت ہو رہی ہے - ان میں سے آپ کسے ہندی کہیں گے - یہ تو ہو نہیں سکتا جو ایک لاٹھی سے سب کو ہانک دیں اور کسی کو بھی آپ ہندی نہ کہیں -

اچھا ان میں سے آپ جسے بھی ہندی کہیں اپنے بنارس کے "ہنس" کو اس سے ملا کے تو دیکھئے - "ہنس" کی لکھت کیا اسی کی سی ہے - آپ "ہنس" کی لکھت کے ڈھب کو کٹھن نہیں سمجھتے نہ سمجھئے - اوروں سے پڑھوا کے تو دیکھئے - اسے سب پڑھ بھی تو نہیں سکتے اور کیسے پڑھ سکیں گے - اس کی ایسی نرالی لکھت ہے جو پہلے اور آج کل کے ہندوؤں کی لکھت سے میل ہی نہیں کھاتی -

"ہنس" اور کچھ ہنس والوں کو چھوڑ کے ہندوؤں ہی میں سے کیا دو ایک کی بھی ایسی لکھت آپ دکھا سکیں گے "ہنس" میں اوروں کے ایسے ایسے من مانے کڈھب سے کڈھب بول ٹھونسے جا رہے ہیں اور ایسے بھولے لبیرے بولوں کی بھرمار کی جا رہی ہے جن کے سمجھنے کے لئے مسلمان تو مسلمان ہندوؤں کو بھی سنسکرت کی ڈکشنری دیکھنا پڑتی ہے - آج کل کے نئے ہندی لکھنے والوں کی نہ کہئے یہ سب اور ان کے توڑتے ہیں - کچھ لکھنا لکھانا ہوا، جھٹ سے سنسکرت کی ڈکشنری گھسیٹ لی - اسے سامنے رکھ کر آئیں بائیں شائیں جو جی میں آیا بھولے لبیرے بول کے بول دیکھ دیکھ کے لکھتے چلے گئے - یہ میں نہیں کہتا - ان کے لکھنے کا ڈھب آپ پکار پکار کے کہہ رہا ہے -

سنسکرت کا ہندو دھرم کی بھاشا ہونا اور اس بھاشا کا کبھی نہ برتنا - بھلا پھیلاؤ کون ایسا پڑھا لکھا ہے جو نہیں جانتا اس میں دیکھنے کی جو بات ہے وہ یہی ہے سنسکرت جب سہاگن تھی اور راج کی چہیتی بھاشا سمجھی جاتی تھی تب بھی چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب اسے نہیں بول سکے - کچھ ہی لوگ تھے جو اس میں بات چیت کر سکتے تھے - تو راج کی بھاشا ہونے پر بھی جب یہ سب کی بھاشا نہ بن سکی تو اب کیا بن سکتی ہے - راج کے پانی ہی سے جو پودا نہ پھیپ سکا وہ بھوبل میں کیا پھل پھول سکتا ہے - پھلواری کی دیکھ بھال اور اس کے ٹھیک ٹھاک ہونے پر بھی جو پھول نہ کھل سکے تو اب پت جھڑ میں کیا کھلیں گے - جس پھبن کو راج بھی نہ بنا سکا تو راج کی دھوپ ڈھل چکنے پر وہ کیا بنتا - جب دانت تھے چنے چبائے نہ چب سکے - تو دانت ٹوٹنے پر وہ کیسے چبائے جا سکتے ہیں - جو پرانے ڈھنگ کے سڈول موتی جو راج کا سنگھار ہونے پر بھی مٹی میں اٹے رہے - اب ٹوٹ پھوٹ پر ان کی جھاڑ پونچھ ہوئی بھی تو کیا -

پھر یہ بھی دیکھئے آج جس نئے گھر کی نیو رکھی جا رہی ہے - یہ پہلا بھی بھلا تو کیا تک پورا بن سکے گا - بھاشا کا گھر اور گھروں کا سا تو نہیں جو کچھ دنوں میں بن بنا کے پورا ہو گیا اور اس میں گھر والے رہنے سہنے لگے - بھاشا کا گھر بنانا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور پھر یہ ایک آدھ جیتے کے بوتے کا روگ نہیں - اس کے بنانے کے لئے سب کا ایکا اور بڑی سوجھ بوجھ چاہئیے - یونہی سی آنکھ بچی اور کچھ سے کچھ ہو گیا یونہی سی چوک ہوئی اور کی کرائی باتوں پر پانی پھر گیا -

[illegible] زمانے اور اپنی بات کی ہٹ کرنے کی تو اور بات ہے - پر ٹھنڈے

جی سے دیکھئے تو آپ کی اردو میں وہ سب باتیں پائی جا رہی ہیں جو بڑھنے والی بڑی سے بڑی بھاشا میں ہونا چاہئیں اور جو سچ کہنا کوئی پاپ نہ ہو تو مجھے یہ کہنے دیجئے ۔ اردو میں کچھ پھیلاؤ کی ایسی ایسی باتیں بھی چھپی ہوئی ہیں جو اوروں میں نہیں ۔ ابھی اس کا چھٹپنا ہے ۔ اس چھٹپن ہی میں بھولی بھولی باتوں کے ساتھ ساتھ وہ وہ جنچی تُلی گہری گہری باتیں بھی اس میں ہیں ۔ جنہیں دیکھ کر اچنبا ہوتا ہے ۔ بڑے بوڑھوں نے سچ کہا ہے ۔ بہو کے بول گھونگٹ میں اور پوت کے پاؤں پالنے میں' اس پوت کے پاؤں پالنے میں دیکھئے تو جب ابھی سے اس کی ادھ کٹی باتیں جی موہے لیتی ہیں تو آگے کیا ہوگا ۔ کسی بھاشا کے پھیلاؤ کے جانچنے کے اور بہت سے ڈھبوں میں سے ایک ڈھب یہ بھی ہے :۔

جگ میں لوگوں کی چھٹائی بڑائی ایک سی نہیں ہوتی ۔ سنسار میں یہی ہوتا آیا ہے ۔ کوئی چھوٹا ہے تو کوئی بڑا ۔ کوئی بہت چھوٹا ہے ۔ تو کوئی بہت بڑا ۔ کوئی راجہ ہے تو کوئی مہاراجہ ۔ کوئی اس کی چوکھٹ کا منگتا ہے اور کوئی اس منگتا کے گھر کا بھکاری ۔ ایسے ہی ایسی بہت اونچ نیچ اور سیکڑوں اُتار چڑھاؤ لوگوں میں پائے جاتے ہیں ۔ تو جس بھاشا میں ایسے اُتار چڑھاؤ کے لئے الگ الگ بات کرنے کے ڈھب (Form of address.) جتنے بہت ہوں اس بھاشا کا پھیلاؤ ماننا پڑے گا ۔

عربی ، فارسی ، سنسکرت ، انگریزی ان سب میں سے کسی میں بھی یہ بات کرنے کے ڈھب بہت سے بہت نکلیں گے ، تو تین چار ۔ انہیں کے سامنے اب اپنی اردو کا پھیلاؤ دیکھئے گنئے گا تو ان کی گنتی اردو میں پندرہ سولہ تک پہنچے گی اور پورا پورا سوچ بچار کیا جائے تو ایسے اور اور بول بھی نکل سکیں گے ۔ انہیں دیکھ کے کہیں یہ نہ کہہ اُٹھئے گا ۔ یہ بول ہیں کہاں کہاں کے جہاں کے بھی ہوں اب یہ سب کے سب اردو ہی کے ہیں ۔ اردو کوئی ایک بھاشا تو نہیں بیچ میں مٹھائی ہے ۔ اچھا اب انہیں دیکھئے :۔

تو ، تم ، آپ ، جناب من ، جناب مکرم ، جناب محترم ، جناب والا ، جناب عالیجناب ، سرکار ، حضور ، پیرو مرشد ، جلالت مآب ، اعلیٰحضرت ، ملک معظم ، شہنشاہ ، جہاں پناہ ۔ یہ موتی جن سیپیوں کے ہیں کیا وہاں بھی انہیں ایک جگہ ایسا ہی اکٹھا کر لیا گیا ہے جیسے ان بکھرے ہوئے موتیوں کی اردو نے جگمگاتی ہوئی لڑیاں بنا دیں یہ آپ جب چاہیں دیکھ سکتے ہیں ۔

تو جس ندی کا پاٹ اتنا چوڑا ہو چکا ہو ۔ جس کا اُتھلاپن گہرے پن میں پلٹتا جا رہا ہو ۔ اسے پاٹنے کی دُھن میں دن رات نئے نئے جتن کرنا اور الگ سے ایک نئی ندی نکالنے کے سوچ بچار میں آئے دن کھکیڑیں اُٹھانا کیا کوئی سمجھ والا اسے اچھا سمجھ سکتا ہے ۔

عربی کو آپ ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے ۔ اچھا نہ سہی ۔ پر فارسی سے آپ کی یہ چڑ کیسی ۔ فارسی اور سنسکرت یہ دونوں تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں ۔ ان دونوں کے کچھ بول لکھتا ہوں ان کا ملا جُلا ہونا دیکھئے :۔

فارسی اور سنسکرت کے ملتے جُلتے بول

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
مہ	مہا	شاخ	شاکھا	ترس	تراس
کافور	کرپور	آستان	ستھان	بیوہ	ودھوا
بیم	بھیم	بار	بھار	برویت	بھرورت
تپاس (عبا)	تپسیا	کرباس	کپاس	جنداں	چنڈال
کمریچ	مگرمچھ	انگارہ	انگار	موش	موشک
باش	باس	فرمان	پرمان	ریشم	ریشمی
است	استی	داغ	داگھ	کفت	کپھ
خشخاش	کھس کھس	بند	بندھ	ابرو	ابھرو
زانو	جانو	انگشت	انگشٹ	ادرک	آدرک
آتش	آشن	اشتر	اشٹر	سرشت	سرشٹی
خسر	سوسر	خر	کھر	سخت	شکت
بادام	باتام	دیر	دھیر	سریر	شریر
میغ (ابر)	میگھ	نیلوفر	نیلوت پل	کان	کھان
کنج	کنج	گرم	گھرم	کام	کامنا
در	دوار	گرہ	گرہ	تن	تنو
ماست (دہی)	مستو	یک	ایک	شام	شائم
برشگال	برشاکال	بارش	برشا	جنگل	جنگل
میش	مہش	ارج	ارج	بوم	بھوم
شغال	سرگال	گاو	گئو	ماہ	ماس
روز	روج	گندم	گودھوم	شیر (دودھ)	کشیر
جو	یو	پارینہ	پورانا	چرم	چرم
خون	شون	پدر	پتر	مادر	ماتر
برادر	بھراتر	پسر	پتر	دختر	دہتر
سرین	شرونی	بخش (حصہ)	پکش	ہستہ (استہ گٹھلی)	استھی
پُر	پورن	ششم	ششٹم	پنجم	پنچم

آپ نے ان بولوں کا ملا جلا ہونا تو دیکھ لیا - اب فارسی اور سنسکرت کے پرانے میل ملاپ کی کچھ اور کڑیاں بھی ساتھ ساتھ دیکھ لیجئے - پرنتو انگریزی اور جرمن بھاشا کے بھی کہیں کہیں سے اکا دکا کچھ بول سنسکرت سے ملتے جلتے ہیں - پر جو بات پرانی فارسی اور سنسکرت کے بولوں کو آمنے سامنے رکھنے پر دکھائی دیتی ہے وہ اور کسی بھاشا میں نہیں - اس سے تاڑنے والے نہ رہ سکے اور یہ کہہ اٹھے -

ایران کے کیانی، زردشتی اور ہند ماتا کے سپوت برہمن، چھتری، ان سب کے پرکھا اور بڑے بوڑھے ایک ہی گھرانے کے تھے جن میں کبھی بڑی گاڑھی چھنتی تھی - ایک ہی جگہ سب کا رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا تھا - پرانی فارسی اور سنسکرت ایک ہی بھاشا تھی - جب آپس میں پھوٹ پڑنے سے یہ الگ ہوئے تو الگ الگ رہنے سہنے سے اس ایک بھاشا میں پہلے تھوڑا، پھر بہت اَل بَل ہوتا گیا - ژند اوستا اور سنسکرت کے بول ایسے ایک سے ہیں - جنہیں نہ جاننے والا سنے تو ایک ہی سمجھے اور دونوں کو ایک ہی بتائے -

پرانی فارسی کو الگ الگ تین نمبروں میں بانٹا جا سکتا ہے - ایک ژند اوستا کی بھاشا - دوسرے پہلوی بھاشا جو ژند کے پیچھے بڑھی اور پھیلی - تیسرے دری بھاشا جو ساسانیوں کے راج میں پھلی پھولی - یہ دری بھاشا ژند اوستا سے بہت الگ اور محمود غزنوی کے راج کی بھاشا سے میل کھاتی ہے - ساسانی راج کی بھاشا اور غزنوی راج کی بھاشا جیسے یہ دونوں ملتی جلتی دکھائی دیتی ہیں - ایسے ہی ژند اوستا اور سنسکرت ہیں یہی دیکھ کے یورپ کے کھوج لگانے والے یہ کہنے لگے - "یونہی سی گھٹ بڑھ سے ویدک گیت اوستا میں اور اوستا کے بول ویدک کے سانچے میں ڈھل سکتے ہیں -

اوستا کا منترا اور ہوما اور وید کا منتھر اور سوما دونوں کے دونوں ایک ہیں - ایسے ہی ژند اوستا کا مترا وہی ہے جو رگوید کا مترا، متھرا ہے رگوید کا اریمن دیوتا، اور ژند اوستا کا ایریمن یہ دونوں بھی ایک ہی ہیں - ایران کی راجدھانی میں پہلے پہلے جن جن کا راج رہا وہ رگوید اور ژند اوستا میں ایک ہی سے ہیں - ژند اوستا کا یما خشائتا (جمشید) رگوید میں یما راجہ ہے، خشائتا مہاراجہ (بادشاہ) کو کہتے ہیں - اسلئے یما خشائتا اور یما راجہ یہ دونوں ایک ہی ہوئے - ژند اور رگوید میں کیکاوس اور کاوبہ اشانس دونوں کی باتیں ایسی ایک سی ہیں جن میں رتی بھر اَل بَل نہیں -

بھینٹ دینے والے اور چڑھاوے چڑھانے والے کو ژند اوستا میں اتروا کہتے ہیں - وید میں اسی اتروا کو اتھروان کہا گیا ہے -

کوتی یہ بول ویدوں میں آنے والی باتوں کے جاننے والوں اور بڑے بھاری بھرکم سمجھ والوں کے لئے بولا گیا ہے - ایران میں بھی بڑے بڑے راج پاٹ والوں کے لئے بھی یہی بول بولا جاتا تھا - جیسے کوی ہسرو (کیخسرو) کوی کوات (کیقباد) ٹوہ لگانے والوں نے تو یہاں تک کھوج لگایا - پوجا پاٹ میں جو بول منہ سے نکلتے تھے وہ ژند اور ویدوں میں کہیں کہیں یونہی سا اَل بَل ہو تو ہو نہیں تو دونوں کے بول ایک ہی سے ہیں -

وید میں سورج کو گھوڑے والا اور دوڑنے والا بتایا گیا ہے - اوستا میں بھی یہی ہے - سورج دیوتا کو وید میں اریامن اور اوستا میں ... ایریامن کہا گیا ہے - یہاں وہاں دونوں جگہ اس دیوتا کے منتر بیاہ کی سبھ گھڑی میں پڑھے جاتے تھے - انگیرا رشی کی پود سے آگ کی پوجا کا پرچار ہندو مانتے ہیں - اوستا میں اس آگ کی پوجا کا پرچار انگرو اور اس کے گھر والوں سے مانا گیا ہے - تریتا کو اوستا میں پہلا بید بتایا ہے - رگوید اور اتھروان وید میں بھی تریتا، تھرتیا، تریتا ہے جو دکھوں سے اچھا کرنے والا دیوتا مانا گیا ہے - اگنی ماتا کو جیسے ہندو گھروں میں رکھتے تھے - ایسے ہی ایرانی بھی - ایرانی آگ پوجنے والوں کے رات دن گانے کے منتر کو گاتا کہتے تھے - ہندوؤں میں بھی گاتا - گائتری منتر کہلاتا ہے - جونسے برس ہندو اپنے لڑکوں کو جنیو پہناتے - ایرانی بھی اسی برس پہناتے تھے -

یہاں ندیوں پر جیسے اشنان کے میلے لگتے ہیں - ایسے ہی ایران میں آب ریز کے تہوار ہوا کرتے تھے - جاڑے آتے جیسے یہاں دیوالی کا تہوار ہوتا ہے ایسے ہی ایرانیوں میں چراغاں کی دھوم دھام ہوا کرتی تھی - ہولی سے اگلے دن یہاں ہندو جو کیا کرتے ہیں یہی سب ایران میں کوسہ برنشین کے تہوار میں کیا جاتا تھا - جس مہینے میں یہاں بسنت کا میلا لگتا ہے - ایران میں بھی اس مہینے جشن گل کوبی منایا جاتا تھا - ان باتوں سے یہی پتا چلتا ہے - پہلے پہل یہاں کے آریہ جب ایرانیوں سے الگ ہوئے تو یہ اور ایرانی ایک ہی دھرم رکھتے تھے - پرانے لکھنے والوں میں سے کچھ نے ایران سے آریوں کے نکلنے کی باتیں یوں لکھی ہیں :-

ان میں کا ایک جتھا دھرم کی باتوں میں کچھ کتر بیونت کرکے دھرم کو بگاڑنا چاہتا تھا - اس سے ایک آگ بھڑک اٹھی اور دھرم کے بچاؤ کے لئے تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے - گھمسان پڑا - لڑائی بھڑائی ہو چکنے پر آپس میں ایسی چھپتم چھپتا ہوئی جو پھر کبھی ایک جگہ مل جل کے نہ بیٹھ سکے - ہارا ہوا جتھا ٹھوکریں کھاتا ادھر آ نکلا اور یہیں رہ پڑا -

۱۷۵۰ء میں پُرانی دھرانی لکھت کے کچھ ٹکڑے کسی پارسی کے ہاتھ سے نکل کے یورپ پہنچے۔ پھر پُرانی لکھت کے کھدے ہوئے کئی ٹکڑے ڈھونڈھنے والوں کو ایرآن سے ملے۔ ان سب کو دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کے بال کی کھال نکالنے والوں نے سوچ بچار سے ان بکھری ہوئی کڑیوں کی لڑیاں بنا دیں۔

ان باتوں کا پھیلاؤ یہاں نہیں سما سکتا۔ اِسی لئے انہیں چھوڑتا ہوں۔ فارسی اور سنسکرت کے کبھی کے میل جول پر جو لکھا گیا وہ اتنا بھی نہیں جتنا ایک بہتی ہوئی ندی سے چلّو بھر پانی۔ پھر بھی آپ نے یہ تو دیکھ ہی لیا ہوگا۔

فارسی اور سنسکرت ایک ہی پیڑ کی ڈالیاں ایک ہی پھلواری کے پھُول ایک ہی سیپی کے موتی اور ایک ہی منہ کی دو آنکھیں ہیں۔ جب ان دونوں کا میل ملاپ آپ دیکھ چکے تو اب فارسی بدیشی بھاشا کہاں رہی یہیں کی ہوئی اور جب یہیں کی ہوئی تو پھر اس کے بولوں کو ٹھکرانا کس لئے۔

فارسی اور سنسکرت کے ملتے ہوئے پریم کی کہانی میں آریوں کے باہر سے یہاں آنے کی بات چھڑ گئی ہے تو یہیں وہ جھگڑا بھی چکا دینا چاہئیے جو نرک جھونک چلی آتی ہے اس میں سب سے بڑھ کر ہندوؤں کی یہ ہنکار ہے۔ ہند ہمارا دیس اور ہمارا ہی جنم بھوم ہے۔ دیس کا جھولا ہمارے ہی لئے ہے۔ اور ہمیں اس میں جھُولتے رہیں گے۔ پہلے سے ہمیں یہاں کے رہنے والے ہیں۔ باہر سے آنے والے جو ساتھ رہ پڑے یہ کبھی یہاں کے نہیں بن سکتے۔ دیس کے اکلوتے سپوت ہمیں ہیں اور رہیں گے یہ دیس کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا۔

گونڈ، بھیل، لمباڑے یہ بات کہیں تو سچ یہ ہے انہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا اور ہے بھی یہی۔ انہیں گونڈ، بھیل، لمباڑوں کی یہ جگہ جنم بھوم ہے اور انہیں کے جیتے دیس والے ہیں جو ننگے دھڑنگے پہاڑوں، بنوں، جنگلوں میں مارے مارے پڑے پھر رہے ہیں۔ انہیں چھوڑ کے دیکھئے تو پھر کوئی دیس والا ہی نہیں رہتا۔ آگے پیچھے سب باہر ہی سے آئے ہوئے ہیں۔ کیسی ہی پُرانی سی پُرانی لکھت اُٹھا کے کیوں نہ دیکھئے یہی پتہ ملے گا آریہ پہلے سے یہاں کے رہنے والے نہیں۔ یہ باہر ہی سے آئے اور یہاں رہ پڑے۔ جیسے آریہ باہر سے یہاں آ گئے ویسے ہی مسلمان بھی آ دھمکے۔ دونوں کے یہاں آنے میں بھی بڑا بل تھا۔

آریہ جو آئے تو آتے ہی اپنی دھاک بٹھانے کے لئے انہوں نے یہاں کے بسنے والوں کا مار مار کے ایسا کچومر نکالا جو گیگلے دیس والے یہاں کا رہنا سہنا چھوڑ چھاڑ بھاگ بھوگ کر اندھیری گھاٹیوں میں منہ چھُپا کے بیٹھ رہے اور جو نہ بھاگ سکے شودر کہلائے۔ یہ اور ان کی پود، داس بن کے باہر والوں کی سیوا کرتی رہی۔ گھر بنانا، چھپر چھانا، گھر کی جھاڑا پونچھ، کوڑا کرکٹ اُٹھا اُٹھا کے پھینکنا، چکیاں پیسنا، برتن باسن مانجھنا، لکڑیاں چیرنا، گائے بھینسوں کو چرانا، گوبر اٹھانا، اُپلے تھاپنا۔ انہی دھندوں میں ان دیس والوں کے دن رات کٹتے تھے۔ یونہی سی بھُول چوک پہ ان کی وہ درگت بنتی جس کے دھیان سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر یہ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ مندروں میں آنا جانا کیسا۔ ان کی پرچھائیں سے پوجا پاٹ کی سُتھری جگہ پاپ کی کیچڑ میں لتھڑ جاتی تو ایسے ملچھ وہاں کیسے پھٹک سکتے تھے۔

یہ ادھم دیکھ کے سنسار نے کروٹ لی۔ وہ ڈری ہوئی بھیڑیں جو آئے دن مار دھاڑ سے چُپ چاپ رہتی تھیں اب سب کی سب مل کے چیخ اُٹھیں ایسے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اب آنکھیں کھُلیں اور انہیں چُمکار چُمکار کے روکا تھاما جا رہا ہے اور ان کے اپنے سے الگ نہ ہونے کے لئے سینکڑوں جتن کئے جا رہے ہیں اور یہ جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے ان کے لئے نہیں۔ یہ بھی سب اپنے ہی لئے ہے۔ ڈر یہ لگا ہوا ہے کہ کہیں یہ پورا ریوڑ کا ریوڑ کسی اور گلے میں جا کے نہ مل جائے۔ اور اس کے ملنے سے دوسرے اپنی بُہتات کے گھمنڈ پر آگے بڑھ جائیں اور ہمیں چُپ بیٹھنا پڑے۔

رہے مسلمان تو وہ یہاں ایسے آئے جیسے کوئی اپنے گھر آتا ہے۔ کسی نے انہیں دیکھ کے ٹیڑھی ٹوپی کی تراج نے ڈانٹ ڈپٹ دیا۔ نہیں تو یہاں والوں کو مسلمان اپنے راج کی جگمگاتی سبھا میں ساتھ بٹھلاتے رہے۔ بآبر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں۔ ان میں اکبر کا پوچھنا ہی کیا۔ یہ تو اوتار ہی مان لیا گیا۔ اوروں کو بھی ہندو اچھا ہی جانتے ہیں۔ بُرا نہیں کہتے۔ اس لئے ان کی باتیں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ ان سب میں سے ایک اورنگ زیب ہی ایسا ہے جسے دھرم کا کٹر، بس کی گانٹھ، ہندوؤں کو دُکھ دینے والا، اور نجانے کیا کیا اسے ہندو کہا کرتے ہیں۔

یہی اورنگ زیب جو ہندوؤں کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا تھا جب دکھن کا گورنر تھا تو ہندوؤں کو آگے بڑھانے، انہیں جنجال سے چھُڑانے کے لئے اس نے کیا کیا کیا۔ یہ کہانی سر جدو ناتھ سرکار کے منہ سے سُننے کی ہے۔ دھرم کا کٹر اورنگ زیب، شاہجہاں کو ہندوؤں کے لئے ایسے ایسے ڈھب سے لکھتا تھا جو کبھی کبھی شاہجہاں کی نیوندی

پرتل پڑ جاتے تھے۔ اس پر بھی اُس نے ہندوؤں کا ساتھ دینا نہ چھوڑا۔ اور اُن کی جو باتیں اُسے سچی دکھائی دیں۔ شاہجہاں کے سامنے ان کے کہنے سے نہ چوکتا تھا۔

ویرگدھ کا راجہ کیسری سنگھ، راؤ کرن راجپوت، مہیش داس راٹھور، نرسنگھ داس، حیات سنگھ، سارنگدھر، اندرمن، یہ اور ایسے ہی اور ہندوؤں کو سکھ، چین سے بٹھانے کے لئے اورنگ زیب اپنے سے جتن کرتا رہا۔

یہ باتیں تو جب کی ہیں جب یہ کنور تھا اور اُس نے اپنے راج میں ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا انہیں کیسی کیسی جگہیں دیں۔ ان کی بڑی سے بڑی بھول اور بھاری سے بھاری چوک کو بھی کیسا ٹالا۔ اس کے لئے پیچھے ہٹ کے یہ دیکھنا چاہیئے:۔

کھجوا کی لڑائی میں جسونت سنگھ نے دارا شکوہ سے مل کے اورنگ زیب کو نیچا دکھانا چاہا۔ ایسے ہی اجمیر کی لڑائی میں کنور رام سنگھ سے بڑی بھاری چوک ہوئی۔ کوئی اور راج ہوتا تو انہیں پاپی ٹھہرا کے ان کے ایسے کرتوت سے نہ جانے اُن کی کیا درگت بنا دیتا۔ پر اورنگ زیب نے نہ جب اور نہ لڑائیاں جیتنے پر کسی سے بھی کچھ پوچھ گچھ نہ کی اور جو کچھ ہو چکا تھا اُسے ایسا کر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

دھیراج راجہ جے سنگھ، بیجے سنگھ، راجہ دیبی سنگھ بندیلہ، لُو دلیپ سنگھ بندیلہ، رائے سنگھ راٹھور، راجہ راج روپ، رائے رایان راجہ رگھناتھ داس، رام سنگھ ہاڑا، راجہ رام سنگھ کچھواہا۔۔۔ رگھناتھ سنگھ سیسودیہ۔ یہ اور ایسے اور بہت سے ہندو نکلیں گے جو اورنگ زیب ہی کی دیا سے پھولے اور پروان چڑھے۔ ان باتوں کے پھیلاؤ کے لئے نہ یہ جگہ ہے اور نہ یہ ڈھائی بولوں میں سما سکتی ہیں۔

تو آپ نے دیکھا باہر سے آنے میں مسلمان اور ہندو دونوں کے دونوں ایک سے ہیں۔ بل اتنا ہی ہے۔ آریوں نے پہلے آ کے ہند میں چھاؤنی چھائی اور مسلمان آریوں کے پیچھے آگے۔ پیچھے آگے کا اُلٹ پلٹ ایسا ہی ہوا کرتا جو پہلے آنے والے جس جگہ آ کے ٹھہریں اسے اپنا تو جنم بھوم سمجھیں اور اپنے پیچھے آنے والوں کو باہر والا ہی سمجھتے رہیں۔

یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کسی جگہ آگے پیچھے دو جتھے باہر سے آ کے ٹھہریں اور پھر وہیں رہ پڑیں۔ ان دونوں میں سے پہلے آنے والا جتھا اپنے پیچھے آنے والوں سے یہی کہتا رہے یہ جگہ ہماری ہی ہے تم ساتھ رہنے سہنے پر بھی کبھی یہاں کے نہیں بن سکتے اور نہ یہ جگہ کبھی تمہاری ہو سکتی ہے تو اس اڑنے اور ہٹ کرنے کو سمجھ والے بالک ہٹ کہیں گے۔ بات کا بتنگڑ بنانا کوئی اچھی بات نہیں مسلمان ہند جو بھی یہاں آ آ کے رہ پڑے، ہند اب ان سب کا جنم بھوم ہے اور رہے گا۔ مُنہ سے کہہ دینے سے یہ کسی ایک جتھے کا دیس کبھی نہیں بن سکتا۔

دیس کے باہر اب بھی ایک چھوڑ کئی کئی راجدھانیاں مسلمانوں کی ہیں۔ پر ان میں سے کسی میں بھی یہاں کے مسلمانوں کے لئے چوتڑ ٹیکنے کی بھی جگہ نہیں۔ جیسے ہندوؤں کا باہر کوئی ٹھکانا نہیں ہے ایسے ہی یہاں کے مسلمان بھی ہیں۔ جن کا رہنا سہنا اٹھنا بیٹھنا، مرنا جینا جو ہے وہ سب یہیں تو پھر اب یہ باہر والے کیسے ہو سکتے ہیں۔

یہ سچ ہے مسلمان ہندوؤں سے تھوڑے اور بہت تھوڑے۔ پر جب اُن کے دُکھ، سُکھ، مرنے جینے کی بات بیچ میں آ پڑے تو پھر تھوڑے سے تھوڑے بھی نہیں رہتے۔ آٹھ کروڑ ٹڈی دل کبھی ایسا نہ بن سکے گا جس کا ہونا ایک سا ہو کے رہ جائے۔ سانس لینے والا اتنا بڑا جتھا مٹی کا تھوا تو بننے سے رہا۔ اس میں کھدوؤں کی سی من مانی توڑ پھوڑ کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس کا یہاں رہنا سہنا کیچڑ کا سا دھبہ نہیں ہے۔ جسے جب چاہا دوڑ دھوپ کے پانی سے دھو دھلا کے چھڑا ڈالا۔

مہاتما جی! پرماتما کے لئے دیس والوں سے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اڑنا، ہٹ کرنا چھڑائیے۔ تیری چھوٹی میری موٹی ایسی بے تُکی اُلجھی ہوئی تانیں کب تک۔

دیکھئے اسی آپس کی جھٹک پٹک، تن پھن سے دیس اب تک کتنے ٹوٹے میں رہا۔ آپ میں بھلائی اچھائی کی جو جو باتیں ہیں اُنہیں بھگوان کی دیا سمجھ کے آگے بڑھئے اور جگت گرو بنئے۔ یہ ایک جتھے کا لیڈر بننا کیسا۔ آپ کو تو پورے دیس کا گرو بننا چاہیئے۔ سچ ہے یہ بات ایسی نہیں کہ جس میں نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور بیٹھے بیٹھے سب کچھ ہو جائے۔ پر آپ تو پاؤں توڑ کے بیٹھنا نہیں چاہتے۔ آپ تو پتا مار چکے ہیں۔ کٹھن سے کٹھن باتیں ہم جیسوں کے سٹ پٹا جانے کے لئے بہت سہی پر آپ کے سامنے تو یہ کچھ بھی نہیں۔ آپ تو دیس ہی کے سدھارنے کی ادھیڑ بن میں رہے اور رہیں۔ تو دیس والوں کو بھی ایسا بنا دیجئے جو آپ کی دیکھا دیکھی یہ سب بھی دیس کے بردگی بن جائیں اور

جو یہ اب تک آگ لگا کے پانی کو دوڑتے رہے ہیں۔ ایسی اندھا دُھند دوڑ دُھوپ سے اُکتا کر آپ کے ساتھ ساتھ اُس چوڑی سڑک پر چلنے لگیں جو پریم نگر پہنچا دیتی ہے۔ ان کے من کی انگیٹھیوں میں پریم کی دبی ہوئی چنگاریوں کو کُرید کُرید کر منتروں کے پنکھے سے دھونک دھونک کے ایسی بھڑکتی ہوئی آگ بنا دیجئے جو کھُول چُوک کے پانی کے چھینٹوں سے بھی نہ کبھی بجھے اور نہ کبھی کمھلائے۔

مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی، پرماتما نے ان سبھوں کو ایک سا ڈیل ڈول، ہاتھ پاؤں، آنکھیں، ناک کان دئے ہیں جیسے اس دین میں سب کو ایک سا رکھا وہ چاہتا تو کیا بڑی بات تھی جو سارے جگ میں ایک ہی دھرم، پرچار کا ڈنکا بجتا ہے۔ ایک ہی دھرم کے مندر میں سب مِل جُل کے ایک ہی ڈھب پہ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ پر بھگوان نے ایسا نہیں کیا۔ کسی نے اسے ایک ڈھب پہ پوجا۔ دوسرے نے اُس کے پوجنے کا اور ڈھنگ نکالا۔ تیسرے نے کسی اور ڈھب سے اس سے لو لگائی۔ سب دھرموں کو دیکھئے تو یہ سب کے سب چھوٹی بڑی الگ الگ سڑکیں ہیں جو اُسی ایک کے پاس پہنچانے کے لئے کھُلی ہوئی ہیں۔ جس کے راج کا پھیلاؤ چھوٹے بڑے لاکھوں کروڑوں اَن گِنت سنساروں سے بھی آگے بنجانے کہاں تک یوں ہی گھیرے ہوئے ہے۔ ایسے سنسار اُسے نہ مانیں اور اس کے پوجنے کا دھاگا سب مل کر توڑ تاڑ کے رکھ دیں جب بھی اس کے امٹ راج میں سے ایک رتی بھی کبھی گھٹ نہیں سکتی۔ ایسے ہی انہیں جگمگاتے سنساروں کے رہنے والے کیسی ہی بڑھ چڑھ کے اس کی پوجا پاٹ کیوں نہ کریں پہ اس سے اس کا راج رتی بھر بڑھ نہیں سکتا۔

دھرموں کے ماننے نہ ماننے کی بھلائی بُرائی جو بھی ہے وہ دھرم والوں ہی کے لئے ہے۔ وہ ماں باپ سے بڑھ کے پیار کرنے والا پرماتما ان باتوں سے ایسا الگ تھلگ ہے جو یہاں کے دُکھ سُکھ کی دھوپ چھاؤں اس پر پڑ نہیں سکتی۔ اس کے نہ ملنے والے راج کی چوکھٹ اتنی اونچی ہے جو یہ سنسار اپنے پہاڑوں کے ہاتھوں سے بھی اُسے چھُو نہیں سکتے۔ ہمارے دھیان کا پھیلاؤ اور پھُرتی جس کے سامنے بجلی کا چھلاوا بھی پانی بھرتا ہے اور جو گھڑی بھر میں اونچی سے اونچی جگہ کو روند کے اُس کی اونچائی ناپ توپ کے رکھ دیتا ہے۔ وہاں تک پہنچتے ہیں یہ بھی اپاہج ہے۔ رات دن سے گھرے ہوئے سنسار اُس کے راج کے پھیلاؤ کو کبھی نہیں پا سکتے۔

جب سب کے سب اُسی ایک کو اپنے اپنے من کی ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ اپنے اپنے ڈھنگ پر اُسی کے آگے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں اور اُسی کے دھیان میں دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ تو الگ الگ دھرم ہونے پر دھرم کے لئے آپس میں یہ ارے ترے کرنا کیسا دھرم الگ الگ ہوا کریں اس سے کیا ہوتا ہے۔ جو دھرم ہے وہ اپنی جگہ اچھا۔ کسی کو کبھول کر بھی یہ نہ چاہیئے جو اپنے دھرم کو اچھا اور دوسرے دھرم کو بُرا کہے۔ بُرا کہنا کس لئے۔ ایک کے دھرم کی پوچھ گچھ دوسرے سے تو ہونے سے رہی۔ جو جس کا دھرم ہے اس کا بوجھ اُسی کے کاندھوں پر ہے۔ اس کے پیچھے آئے دن آپس میں لڑنا جھگڑنا بڑی بُری بات ہے۔

مسلمان اور ہندوؤں کا ایک دن دو دن کا تو ساتھ نہیں۔ پہلے بھی یہی مسلمان تھے اور یہی ہندو، یہی مسجدیں تھیں اور یہی مندر، یہی دُکھ کا اندھیرا تھا اور یہی سُکھ کا اُجالا۔ یہی سنہری دن تھے اور یہی روپہلی راتیں باجا گاجا مسجدوں کے سامنے بجتا تھا اور مندروں کے بھی۔ اس پہ نہ کبھی مسجد والے بھڑکے اور نہ کبھی مندر کے پجاری بڑبڑائے۔ آپس میں مِل جُل کے رہتے اور جس سے جتنی جان پہچان ہو جاتی مرتے مرتے اُسے نباہتے اور اس میں کچھ بل نہ آنے دیتے تھے۔ بڑے بوڑھوں سے ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ کی جو کہانیاں کان سُن چکے ہیں وہ اب ساری کی ساری من گھڑت اور نرٹل دکھائی دینے لگیں۔

آج کل کے ہندو، مسلمان تو ایسے ہو گئے جیسے توے سے روٹی اُلٹ جاتی ہے۔ بات بات میں آپے سے باہر۔ یونہی سی کچھ بات ہوئی اور بھڑک اُٹھے۔ پھر کیا تھا۔ چیخم چاخ بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی جو یہ آپس میں گُتھ گئے۔ سمجھ والے اجڈوں کی گتھم گتھا الگ تھلگ ہو کے دیکھنے لگے۔ آپس کی لاگ ڈانٹ کی آگ بجھانے کا دھیان کسی کو بھی نہیں۔

یہ سُنتے سُنتے کان جھنّانے لگے۔ آج یہاں جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا، کل وہاں لاٹھی چلی۔ پرسوں اُس جگہ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ سینکڑوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے، لہو لہان ہوئے، بیسیوں مارے گئے۔ جب لڑتے لڑتے دونوں تھک کے ہانپنے لگے تو راج نے پکڑ دھکڑ کے جیل میں ٹال کے بیچ بچاؤ کر دیا۔ پٹے پٹائے الگ۔ چھوٹنے کی دوڑ دھوپ میں جو کچھ انٹی میں تھا وہ ہاتھ سے الگ نکل گیا۔ جن دھندوں

سے چار پیسے ہاتھ میں آرہے تھے وہ دھندے الگ چھٹے اور گانٹھ میں ایک جھنجی کوڑی بھی نہ رہی۔ بیٹھے بٹھائے جو اکڑ تکڑ کا دھیان آگیا تھا اُس کا یہ پھل مل گیا۔ چلئے چھٹی ہوئی۔

یہ آئے دن کی جھڑپ، بات بات میں ٹرٹرپس، گھڑی گھڑی کا ٹرّاپن۔ دیس والوں کی ایسی سمجھ پر تیل ماش اُتاریئے اور جیسے بنے انہیں ٹھیٹھ پن سے روکئے۔ یہ سمجھ کے ہیٹے کانوں کے کچے آپس میں کٹتے چلے جاتے ہیں اور ان کی جھپٹ میں دیس کا ستیاناس ہوتا جا رہا ہے۔ آپس کی نوچ کھسوٹ اور لوٹم لاٹ نے دیس کے لنگوٹی بندھوا دی۔ مہاتما جی۔ آپ کے سامنے ایسی باتیں کرنا سورج کو دیا دکھانا ہے۔ پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کبھی بڑے بڑے سمجھ والوں سے بھی سامنے کی باتیں دیکھنے سے رہ جاتی ہیں۔

اب پھر اسی بھاشا کو لیجئے۔ کٹھن باتیں چھوڑ کے نئی بھاشا بنانے کے جنجال میں پھنسنا اور منجھی منجھائی بھاشا کو ٹھکرا کے منہ پھیر لینا یہ کچھ نئی بات ہے۔ میں مانتا ہوں دیس کے کچھ ٹکڑوں کی بولیاں ایسی الگ الگ ہیں جو ایک دوسرے سے نہیں ملتیں اور ایک ٹکڑے کی بولی بولنے والا دوسرے کی بولی نہیں سمجھتا۔ پر یہ سب کی سب بولیاں ایسی چھوٹی سی ہیں جو دیس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں ہی میں بولی جاتی ہیں۔ باہر انہیں کوئی جانتا بھی نہیں ان سب میں اکیلی اردو ہی ایسی ہے جو سارے دیس میں تھوڑی بہت بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دیس کی پوری بولیوں میں سے ایک اردو ہی کا ایسا پھیلاؤ ہے جو ٹھیکم ٹھیک پورے دیس کی بھاشا بننے کا بل بوتا رکھتا ہے۔

کسی بھاشا میں باہر والی بولیوں کے بولوں کی بہتات سی بہتات جتنی بھی ہو پرکھنے والے اُسے تو بھاشا کی بڑھوتری سمجھتے ہیں اور آپ سجانے کیا چاہتے ہیں جو عربی، فارسی بول اردو میں دیکھ نہیں سکتے اور یہ بھی کیوں آپ کو بُرے لگتے ہیں۔ کیا آپ کوئی بھی ایسی آگے بڑھنے والی بھاشا دکھا سکیں گے جو باہر کی بولیوں کو ٹھکرا کے اپنے ہی گنے چنے ڈھائی بول لئے بیٹھی رہی ہو۔ اور انہیں کے سہارے آگے بڑھ کے یہ ٹٹ پونجیا بھاشا ایسی پھلی پھولی ہو جو دوسری بڑھنے اور پھیلنے والی بولیوں کے لگ بھگ کہی جا سکے عربی فارسی بولوں کے نکال ڈالنے سے اردو کی بڑی لمبی چوڑی انگنائی گھٹ گھٹا کے بالشت بھر رہ جائے گی۔ یہ سچ ہے ہندوؤں کو چوڑی چکلی انگنائیاں اچھی نہیں لگتیں اور اسی لئے وہ اپنے اپنے گھروں کی انگنائی چھوٹی چھوٹی سی رکھا کرتے ہیں۔ پر یہ گھر اور بھاشا کا گھر دونوں کے دونوں تو ایک سے نہیں ہو سکتے۔ جس بھاشا کی بڑھوتری دن دونی رات چوگنی ہو اور جس کی دوڑ پھیلاؤ سے پھیلاؤ کو بھی روندتی چلی جا رہی ہو اُسے آپ ٹھکرانا چاہتے ہیں۔ اسے تو کلیجے سے لگائے رکھئے۔

آپ سے یہ تو کوئی نہیں کہتا۔ عربی فارسی کے نئے نئے من من بھر کے بھاری سے بھاری بول اردو میں آپ ٹھونستے چلے جائیں۔ جو یہ کہے اُسے سڑی سمجھئے۔ پر ان دونوں بولیوں کے وہ بول جنہیں پڑھے لکھے تو پڑھے لکھے، اَن پڑھ گاؤں والے اور گنوار تک دن رات بولتے چالتے ہیں۔ اہنیں اردو میں سے نکالنے کے جتن کرنا تو ٹھیک نہیں۔

دیکھئے، ہل جوتنے والے جو پَو پھٹتے ہی تاروں کی چھاؤں میں اپنے اپنے دھندوں میں لگے سورج ڈوبنے پہ ستانے کے لئے ٹھہرتے ہیں۔ وہ بھاشا واشا کے کھڑاگ کو کیا جانیں پر یہ اردو کا پھیلاؤ دیکھنے کا ہے جو وہ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے عربی، فارسی کے سینکڑوں بگڑے ہوئے بول کے بول بے جھجک بولتے چالتے ہیں۔

جب آپ گاؤں گاؤں اُچھوتوں کے لئے پھر رہے تھے تو یہ سب کچھ آپ سُن چکے ہوں گے جو اب آپ کو سُنایا جا رہا ہے۔

عربی فارسی کے وہ بگڑے ہوئے بول جو گاؤں والے اور گنوار رات دن بولتے ہیں:-

مرجی (مرضی) ناراج (ناراض)۔ کھپا (خفا) منجور (منظور)۔ تکدیر (تقدیر)۔ جمین (زمین)۔ مہنت (محنت)۔ منائی (منع)۔ کبالہ (قبالہ)۔ کھزانہ (خزانہ)۔ تنکھا (تنخواہ)۔ مجوری (مزدوری)۔ کھون (خون)۔ بے دکھلی (بے دخلی)۔ دستاویج (دستاویز)۔ کاگد (کاغذ)۔ کلم (قلم)۔ کاجی (قاضی)۔ راجی (راضی)۔ کھتا (خطا)۔ جُلم (ظلم)۔ کابل (قابل)۔ کبول (قبول)۔ جکام (زکام)۔ نجلا (نزلہ)۔ کم بکھت (کم بخت)۔ ہاجر (حاضر)۔ کھالی (خالی)۔ کسور (قصور)۔ سجا (سزا)۔ بکھار (بخار)۔ رجا (رضا)۔ پیکمبر (پیغمبر)۔ کھیرات (خیرات)۔ کیامت (قیامت)۔ اجاب (عذاب)۔ ناجک (نازک)۔ سوہرت (شہرت)۔ جلدی (جلدی)۔ ترا ترا (طرح طرح)۔ میجود (موجود)۔ مالوم (معلوم)۔ نکد (نقد)۔ ماملا (معاملہ)۔ گلت (غلط)۔ مدرسا (مدرسہ)۔ لانت (لعنت)۔ رونک (رونق)۔ مولی صاب (مولوی صاحب)۔ ہمیسہ (ہمیشہ)۔ کمجور (کمزور)۔ کھسامد (خوشامد)۔ ریسم (ریشم)۔ جمانت (ضمانت)۔ جامن (ضامن)۔ مکدما (مقدمہ)۔ کھارج (خارج)۔ دسکھت (دستخط)۔ کواب (کباب)۔ سادی (شادی)۔

یہ کچھ بول تو یونہی لکھ دئے ہیں۔ سوچ بچار کیا جائے تو اور ایسے سینکڑوں بول کے بول نکل آئیں گے۔ عربی، فارسی کے بگڑے

ہوئے کچھ بول ابھی آپ نے سُنے اب انہی بولیوں کے وہ بول بھی دیکھ لیجیے جنہیں اَن پڑھ سے اَن پڑھ گاؤں والے اور گنوار جَون کا توں بولتے ہیں۔

جیسے مکان، دُکان، میدان، جان، ران، تکیہ، لتّہ، صورت، بدن، گردن، سینہ، پلک، کمر، آدمی، عورت، بچّہ، اگر، مگر، کتاب، سردی، گرمی، بادام، ادرک، کام، نام، کمان، تیر، لگام، مال، عینک، گلاب، بہار۔

میرا کہنا یہی ہے۔ یہ اور ایسے اور اور عربی، فارسی کے وہ جو اردو میں پورے سما چکے ہیں۔ جنہیں چھوٹے بڑے سب بولتے ہیں انہیں ہاتھ نہ لگائیے۔ ایسے ہی ہندی کے وہ گھُلے ملے بول جو سب کی بات چیت میں چلے آرہے ہیں ان سب کو ملا جُلا کے اردو کو اور آگے بڑھانے کے نئے نئے ڈھب نکالیے۔ ہند جیسے ہندو مسلمان سب کا جنم بھوم ہے ایسے ہی اردو بھی ان میں سے کسی ایک کی بھاشا نہیں۔ یہ بھی ان سب کی بھاشا ہے یہ سب کی بھاشا اس لئے کہہ رہا ہوں، اردو کے آگے بڑھنے اور پنپنے کے لئے مسلمان اور ہندو دونوں ساتھ ساتھ اب تک اپنے اپنے سے جتن کرتے رہے۔

یہ کہہ چکا ہوں، ہند کے چپّے چپّے کی چھوٹی چھوٹی بولیاں ایسی بہت سی ہیں جو دیس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں الگ الگ بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں دیکھیے اور ڈھونڈیے تو عربی، فارسی بول چھپے چھپائے ملیں گے۔ بَس اتنا ہی ہوگا کسی میں بدیسی بولیوں کے بول بہت ہوں گے۔ کسی میں تھوڑے اور کسی میں بہت تھوڑے۔

دیس کی سب بولیوں کے گنتی کے کچھ کچھ بول یہاں لکھے جائیں تو یہ لکھت بڑھ کے سنجانے کہاں تک پہنچے۔ اس لئے وہ سب تو نہیں اک مرہٹی بھاشا کے کچھ بول لکھتا ہوں:-

عربی فارسی بولوں کی ریل پیل مرہٹی میں

ائین (آئین) اکل (عقل) اکھتیار (اختیار) آکھر (آخر)۔ اکھیر (اخیر) سپھائی (صفائی) عجب، اجمت (عظمت)۔ آجماس (آزمائش) آجار (آزار)۔ اجاری (آزاری) اتر (عطر) عدالت، عداوت، امانت (امانت) اپھکرا (ابخرہ) اپھوا (افواہ)۔ اباد (آباد) امباری (عماری) ابھر (ابر) عیب، ارکھ (عرق)، ارج (عرض) الاہیدہ (علیحدہ) اول (اوّل) آتسباجی (آتشبازی) آپ گرجی (خود غرضی) آمیج (آمیز) اواج (آواز) اشک (عشق) آشک (عاشق) اشک باج (عشق باز) اکرار (اقرار) اجّت (عزت) اکھلاس (اخلاص) ایجا (ایذا) اتبار (اعتبار) اتلا (اطلاع) انساپھ (انصاف) انام (انعام) ارادہ، عنایت، امان (ایمان) عادت۔ عالم، انگشتان (انگشتانہ) آلیسان (عالیشان) عبرت، الاکھا (علاقہ) علّت، علاج، عمدہ، عمر، ادا، ادب، امین، امرا، امیدوار، اولاد۔

مرہٹی کی بات چیت پہ ایک بھولی ہوئی بات دھیان میں آئی بہت دن ہوئے جو مرہٹی کے اک اناڑی کھلاڑی سے مٹ بھیڑ ہوئی۔ اس کا اوڑھنا بچھونا جو تھا وہ مرہٹی اور انگریزی، اور کوئی بھاشا وا شا جانتا نہ تھا۔ کچھ لوگ آپس میں کسی بھاشا کے پھیلاؤ پر کچھ کہہ سُن رہے تھے۔ مرہٹی کا بنیا کھلاڑی جو سب سے الگ بیٹھا تھا یہ بات چیت سُن کے نہ رہ سکا۔ اور وہیں سے تڑ سے بولا۔ ہماری بھاشا کا سا پھیلاؤ دیس کی کسی بھاشا میں نہیں۔ چار دن سے اردو بڑھ چلی ہے۔ یہ بھی ہماری بھاشا کے بل پہ، سنجانے مرہٹی نے اردو کی کیسی سیوا کی جو اس کے سینکڑوں بول اردو میں آگئے۔ جنہیں اردو والے اپنے یہاں کا سمجھ رہے ہیں۔ وہ بول کون کون سے ہیں اس پوچھنے پر وہ مُسکرا کے کہنے لگا۔ ایک، دو، سینکڑوں، یہ کہہ کے اوپر لکھے ہوئے بولوں میں سے کئی بول اُس نے سنائے۔ جس پر جاننے والے ہنس پڑے اور وہ ہکّا بکّا ہو کے ایک ایک کا منہ دیکھنے لگا۔ اس میں ہنسی کی کون سی بات ہے اسی پہ اُسے اچنبھا ہوا۔ مظفرپور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے ایک بڑے بھاری بھرکم پنچ نے جو وہاں پڑھ کے سنایا۔ اُس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا یہاں لکھتا ہوں:-

> "ہماری ہندی کے کویوں کی متی گتی بالکل نرالی ہے۔
> وہ کبتا کی گاڑی کے دُھرے اور پہیّے بھی بدل رہے
> ہیں۔ اپنے اُدبُھت جھکڑے میں پیچھے کی اور مریل ٹٹو جوت
> کر گنتوبیتھ پر پہنچایا چاہتے ہیں۔ یہ اتنی نہیں منومکھتا کا لکش
> ہے۔ اس سے کبتا کا سُدھار نہیں سنگھار ہو رہا ہے۔"

کیا ایسی ہی اَن گھڑ بھاشا سارے دیس کی بھاشا بن سکتی ہے۔ کیا ایسی ہی انوکھی بولی پورے دیس میں پھیل سکتی ہے۔ کیا ایسی ہی لکھت کے پرچار پہ آپ اڑے ہوئے ہیں۔ کیا یہی سب جنم بھوم والوں کی اکیلی بھاشا بن سکے گی اور کیا ایسے ہی سب چھوٹے بڑے بول سکیں گے۔ دیکھیے تو یہ کیسا اودھم مچا ہوا ہے۔ عربی فارسی کے گھُلے ملے بول جو سب بولتے چالتے ہیں۔ جان جان کے انہیں چھوڑ چھاڑ اور چھانٹ چھانٹ کو یوں متی گتی، کبتا، ادبھت، گنتوبیتھ، منومکھتا، لکش۔ ان بھوُلے بسرے بولوں کو ٹھونسا گیا ہے۔ باہر والی بولیوں سے کترا کے اور بچ بچا کے نکلنے پہ بھی بدیسی بولوں سے یہ لکھت نہ بچ سکی اور گنتی ہی کے سہی پہ کئی بول اس میں آہی گئے۔ کچھ فلم بنانے والی کمپنیاں بھی اپنے یہاں کے ڈراموں میں ایسی ہی ٹھونس ٹھانس کر رہی ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے دیس کے ماتھے کے لئے کلنگ

کاٹیکا ہے۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اس نئی اپکا کو دیکھ کے نہ رہ سکے اور انہیں یہ کہنا ہی پڑا۔

"یہ زبان کیونکہ کل ملک کی زبان ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے اور کوئی مذاق سلیم اور اردو میں شعور رکھنے والا اردو کو چھوڑ کے اسے کس طرح اختیار کر سکتا ہے۔"

فارسی کے رسیا ہیم سین کائستھ، پٹن کے ایسری داس، پٹیالے کے سبھان رائے، جگجیون داس، کیول رام اگروال، منشی بھوپت رائے، منشی چندربھان، اودے رائے، منشی ٹیک چند بہار، یہ اور ایسے اور اور ہندوؤں کی فارسی لکھتیں دیکھنے کو آپ سے نہیں کہا جاتا۔ پر وہ نئے پرانے اردو لکھنے والے ہندو جنہوں نے اردو کی ایسی سیوا کی جس پر آنا لکھا جاتا ہے جو لکھتے لکھتے اک بڑا ڈھیر لگ جائے۔ ان کی لکھنوں کو تو دیکھ لیجے۔

پنڈت دیا شنکر نسیم۔ پنڈت مہندولال زار، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت نوبت رائے نظر، پنڈت بشن نرائن در، پنڈت برج نرائن چکبست، منشی درگا سہائے سرور، منشی پریم چند۔ سر تیج بہادر سپرو، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، پنڈت امرناتھ جھا، پنڈت گنگا ناتھ جھا، پنڈت آنند نرائن ملا، پنڈت کشن پرشاد کول، پنڈت منوہر لال زتشی، مسٹر رگھوپتی سہائے فراق، مسٹر اقبال ورما سحر، مسٹر رام پرشاد کھوسلا ناشاد، مسٹر کرشن سہائے۔ مسٹر تلوک چند محروم، مہاراج بہادر برق، جودھر مگھت موہن لال رواں، پروفیسر سری رام شرما، مسٹر رام دیال سکسینہ، ٹھاکر جے آر رائے، لالہ روشن لال، مسٹر رام سرن نگم، مسٹر سری نرائن نگم، مسٹر دیا نرائن نگم، مسٹر سورج نرائن مہر، مسٹر سدرشن، مسٹر شیام موہن لال جگر، یہ سب کے سب ہندو اور پکے ہندو اس پر بھی ان کی لکھتوں کا ڈھیر ایسا ہے جس میں کویوں، متی گتی، کبتا، اوبھت گنتو سچھ، منو مکھتا، لکشن، سمپتی، شکتی، رکھیا، نویدن، آشا، وشا، سمبندھ، کلاپ ویاکرن، ہتوں۔ ایسے ایسے بولوں کا پتا بھی نہیں اور ڈھونڈے سے بھی ایسے کڈھب بول ان میں کہیں نہ مل سکیں گے۔

ان ہندوؤں کی لکھت کا وہی ڈھنگ ہے جو مسلمانوں کا۔ دونوں میں بال بھر اَل بَل نہیں۔ اور اَل بَل ہو کیسے جب ہندو مسلمان نے مل جل کے ابتک اردو کو یہاں تک سدھارا جو راج کے بل پر بڑھنے والی بولیوں کے لگ بھگ دکھائی دینے لگی۔ ابتک پہلا سا، نہی۔ اسی اردو کے بولنے چالنے میں ہی تھوڑا بہت جو بھی، ہے تو ابھی، یہی اگا آگے بڑھ کر جب بہت سیدھی ہو گئی تو پورا بھی ہو سکتا ہے اور جو یہ تھوڑا بھی نہ رہا تو پھر رہا کیا۔ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ۔

ہند ماتا کا گہنا پاتا جو بھی تھا ایک ایک کر کے سب کا سب کب کا لٹ لٹا چکا اور آئے دن کی ذبح کھسوٹ اور لوٹم لاٹ نے ایک چھلا بھی نہ چھوڑا۔ لے دے کے یہی اردو ہندو مسلمانوں کے ملاپ کی ایک پرانی انگوٹھی دیس کے ہاتھ میں پڑی رہ گئی تھی۔ آج کل اس کی بھی چھینا جھپٹی ہو رہی ہے اور دیس کی انگلی سے اسے بھی اتارنے کے جتن کئے جا رہے ہیں۔ یہ پرانی انگوٹھی بھی چھن گئی تو پھر کیا ہوگا۔ یہ آپ سوچئے۔

اردو کو مسلمانوں کے دھرم کی بھاشا آپ کہہ چکے ہیں۔ اس لئے یہ ڈر لگتا ہے کہیں اس بات چیت سے آپ یہ نہ سمجھ لیں۔ اپنی بھاشا کی پرچک لے جا رہی ہے۔ اور اس کے بچاؤ کے لئے یہ باتیں بنائی جا رہی ہیں۔ کسی کے دھیان پر کیسے روک ٹوک ہو سکتی ہے۔ جس کا جو جی چاہے سمجھ لے۔ پر سچی بات تو یہ ہے۔ دیس کے لئے یہ باتیں چھیڑنا پڑیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ دیس کے منہ پر کیسی جھریاں پڑتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ کیسا انڈھال ہوتا جا رہا ہے۔ آپا دھاپی کے کیسے جھکڑ چل رہے ہیں۔ ایسا اندھیا ؤ ہے جو آنکھیں کھولنا دوبھر ہو گیا ہے۔ دیس کے اندھیرے گھپ میں بگاڑ کا لمبا تڑنگا بھوت ہاتھ پھیلائے دانت نکالے کھڑا ہنس رہا ہے۔ اس کے... پرچھاویں سے یہاں والے بڑی بن کے آپس میں لڑے مرتے ہیں۔ کوئی بڑا منتر پڑھنے والا ایسا منتر پڑھے اور ٹوٹکا کرے جس سے دیس پر سے یہ بھوت اتر جائے اور بھوت اتر جانے سے یہاں کے ساتھ رہنے سہنے والوں کی ایسی آنکھیں کھلیں جو سب مل ملا کے سانس لینے کے یہ ڈھائی دن آپس میں ہنس بول کے کاٹ دیں۔ بھوت اتارنا ہنسی کھیل نہیں۔ اس کے لئے بڑی پڑھنت پھوک چاہئے جسے آپ ہی کر سکتے ہیں۔

رہی اردو تو اب یہ مٹنے مٹانے کے جوکھوں سے نکل چکی۔ اس کا پودا اب پودا نہیں رہا۔ جو لو کے تھپیڑوں اور ٹھنڈک سے جھلس اور ٹھٹھر کے رہ جائے۔ یہ پودا پیڑ بنا اور بن رہا ہے، اس کی جڑیں آگے تک پھیلیں اور پھیل رہی ہیں۔ اس کی بڑی بڑی ڈالیاں، موٹے موٹے ٹہنے اور ہری بھری ٹہنیوں سے موٹی پتلی اور اور ٹہنیاں نکل نکل کے ان میں نئی نئی کونپلیں پھوٹتی چلی جا رہی ہیں۔

اس کا تو اب کچھ ڈر ہی نہیں۔ اس میں ایک ہی بات دیکھنے کی ہے جس دھندے کو سب اب تک مل جل کے کر رہے تھے۔ اب ان میں پھوٹ پڑنے اور الگ تھلگ ہو جانے سے ایک ہی جتنے کو وہ پورا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ جسے پہلے سب مل ملا کے اٹھا رہے تھے۔ اس

سے بڑھتی ہوئی چال دھیمی پڑ جائے گی اور پہلی سی پھرتی نہیں رہے گی۔ پہلے جو بات دنوں میں پوری ہوتی تھی وہ اب مہینوں پر جا پڑے گی۔ پر مجھے تو یہ دکھائی دیتا ہے پورے ہندو بھی کبھی اپنی اردو کو چھوڑ نہیں سکتے۔ اور اپنے بڑے بوڑھوں کے گاڑھے پسینے سے سینچی ہوئی اس ہری بھری کھیتی سے کبھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔

مہاتما جی۔ دیکھئے تو آپ کی اردو کسی بھاشا سے بھی ہیٹی اور دبتی ہوئی نہیں۔ وہی باتیں وہی گھاتیں ایک ایک کر کے اس میں دیکھ لیجیے تو نئی بھاشا کی جگہ اپنی اسی اردو کو ایسے ہی آگے بڑھائیے نا، جیسے آج تک ہندو مسلمان سب مل جل کے اسے بڑھاتے اور سدھارتے چلے آئے۔

اس کے پرچار کے لئے پہلے ایسی ریڈریں لکھوائی جائیں جن میں عربی، فارسی، ہندی ان سب کے وہی گھلے ملے بول ہوں جنہیں سب بولتے ہیں۔ جیسے عربی، فارسی کے کڈھب بول ان میں جگہ نہ پا سکیں ایسے ہی ہندی کے بھولے بسرے بول بھی ان میں کہیں نہ آنے پائیں۔ اسی بات میں آگے بڑھ کر یہ دیکھ بھال بھی کرنا پڑے گی۔ اردو کے اور پھیلاؤ اور بڑھانے کے لئے کہاں کہاں سے اور کون کون سے بول چنے جائیں۔ یہ گتھی ایسے لوگوں کے اکٹھا کرنے سے سلجھ سکتی ہے۔ جو بھاشا کی بناوٹ، اس کا اُتار چڑھاؤ، لوچ، گھلاوٹ اور بولوں کی ناپ تول ان کا بھدا پن، ہلکا پن، یہ اور ایسی اور اور باتوں کو پرکھ سکتے ہوں۔

جیسی جگہ ہو چن چن کے ویسے ہی بولوں کا وہاں جڑنا اور بٹھانا جانتے ہوں۔ سب لوگ بھاشا کا ست لڑا نہیں بنا سکتے۔ بڑی سی بڑی سبھاؤں سے بھی چھانٹئے گا تو ایسے لوگ کچھ ہی نکلیں گے۔ عربی، فارسی، ہندی ان میں سے نئے بول جب کے بھی ہوں پورے سوچ بچار سے جانچ جانچ کے ان کا چنا اور انہیں اپنی اپنی جگہ ایسا جمانا جو وہ پھر نہ اکھڑ سکیں ایسے ڈھب انہیں لوگوں کو آتے ہیں جو بھاشا کے پورے ہتھکنڈے جانتے ہوں۔ ایسے لوگوں کی دیکھ بھال سے یہ ریڈریں ایسی لکھی جائیں گی جن میں نہ بھاری بھاری عربی، فارسی کے بول ہوں گے اور نہ ہندی کے بھولے بسرے بھد لیسلے بول۔ ان میں نہ مولویوں، ملاؤں کے ان گھڑ بول دکھائی دیں گے اور نہ پنڈتوں کے کٹھن اور کڈھب بول، ان میں نہ ٹھیٹ ملا پن ہوگا اور نہ ٹھیٹ پنڈت پن۔ یہ ریڈریں ٹھیٹ مولویوں اور ٹھیٹ پنڈتوں کی لکھتوں سے الگ ہوں گی۔

ان کے لکھنے کا ڈھب ایسا سمویا ہوا، موتی سا چمکتا، میٹھا پانی ہوگا۔ جس میں بھولے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس کا کوڑا کرکٹ اور گدلا پن کچھ بھی نہ رہ سکے گا اور یہ سوجھ بوجھ بڑھانے والا امرت جل آنکھوں سے پیا جائے گا۔ جس سے من دُھلتے دُھلتے چمک اٹھیں گے اور آنے والی پود پہلے ہی سے یہ پریم جل پی کے سمجھ کی پوری آنکھ کھلنے تک ایسے ستھرے من کی ہو جائے گی جسے پھرتی سے آگے بڑھنے اور دیس کے سنبھالنے میں کوئی رکاوٹ ہی نہ رہے گی۔

پہلے ہی سے عربی، فارسی، ہندی ان سب کے ملواں بول ساتھ ساتھ پڑھنے لکھنے سے پھوٹ ڈالنے والا یہ دھیان کبھی بھولے سے بھی پھر کسی کو نہ آئے گا۔ اس لکھت میں بدیسی بولیوں کے اتنے بول ہیں اور دیسی بولی کے اتنے۔ ان میں سے انہیں چھوڑ کر انہیں چن لینا چاہیئے۔ سب بولوں کے ساتھ ساتھ دیکھتے دیکھتے اور پڑھتے پڑھتے ان سب کا پیار، پریم جی میں جڑ پکڑتا چلا جائے گا اور سب اسی اردو کو اپنی بھاشا سمجھیں گے اور اس کے اور اور بناؤ سنگھار کے لئے سوچ سوچ کے نئے نئے ڈھب نکالتے رہیں گے۔ تو اس جتن سے بھاشا الگ پھلے پھولے گی۔ اور آجکل کی سی چھیڑ چھاڑ جس سے دیس کو گھن لگتا جا رہا ہے یہ بات بھی پھر نہ رہے گی۔ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے اس کہاوت کو سچا کر کے دکھا دیجیے اور جو اوپر لکھا جا چکا ہے اس کا پرچار ایسا کیجیے جس سے گھڑی گھڑی کے جھگڑے ٹنٹے کا سانپ بھی مر کے رہ جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے پائے۔

بھاشا کے لکھنے کا ڈھنگ (Transcription.) کون سا رکھنا چاہیئے یہ بھی ایک بڑی الجھی ہوئی گتھی ہے۔ اس پر بھی یہیں لکھنا چاہتا تھا پر اس لئے چھوڑتا ہوں۔ ایک تو یہ بات کٹھن ہے اور اس کے کٹھن ہونے سے بہت پھیلنا پڑے گا۔ دوسرے یہاں تک جو کچھ لکھا جا چکا ابھی یہ بھی دیکھنا ہے اسے دیکھ لے آپ کہتے کیا ہیں۔ یہ باتیں آپ نے کان دھر کے سن لیں تو پھر کبھی اس پر بھی جو جو باتیں دھیان میں ہیں ایک ایک کر کے سب لکھوں گا۔ اور بتاؤں گا اس کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔

یہاں تک ادھ کٹے بولوں میں جو بھی کہا جا چکا ٹھنڈے جی سے اسے آپ نے سنا اور سوچ بچار کی آنکھوں سے دیکھا تو سمجھوں گا یہ لکھت ٹھکانے لگی اور جو یونہی دیکھ دکھا کے ٹال دیا تو بات آئی گئی ہوئی۔ اچھا، چلتے چلتے یہ ایک بات اور سن لیجیے:-

اب تک میں نے جو بھی کہا اسے آپ نہیں سنتے اور نہیں مانتے۔ نہ سنئے اور نہ مانئے۔ عربی، فارسی بولوں کو آپ ہاتھ لگانا نہیں چاہتے۔ نہ لگائیے۔ ان بدیسی بولیوں کے بول آپ نہیں دیکھ سکتے۔ نہ سہی۔ اچھا ٹھیٹ اردو لکھنے

کا یہی ڈھب جو آپ کے سامنے ہے اسی کو برتیئے اور اسی کا پرچار کیجیے۔ عربی، فارسی بول جن سے آپ کو چڑ ہے، دیکھ لیجیے اس میں ان کا پتا بھی نہیں تو پھر کو تیں، مت گنتی، کبنا، اُوبھت، گنتو بیتو، منو مکھتا، لکشن، کرتویہ، ستاپنیہ، سوبھاؤ، سمجھے، جیون، آشا، دشا، شکتی، شکشا، سمبندھ، انیکتا، ہیتوں، ابھیاس، وشے، شبد، رکھپا، نیشچئے، کلاہل، دیاکرن، اودے، راج نیتی، ایسے ایسے بھولے لبرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس سے نئی بولی بنانے کی کھکیڑیں اُٹھانے سے کیا یہ اچھا نہیں جو آپ اسی ٹھیٹ اردو لکھت کے پرچار کی ہامی بھریں اور اسی کو پھیلائیں اسی کو آگے بڑھائیں۔

آپ سے باتیں کرنا تھیں اور آپ کو بدیسی بولیوں سے چڑ ہے تو پھر لکھنے کا یہ ڈھب نہ رکھتا تو کیا کرتا۔ عربی، فارسی، ہندی بولوں کو سمو کے لکھتا جیسے لکھا کرتا ہوں تو اُس کے دو بول بھی آپ نہ دیکھتے۔

اسے دیکھ چکنے پر جو سچی بات آپ کو دکھائی دے وہ آپ لکھ بھیجیں پرماتما کرے آپ انند ہوں۔

سید ابوالقاسم

حدیثِ حیات

ہوئی ہے منزلِ عنقا میں یوں گم داستاں میری
کہ مجھ کو ڈھونڈتی پھرتی ہے عمرِ جاوداں میری

ہے ذرّہ ذرّہ عالم کا زبانِ بے زباں میری
کہ ہے کل کائنات اک مختصر سی داستاں میری

فنا ہو یا بقا ہر دم ہیں دونوں ہمعناں میری
حیاتِ جاوداں میری ہے مرگِ ناگہاں میری

یونہی لے سنگِ در ہوتی ہے تکمیلِ نیاز اکثر
مرے سجدوں کی زینت ہے جبینِ خونفشاں میری

لڑایا تھا نگاہوں کو کبھی برقِ تجلّی سے
زبانِ طور خود دہرا رہی ہے داستاں میری

کبھی زنداں میں زنجیروں سے جا کر کھیلتا تھا میں
کبھی قیمت عزیزِ مصر پر بھی تھی گراں میری

کبھی بمہدِ طفولیت میں اِک رُوحِ مجسّم تھی
کبھی غارِ حرا میں تھی تجلّی ضوفشاں میری

مری عظمت مری رفعت مسلّم ہے زمانے میں
حقیقت ہے الم مہرِ نبوّت سے عیاں میری

محمد اسحاق الم

غزل

سونی پڑی ہے محفل سنسان ہیں فضائیں
ساقی کسے پلائیں مطرب کسے سنائیں

جن کی لطافتوں میں گم تھی مری جوانی
راتوں کی خامشی میں سنتا ہوں وہ صدائیں

جی بھر کے دیکھ لیتا بیمار دردِ ہجراں
اے کاش جانے والے اِکبار لوٹ آئیں

دل کی ہر اک تمنا کروٹ بدل رہی ہو
محشر بپا نہ کر دیں ساقی تری ادائیں

توبہ کی اوٹ میں وہ ایمان لڑکھڑایا
چلنے لگیں ہوائیں چھانے لگیں گھٹائیں

اس دکھ بھرے جہاں میں کوئی نہیں کسی کا
برباد ہو رہا ہوں اب آپ ہی بچائیں

زاہد گناہ میں بھی تھا ذوقِ پارسائی
اب بخشوا رہی ہیں مجھ کو مری خطائیں

تاروں کے نوچنے کا اک روز حکم دیجے
اِک روز آپ میرے دعوے کو آزمائیں

میں جانتا ہوں اُن کی فطرت ہے بے نیازی
کرتا رہوں گا لیکن بے خوف التجائیں

اب تک جگر میں کوئی کانٹا سا چبھ رہا ہو
اب تک بھٹک رہی ہیں شاید مری دعائیں

اے دوست آ کہ ہم تم اک آسماں تراشیں
اے دوست آ کہ ہم تم دنیا نئی بسائیں

اے کاش کوئی آ کر ان کو سہارا دیتا
برباد ہو رہی ہیں برباد کی وفائیں

احمد ندیم قاسمی

سینما

ہندوستان کے فلم ڈائرکٹر

انسان کے جسم میں مختلف اعضا و جوارح ہیں اور ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک خصوصیت کا مالک ہے۔ ایک کا فرض دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔ لیکن قلب تمام اعضائے جسم اور جوارح بدن پر آمرانہ اختیار رکھتا ہے، جسم کا کوئی عضو قلب کی سلطنت و فرمانروائی سے آزاد نہیں، کائنات فلم میں یہی حیثیت فلم ڈائرکٹر کی ہے۔

ایک نگارخانہ مختلف اہلِ فن پر مشتمل ہوتا ہے اور وہ سب ارکان و عناصر کا حکم رکھتے ہیں۔ لیکن ڈائرکٹر ان پر آمر اور فرمانروا ہوتا ہے۔ اداکار، عکاس، صدابند، غرض نگارخانہ کا ایک ایک کارپرداز بلکہ ایک ایک شے ڈائرکٹر کے اختیار و تصرف میں ہوتی ہے۔

اپنے ہمہ گیر فرائض و اختیارات کے اعتبار سے صنعت فلمسازی میں ڈائرکٹر جامع حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔ اسے صنعتِ فلمسازی میں کامل دستگاہ ہوتی ہے، وہ باعتبار معلومات ہر شعبہ نگارستان پر حاوی ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک کامل ڈائرکٹر تہذیب و تمدن اور ادب و تاریخ میں بھی بصیرت و درخور رکھتا ہے۔ ڈائرکٹر کی ہستی غیر معمولی ہستی ہوتی ہے۔

ایک ماہرِ فن ڈائرکٹر جو اپنے فرائض سے کامل علم و خبر رکھتا ہو، جو صنعت فلمسازی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو، جس کی نگاہ مدبر اور مذاق بلند ہو وہ معمولی افسانے میں بھی جان ڈال سکتا ہے۔ وہ دقیقہ سنجی اور نکتہ آفرینی سے معمولی اداکار کو بھی سپہرِ فلم کا درخشندہ ستارہ بنا سکتا ہے۔

اس کے برعکس اگر ڈائرکٹر کامل الفن نہ ہو، قسمت کی یاوری یا مالکان فلم کی جہالت سے ڈائرکٹر بن گیا ہو، نہ اسے فن فلمسازی میں درک و مہارت حاصل ہو نہ رفعتِ ذوق و وسعت نظر سے بہرہ مند ہو، نہ تہذیب و معاشرت اور تاریخ و تمدن سے علم و واقفیت رکھتا ہو تو ایسا ڈائرکٹر قدم قدم پر ٹھوکر کھائے گا، بات بات میں غلطی کرے گا۔ اور اپنے ساتھ فن کی رسوائی کا بھی سبب ہوگا۔

جو لوگ محض عامیانہ مذاق کے زیر اثر سینما نہیں دیکھتے بلکہ تصاویر کے معائب و محاسن پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ جن کی معلومات میں وسعت اور دماغ میں حقیقت فہمی کی صلاحیت ہے ان کی تنقیدات و تبصرات کو ملاحظہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک ڈائرکٹر کی قابلیت یا عدم قابلیت سے ایک فلم کس طرح بلند یا پست ہو جاتی ہے۔ ایک معمولی اداکار کس طرح کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور ایک لائق اداکار کس طرح ناکامیابی کے غار میں گر پڑتا ہے۔

مثال کے طور پر راجکماری کو لیجئے۔ "انصاف کی توپ" میں اسے قابل ڈائرکٹر سے واسطہ نہیں پڑا۔ اس لئے وہ اس فلم میں ناکام رہی، لیکن "دیوداس" میں اسے اچھا ڈائرکٹر مل گیا اس لئے وہ چمک گئی۔ اس کے بعد کروڑپتی اور پجارن میں اسے اور بھی کامیابی ہوئی، مدگاباتی کھوٹے کو دیکھئے "پتت پاون" میں اسے اچھا ڈائرکٹر نہیں ملا، لہٰذا وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئی، لیکن "راج رانی میرا" اور "سیتا" میں اچھے ڈائرکشن کی وجہ سے صفِ اول کی اسٹاروں میں اس کا شمار ہو گیا۔

ڈائرکٹروں کے اغلاط کی بعض نمایاں مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ڈائرکٹر کو کتنا حاضر دماغ اور وسیع النظر ہونا چاہیئے، ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کی "سیتا" میں رام چندر مہاراج کے دو بچوں کے بھی واقعات ہیں۔ ڈائرکٹر نے ان کے پارٹ مدحیم و شمیم جوانوں سے کرائے ہیں۔ خیال فرمایئے کس قدر مضحکہ خیز بات ہے؟

"عورت کے پیار" میں فریدہ ایک دوشیزہ عورت ہے۔ اس کی جگہ ڈائرکٹر نے ۳۵ سال کی مس مختار کو پیش کیا، ایک ریسمی مس حقیقی معنوں میں تو دوشیزہ ہو نہیں سکتی۔ اس لئے اس کا بعید از اصلیت پارٹ ایک ذوقِ سلیم میں تکدر پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ "آنکھ کا نشہ" میں نائکہ کا کام ایک جوان ایکٹرس کرتی ہے۔ ڈائرکٹر نے غالباً صرف یہ

لحاظ رکھا کہ جوان ایکٹرس کے پارٹ سے فلم بیں محظوظ ہوں گے، اگر کسی سن رسیدہ عورت سے یہ پارٹ کرایا گیا تو فلم کی جاذبیت میں کمی ہو جائے گی۔ اگر یہی بات ہو تو ڈائرکٹر نے جاذبیت پر اصلیت قربان کر دی۔

فلم ڈائرکٹر کے اختیارات و فرائض اور اس کی قابلیت و عدم قابلیت کے نتائج و اثرات پر بالاختصار گفتگو کرنے کے بعد آئیے ہندوستانی فلم ڈائرکٹروں کی مہارت فن اور صلاحیت کار کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیں اور دیکھیں ان میں کس کا درجہ کیا ہے اور یہ رائے بھی قائم کریں۔ کہ سب سے بڑا ماہر فن کون ہے؟

ہندوستان کے مشہور فلم ڈائرکٹروں کے نام حسب ذیل ہیں:۔

چندولال شاہ، رام شنکر چودھری، نیتن بوس، پرمتھیش بروا شانتارام جی پونہ، دیوکی کمار بوس، یہ لوگ صف اول میں شمار ہوتے ہیں دوسرے درجے میں مسٹر بھوناتی، سروتم بادامی، مسٹر آسپین (بمبئی ٹاکیز)، مسٹر عذرا میر، مسٹر سردار، مسٹر لوہار، بابوراؤ پینٹر، نندلال گنگولی، ونائک، پرپھل راؤ، جیوتش بنرجی۔

ان سب کے علاوہ جتنے ڈائرکٹر ہیں ان کا شمار تیسرے درجے میں ہوتا ہے۔

چندولال شاہ کی بہترین فلم "بیرسٹر کی بیوی" ہے اور یہ ان کی تمام فلموں میں فنی اعتبار سے سب سے زیادہ بلند ہے۔ اس کے بعد چاہئیے تھا کہ وہ بتدریج ترقی کرتے جاتے اور نقش ثانی نقش اول سے روشن جلی اور دلکش ہوتا جاتا۔ لیکن صورت واقعہ اس کے برعکس ہے حقیقت یہ ہے کہ چندولال شاہ کو فن سے زیادہ روپیہ عزیز ہے۔

رام شنکر چودھری کے کمال فن کا مخصوص ترین کارنامہ "مادھوری" اور "ٹمپل بیلز" ہیں۔ ان کی باقی فلموں میں ان دونوں سے زیادہ بلند کوئی بھی نہیں ہے، سب ان سے فروتر ہیں۔ رام شنکر کی قابلیت میں کلام نہیں، لیکن خبر نہیں وہ اپنے جوہر قابلیت سے کام کیوں نہیں لیتے؟ انہوں نے حال ہی میں ایک انٹرویو کے دوران میں کہا تھا کہ وہ تاہنوز ایک عجیب حالت میں مبتلا ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے کمال فن کے اظہار سے قاصر ہیں۔ تاہم ان کا آغوش دل تمناؤں سے خالی نہیں ـــــ ان کی آرزوئیں مچل مچل کر وقت کا انتظار کر رہی ہیں۔

فلم بیں حضرات بھی صبر کے ساتھ انتظار فرمائیں۔ اگر وقت آیا تو مجھے تبصرۂ ثانی میں چنداں زحمت نہیں ہوگی۔

صف اول کے باقی ڈائرکٹروں میں نیتن بوس، بروا، شانتارام اور دیوکی بوس بے شبہ اپنے فن میں کمال رکھتے ہیں اور ان کے درک و تبحر میں کسی کو کلام نہیں، تاہم ان میں ہر ایک کی صحیح صحیح پوزیشن دریافت کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ ان کے کاموں کا بنگاہ تعمق مطالعہ کیا جائے۔

مسٹر نیتن بوس اور مسٹر پرمتھیش بروا "نیو تھیٹرز" (کلکتہ) کے ڈائرکٹرس ہیں۔ اور اس کمپنی کی متعدد کامیاب اور مشہور فلمیں پبلک میں آچکی ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان فلموں کی کامیابی کا تمام تر امتیاز نہ وہ اختصاص انہیں کو حاصل ہے یا اس میں ان کے دوسرے رفقائے کار بھی حصہ گیر ہیں۔

"نیو تھیٹرز" کے فلموں کی کامیابی کا سب سے زیادہ انحصار اس کے بیک گراؤنڈ میوزک اور موسیقی پر ہے اور اس کا کامل امتیاز مسٹر آر۔ سی۔ بورل کو حاصل ہے۔ علاوہ ازیں مسٹر کندن لال سہگل اور کے۔ سی۔ ڈے۔ جیسے موسیقی طراز اشخاص کمپنی میں موجود ہیں۔ جن کی نغمہ زائی اور ترنم آفرینی نے ملک کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ ہندوستان کا باکمال اداکار مسٹر پرتھوی راج کپور اسی کمپنی کی شہرت و ناموری کو چار چاند لگا رہا ہے۔ مسٹر سہگل، پہاڑی سانیال اور نواب جیسے ماہر فن اداکار یہاں کی فلموں میں کام کرتے ہیں۔ ہندوستان کی ممتاز ترین ایکٹرس مس اوما شی، مس چندرا، مس جمنا اسی کمپنی کی فلموں کی رونق و دلکشی اور مقبولیت میں اضافہ کر رہی ہیں۔ نیو تھیٹرز کے عکاس اور صدا بند بھی اپنے فن میں معقول دستگاہ رکھتے ہیں۔ مسٹر امر ملک، مسٹر کدار اور مسٹر سدرشن جیسی قابل شخصیتیں بھی یہیں موجود ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ "نیو تھیٹرز" کی فلموں کی رفعت و برتری میں... نیتن بوس اور بروا کے علاوہ ان اشخاص کی کارفرمائیاں بھی شامل ہیں۔

مسٹر شانتارام "پربھات" میں کامل اختیار و تصرف رکھتے ہیں: اور "پربھات" ہندوستان کی ایک فارغ البال کمپنی ہے۔ اس لئے وہاں شانتارام کو ہر طرح کی آسانیاں حاصل ہیں، اس کے علاوہ انہیں مسٹر فتے لال اور مسٹر ودھاتے وار جیسے اہل فن کی اعانت حاصل ہے۔ اس لئے "پربھات" کی فلمیں صرف شانتارام کی دانش فن کی مرہون منت نہیں۔ دوسرے اسباب کی سازگاریاں بھی ان کے محاسن کا باعث ہیں۔

دیوکی بوس پہلے "نیو تھیٹرز" میں تھے۔ آج کل ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اس لئے ان بیچارے کے ساتھ مغز مارنا

فضول ہے۔ ان کو بھی وقت آنے تک کے لئے چھوڑ دیجیے۔

یہ ہے ہندوستان کے ممتاز اور نامور ڈائرکٹروں کی پوزیشن کا اجمالی خاکہ۔ اب آئیے دیکھیں ان میں سب سے زیادہ صناع اور ماہرِ فن کون ہے۔

نیتن بوس نے اب تک تین فلمیں تیار کی ہیں۔ "ہندی چھٹی کا" "ڈاکو منصور" اور "بھاگیہ چکر" (تقدیر کا چکر) ان میں سے "ڈاکو منصور" کی فلمبندی اس زمانے میں ہوئی تھی جب "نیو تھیٹرس" اپنے نصب العین میں تغیر کرنا چاہتی تھی۔ اور اس کا رجحان "بوکس آفس" کی جانب ہو رہا تھا۔ اس لئے "ڈاکو منصور" کا معیار لازمی طور پر پست ہے۔ "چنڈی داس" کے لئے بھی نیتن بوس کو کوئی امتیاز نہیں دیا جا سکتا۔ کہ قبل ازیں ایک متبحر اہلِ فن اسے تیار کر چکا تھا۔ "بھاگیہ چکر" بے شک فنی حیثیت سے ایک بلند پایہ اور معیاری فلم ہے۔ لیکن اس کا بھی تمامتر امتیاز صرف نیتن بوس کو بخش دینا ان ارباب فن پر صریح ظلم ہوگا۔ جن کا "بھاگیہ چکر" کے محاسن میں ناقابل انکار حصہ ہے۔ فلم کا سنگِ بنیاد فسانہ ہوتا ہے۔ اور "بھاگیہ چکر" مسٹر سدرشن کی کاوش طبع کا نتیجہ ہے جو اردو اور ہندی کے نامور اور کامیاب فسانہ نویس ہیں۔ اس فلم کی اداکاری اور موسیقی بھی قابلِ قدر و داد ہے، اس لئے بھاگیہ چکر کو ایک گراں پایہ فلم قرار دینے کے باوجود اسے صرف نیتن بوس کا کارنامہ نہیں کہا جا سکتا۔

مسٹر بروا کی شہرت کو "دیوداس" اور "منزل" نے دو شہپر لگا دئے ہیں۔ جن کی مدد سے وہ ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک مشہور ہو گئے ہیں۔ لیکن ان دونوں فلموں کے اوصاف و محاسن کی تحلیل و تجزیہ کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کا کامیابی میں پچاس فیصدی حصہ ان کے فسانوں کا ہے جو بنگال کے شہرۂ آفاق اہلِ قلم شرت چندر چٹرجی کے ناولوں کا چربہ ہیں۔ پچیس فیصدی اداکاروں اور دوسرے ماہرین فن کا اور صرف پچیس فیصدی حصہ مسٹر بروا کا ہے۔ مسٹر سہگل، مسٹر کے۔ سی۔ ڈے اور مس جمنا نے دیوداس میں خوب داد کمال دی ہے، سہگل کی نغمہ طرازی تو دیوداس کی جان ہے۔

"منزل" کی تمہید میں پرتھوی راج کپور نے بہت اچھا کام کیا ہے خود مسٹر بروا اور مس جمنا نے اس فلم میں قابلِ داد پارٹ کئے ہیں۔ غرض دیوداس اور منزل میں مسٹر بروا کا ڈائرکشن کوئی امتیازی خصوصیت نہیں رکھتا۔ لیکن میری رائے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ مسٹر بروا اچھے ڈائرکٹر نہیں ہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ "دیوداس" اور "منزل" کی کامیابی و قبولیت کا تمامتر امتیاز مسٹر بروا کو حاصل نہیں اور وہ ہندوستانی ڈائرکٹروں میں سب سے اول قرار نہیں دئے جا سکتے۔

شانتارام اور دیوکی بوس بھی اپنی اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق فلمسازی میں ہندوستان کا نام روشن کر رہے ہیں۔ شانتارام نے اب تک مفصلۂ ذیل سات فلمیں تیار کی ہیں۔

(۱) ادھ صیا کا راحیہ۔ (۲) جلتی نشانی۔ (۳) مایا مچھندر۔ (۴) سیرندھری (۵) امرت منتھن (۶) مہاتما۔ (۷) امر جیوتی۔

اسی طرح دیوکی بوس نے بھی سات تصویریں بنائی ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) چنڈی داس (بنگالی) (۲) پورن بھگت (۳) راج رانی میرا (۴) سیتا (۵) انقلاب (۶) جیون ناٹک (۷) سنہرا سنسار۔

شانتارام کی پہلی تین فلمیں ادھ صیا کا راحیہ۔ جلتی نشانی اور مایا مچھندر فن کے اعتبار سے بہت زیادہ بلند نہیں ہیں۔ ان کے کمال فن کا اظہار "امرت منتھن" سے شروع ہوتا ہے۔ جو "مہاتما" میں مزید ترقی کرتا ہے۔ اور "امر جیوتی" میں بلند سے بلند تر ہو جاتا ہے۔ لیکن دیوکی بوس کی تمام فلمیں اول سے لے کر آخر تک کمال صنعت اور مہارت فن کا نمونہ ہیں اور یکے بعد دیگرے علی الترتیب ترقی کرتی چلی گئی ہیں۔

شانتارام کے ڈائرکشن میں صنعت سے زیادہ آمدنی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اور فن پر کاروبار کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصویریں اغلاط و نقائص سے معمور ہیں۔ سنجیدہ پبلک تو اب برمحل گانوں کو بھی چنداں پسند نہیں کرتی۔ لیکن مسٹر شانتا کی پست مذاقی کا یہ حال ہے کہ وہ بے محل گانوں سے بھی پرہیز نہیں کرتے، ان کی فلموں میں ڈرامیٹک کاشلے تک موجود ہیں، آخر اس سے زیادہ ابتذال ذوق اور کیا ہو سکتا ہے "امرت منتھن" اور مہاتما" میں بے شک مسٹر شانتا نے صنعت دانی اور دانش فن کا ثبوت دیا ہے، اگر وہ عامیانہ مذاق سے بلند ہو کر اور کاروبار پر فن کو فائق رکھ کر ڈائرکشن کریں تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ہندوستان کے قابل فخر فلم ڈائرکٹر ہو سکتے ہیں۔

اب صفِ اول کے ڈائرکٹروں میں صرف دیوکی بوس کی ذات باقی رہ جاتی ہے اور میرے نزدیک مسٹر دیوکی ہی ہندوستان کے سب سے ممتاز اور باکمال فلم ڈائرکٹر ہیں، ان کی جتنی فلمیں ہیں سب معیاری

ہیں، سب بلند پایہ ہیں، سب کمال فن کا نمونہ ہیں، صرف مسٹر بروا کی "منزل" دیو کی بوس کی "انقلاب" سے فائق اور "جیون ناٹک" سے فروتر ہے باقی تمام ہندوستانی فلموں پر دیو کی بوس کی تصویریں ترجیح و فوقیت رکھتی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی معیار فلم کی بلندی کا تمام تر شرف و امتیاز مسٹر دیو کی بوس کو حاصل ہے۔ جس زمانے میں ہندوستانی فلم اسٹوڈیو لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ستیہ وان ساوتری، صبح کا ستارہ جیسی پست، مبتذل اور عامیانہ تصویریں تیار کر رہے تھے۔ دیو کی بوس نے "چنڈی داس" اور "پورن بھگت" پیش کر کے دنیائے فلم میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اور جس وقت تک چندولال شاہ "رادھا رانی"، "شانتا رام" "ایدھیا کا راجہ" اور "مایا مچھندر" سے بہتر تصویر پیش نہ کر سکے تھے، مسٹر بروا کے نام سے بھی پبلک واقف نہ تھی اور مسٹر نیتن، دیو کی بوس کی نگرانی میں تحصیل فن کر رہے تھے مسٹر دیو کی چنڈی داس اور پورن بھگت جیسی بلند پایہ فلموں کی تکمیل کر چکے تھے جن کی نظیر آج بھی ہندوستان کی دنیائے فلم میں ناپید ہے۔

چنڈی داس اور پورن بھگت سے پہلے پردۂ فلم تھیٹر اسٹیج کی مضحکہ انگیز نقل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا۔ تھیٹر ہی کی طرح منظوم اور مقفی مکالمے ہوتے تھے۔ ویسے ہی محل بے محل گانے، سحر و جادو کے دور از حقیقت واقعات۔ اور انہیں چیزوں کی پبلک طالب اور خوگر تھی۔ یہ مسٹر دیو کی ہی کا کمال فن تھا کہ اس نے چنڈی داس اور پورن بھگت تیار کر کے تن تنہا مذاق عام کے سیلاب کا رُخ پلٹ دیا۔ اور نقل میں اصل زندگی کی صحیح شان پیدا کر دی۔ اب جو ہماری فلمیں ہماری حقیقی زندگی سے روز بروز قریب تر ہوتی جا رہی ہیں اس مصلحانہ رہنمائی کا شرف صرف دیو کی بوس کو حاصل ہے۔

دیو کی بوس کی فلموں میں ایک شعریت ہوتی ہے، ایک شاعر کی روح کارفرما ہوتی ہے، ان میں ایک خاص پیغام ہوتا ہے۔ اگر "جیون ناٹک" ہمیں فطرت کی جانب بازگشت کرنے کی دعوت دیتی ہے تو "انقلاب" میں محبت کی دعوتِ عام موجود ہے ——— فنی نقطۂ نظر سے "انقلاب" کا معیار بہت بلند ہے۔ یہ تصویر ہمیں کسی محدود کردار سے روشناس کرانے کی بجائے ہمارے سامنے دنیا کا ایک وسیع مرقع پیش کرتی ہے۔ اس کا "مسافر" ایک دنیا دیکھے ہوئے ہے اور دنیا کی فطرت و طینت سے بخوبی واقف ہے، وہ دنیا کی زمانہ سازی کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اس کی "زمین" دنیا سے بیزار ہو چکی ہے۔ وہ اس کی گیا دلو سے متنفر ہے، وہ اس کے دام فریب کو پارہ پارہ کر کے اس سے نکل بھاگنا چاہتی ہے۔ اس کا "جلیسوال" نوجوان ہے، وہ دنیا کی لغویت کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں، وہ انقلاب کا طالب ہے، وہ سوسائٹی میں انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے، وہ سوسائٹی کی تمام بے ہودہ بندشوں کو نیست و نابود کر ڈالنے پر تُلا نظر آتا ہے۔

اس طرح "جیون ناٹک" بھی ایک خاص حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کی "کوئن" کے نزدیک فطرت کی جانب بازگشت کرنے کا پیام محض لایعنی ہے، وہ اپنے کو بڑے شوق و تمنا سے دنیا کی آغوش میں ڈال دیتی ہے۔ لیکن بعد میں اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ دنیا جو دُور سے نظر فریب و دل آویز پھولوں کا تختہ نظر آتی تھی وہ خاردار جھاڑیوں سے لبریز ہے۔ اور ان جھاڑیوں میں ایک سے ایک ہولناک درندے اور زہریلے جانور چھپے ہوئے ہیں۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہم ایک دوسرے کو کھا جانا چاہتے ہیں۔ ہمیں مصیبت زدوں کی مصیبت کی کچھ پروا نہیں، ہم اپنی مسرت و شادمانی اور آسائش کے لئے دوسروں کی گردن پر چھری چلاتے ہیں، ہمیں محبت کرنے کے لئے دوسروں کی دلشکنی کرنی پڑتی ہے۔ وہ ان حالات سے پریشان ہو جاتی ہے۔ اسے پھر فطرت کی جانب بازگشت کرنے کا پیام ملتا ہے، وہ اس بار اس پیام کو سنتی ہے اور دنیا کی تمام الجھنوں کو روندتی ہوئی اس سے نکل جاتی ہے۔

"سہرا سنسار" بھی ایک خاص مقصد کے پیشِ نظر تیار ہوئی ہے اس فلم کے ذریعہ بھوک کے مسئلہ کو حل کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے اور توقع ہے کہ مسٹر دیو کی کے ایک خاص کارنامے کی حیثیت سے "سہرا سنسار" پبلک سے داد تحسین حاصل کرے گی۔

ماہرِ فن ڈائرکٹر کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ معمولی اداکار کو بھی اپنی تعلیم و ہدایت سے کامیاب اداکار بنا دے اور اس کی اداکاری و جذبات نگاری میں کمال پیدا کر دے، مسٹر دیو کی بوس میں یہ وصف بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ مہارت فن اور کمال تجربہ سے معمولی اداکار کو کامیاب اور کامیاب کو کامیاب تر بنا دیتے ہیں۔ جس اداکار نے مسٹر دیو کی کے ماتحت کام کیا وہ پبلک کے دل کا مالک ہو گیا۔ کیا "پورن بھگت" کے کمار کو کوئی ہندوستانی فلم بین کبھی بھول سکتا ہے؟ مدت العمر نہیں۔ ہندوستانی فلم میں درجۂ اوّل کے جتنے ایکٹر اور ایکٹریس ہیں سب کے سب دیو کی بوس کے تربیت یافتہ ہیں، درگا داس بنرجی، پرتھوی راج کپور اور نواب ہندوستان کے

کامیاب ترین اداکار سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح ایکٹرسوں میں مس اماشنی اور درگا بائی کھوٹے اوّل درجے کی ایکٹرسیں خیال کی جاتی ہیں۔ ان سب کو درجۂ کمال پر پہنچانے والے مسٹر دیوکی ہیں۔

غرض دیوکی بوس نے ہر طرح صنعت فلم سازی کو ترقی دی۔ فلم کا معیار بلند کیا، خود اچھی فلمیں تیار کیں، دوسروں کو اپنی پیروی پر مجبور کیا۔ اقرب الی الفطرت تصویریں تیار کرکے دنیائے فلم میں ایک نیا دور جاری کیا، ایکٹروں کو اداکاری و جذبات نگاری کے رازہا سربستہ سے مطلع کیا۔ ڈائرکٹروں اور اداکاروں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ اداکاری رونے، ہنسنے، اچھل کود کرنے اور گانے کا نام نہیں ہے۔ اداکاری کے معنی ہیں انسانی جذبات و احساسات کی حقیقی ترجمانی و نمائش۔ مسٹر دیوکی کے ان کمالات اور کارناموں کی بنا پر انہیں ہندوستان کا سب سے بڑا فلم ڈائرکٹر قرار دیا جائے تو بےجا نہ ہوگا۔

"تماشائی"

دیہاتی مدرّس

یاس گیں۔ سہما ہوا۔ غم آشنا۔ بے آبرو
آدمی ہے یا کسی حسرت زدہ کی آرزو

جھرّیاں چہرے پہ ماتھے پر الم کی تیرگی
جسم لاغر، جامہ بوسیدہ، نگاہیں رحم جُو

رکھ ہی کیا ہے سیہ بختی نے بیچارے کے پاس
چند آہیں، بے اثر فریاد، سوزِ آرزو

خوف سے افسر کے آہیں حلق میں اٹکی ہوئیں
خشک ہونٹوں پر سیاہی اور آنکھیں باوضو

سینچتا رہتا ہے رقّت آفریں حالات میں
قوم کے پودوں کو دے دے کر کلیجے کا لہو

یہ خداوندانِ ارضی کی جفا سے نوحہ گر
اور اربابِ حکومت اس کے دم سے سرخرو

رُوح اس کی پارہ پارہ دردِ غم انگیز سے
زندگی اس کی رہینِ مسلکِ لاتقنطو

آہ سے اس کی جہاں میں زلزلہ آنے کو ہے
قصرِ استبداد کی بنیاد ہل جانے کو ہے

شیر افضل خان جعفری

نورجہاں

ایک منظر

آگرہ کا قلعہ، شام کا وقت ہے، سنہری آفتاب کی قدیم شعاعیں درختوں کی پتیوں پر ایک خوشنما رنگ پیدا کر رہی ہیں، جمنا کی لہروں میں آفتاب کا رنگ جاذب توجہ ہے، ایسا سہانا منظر ایسا دلکش سماں ــــــ ہلکی ہلکی فرحت بخش ہوا روح کو تازگی بخش رہی ہے، ملکہ نورجہاں آج باغ میں ٹہلنے کی بجائے دریا کی سیر کے لئے بارہ دری کی چھت پر چڑھ آئی ہیں - شاعری کی دُھن سوار ہے اور اپنی شاعرانہ دنیا میں کھوئی ہوئی والہانہ طور پر اپنے جذبات کی رو میں بہہ رہی ہیں، کبھی کوئی اچھا مصرع ہو جاتا ہے تو ترنم کے ساتھ گنگنانے لگتی ہیں۔ ہاتھ بھی ہلنے لگتے ہیں، دریا کی بھی سیر دیکھ رہی ہیں، ایک لونڈی سے قلم اور کاغذ منگایا۔ مصری ایک گوشہ میں کھڑی ہوئی دریا کی سیر دیکھ رہی ہے۔ کبھی کسی طرف دیکھنے لگتی ہے اور چور نظروں سے بیگم کی کیفیت اور مجذوبانہ حالت کو دیکھ کر دوسری کنیز سے بھی سرگوشی کرتی جاتی ہے۔ جو ابھی کاغذ دے کر اس کے پاس آ کھڑی ہوئی ہے - یہ لیجئے ایک شعر ہو گیا، اب کاغذ پر لکھ رہی ہیں۔ ؎

کشادِ غنچہ اگر از نسیم گلزار است
کلیدِ قفلِ دلِ ما تبسم یار است

اور اب اسے بار بار گنگنا رہی ہیں، دریا میں اِدھر اُدھر دو ایک کشتیاں دُور تیر رہی ہیں، سامنے سے ایک کشتی کنارے کنارے آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ اب آ کر سامنے ایک طرف ٹھہر گئی۔ تین آدمی بیٹھے ہیں ایک طرحدار نوجوان بیٹھا ہوا اس طرف تک رہا ہے، اور ملکہ کی کیفیات کو حریصانہ نگاہ سے دیکھ رہا ہے، ــــــ

اب ایک مصرع اور ہو گیا ؏

دلِ کسیکہ بحسنِ ادا گرفتار است

سر جھکا کر دریا کی جانب رُخ کئے دوسرے مصرعے کی فکر میں غوطہ زن ہیں، وہ بےساختہ آ گیا، ؏

نہ گل شناسد و نے رنگ و بو نہ عارض و زلف

بیگم اُچھل پڑیں اور اب عجلت کے ساتھ لکھ رہی ہیں۔ کشتی میں بیٹھا ہوا نوجوان نہایت بیتابی سے بیگم کی طرف دیکھ کر کشتی میں اُچھل رہا ہے، وہ سمجھ رہا ہے کہ یہ عورت مجھے پرچہ لکھ رہی ہے یہ لیجئے اب تو وہ اپنی کشتی اور بھی قریب لے آیا۔ ساتھی بھی اس کے سمجھائے یہی سمجھ رہے ہیں - اور ڈرتے ڈرتے محل کی جانب کشتی بڑھانے پر راضی ہو رہے ہیں، ایک نے تو ہاتھ بڑھا کر نوجوان کے ہاتھ سے ڈانڈ بھی چھین لی۔ وہ جھنجلاتا ہے اور بیگم کی حالت دکھا کر بیتابی سے کشتی قلعہ سے قریب کرتا چلا آتا ہے، اس طرف بیگم پورا شعر جوش کے ساتھ ترنم سے پڑھتی ہیں ؎

نہ گل شناسد و نے رنگ و بو نہ عارض و زلف
دلِ کسیکہ بحسنِ ادا گرفتار است

"کسے" پر زور دیتی ہیں اور ہاتھ کا اشارہ اپنی جانب کرتی ہیں اور "حسنِ ادا" پر ہاتھ لمبا کر دیتی ہیں وہ شخص یہ سمجھ کر کہ یہ عورت مجھے اشارہ کر رہی ہے۔ پرچہ لکھ چکی ہے اور اب اظہارِ عشق کر رہی ہے۔ خود بھی چلا کر ایک شعر پڑھتا ہے، (کشتی بالکل قریب آ چکی ہے) ؎

اے کہ باسلسلۂ زلف دراز آمدۂ
فرصتت باد کہ بیگانہ نواز آمدۂ

آواز کے ساتھ ہی بیگم کی نگاہ اس شخص پر پڑتی ہے، اس کے اشاروں اور عاشقانہ طور کو دیکھ کر بیگم غصہ سے تھر تھر کانپتی ہیں، مصری لونڈی اشارہ کرتی ہے کہ واپس ہو جائے، وہ دُور سے اس مفہوم کو نہیں سمجھتا اور لجاجت کے ساتھ ایک شعر اور پڑھتا

ہے ع

زہد من با تو چہ سنجد کہ بیغمائے دلم
مست و آشفتہ بخلوتگہ راز آمدہٴ

بیگم غصہ سے تاب نہ لا کر فوراً کمان پر تیر چڑھاتی [illegible] ہی لمحہ میں نوجوان کی لاش کشتی میں تڑپتی ہوئی نظر آتی ہے، دونوں [illegible] لرزہ بر اندام ہیں، بیگم کی غصہ سے تیوری چڑھی ہوئی ہے، بپھری ہوئی شیرنی کی طرح واپس ہوتی ہیں اور نیچے اُتر جاتی ہیں، دونوں کنیزیں بھی بھیگی بلی کی طرح پیچھے پیچھے جا رہی ہیں۔

عبیداللہ قدسی

سہرا

بہ تقریب سعید کتخدائی جناب راجہ محمد افضل خاں صاحب فرزند ارجمند جناب محترم خان بہادر راجہ فاضل محمد خاں صاحب پی۔ای۔ایس۔ ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ ایجوکیشن میونسپل بورڈ دہلی

پڑھ کے گوندھا جو گیا اِنّا فتحنا سہرا
سارے سہروں میں رہا اس لئے اچھا سہرا

ہر لڑی سہرے کی گوندھی گئی ہو پڑھ کے درود
واہ واصلِّ علیٰ لکھا ہے کیسا سہرا

آبِ کوثر سے وضو کر کے تخیل نے مرے
لب پہ تھا صلِّ علیٰ لکھا جو یکتا سہرا

نورِ ایمان ہوا لوحِ جبیں پر پیدا
دستِ شفقت سی بزرگوں نے جو باندھا سہرا

ہر طرف سے یہ ندا آئی "مبارک باشد"
باندھا فاضل نے جو افضل کے یہ اعلیٰ سہرا

عرقِ روئے محمد کی ہے ہر گل میں شمیم
اس سے دنیا میں نہیں کوئی نرالا سہرا

اس سے ممتاز کی ممتاز محبت ہے عیاں
سارے سہروں میں ہے ممتاز سراپا سہرا

ممتاز فاروقی
بیرسٹر ایٹ لا (گجرات)

سوال و جواب

سوالات

(۱) مندرجہ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے:-

(۱) اکبر الہ آبادی کا اردو شعرا میں کیا درجہ ہے؟ کلام اکبر کے محاسن و معائب پر ایک اجمالی نظر ڈالیں۔ رباعیات [illegible] کے علاوہ اکبر کے کلام کا بیشتر حصہ ابتذال و عریانی سے پر ہے کیا آپ کی نظر میں حضرت اکبر بھی "ذوقی" ہیں یا نہیں؟

(۲) مندرجہ ذیل الفاظ کی تذکیر و تانیث مشتبہ ہو رہی ہے ان میں سے اکثر دونوں طرح مستعمل ہیں۔ آپ اپنی قیمتی رائے سے آگاہ کریں:-

فکر - طرز - سائنس - لغات - موٹر - تار -

نیازمند
چرنجی لال گپتا آتش بی - اے - موگا ضلع فیروزپور

(۲) بسلسلہ سوال و جواب ماہ فروری ۳۷ء عرض ہے کہ اصل لفظ ندی بغیر تشدید دال ہے یہ لفظ بھاشا کا ہے اس میں نون مفتوح اور دال مکسور ہے۔ گو بہائیں تلسی داس فرماتے ہیں:

تلسی اس سنسار میں بھانت بھانت کے لوگ
سب سے مِل جُل بیٹھئے ندی ناؤ سنجوگ

ہندی کے ایک اور مستند شاعر کا دوہا ہے:

ندی کنارے دھواں اٹھت ہے میں جانوں کچھ ہوئے
جا کارن جوگن بنی، وہی نہ جلتا ہوئے

چڑی چونچ بھر لے گئی ندی نہ گھٹیو نیر (کبیر)

ندیاں بصورت جمع بھی بغیر تشدید بالکل درست ہے اور لکھنا چاہیئے۔ مثلاً:

کہیں بجلیوں سے ایک بارش سی ہے سیمیں ہیولوں کی
کہیں سرسوں سے ندیاں بہ رہی ہیں زرد پھولوں کی

بعض شعراء اسے مشدد لکھتے ہیں مگر اس کے جواز میں کوئی سند نہیں ملتی۔ اسے ان کا تصرف یا قبول جوک سمجھ لیجئے۔ خیر یہ تصرف تو [illegible] سلیم کو گراں نہیں گزرتا اگر کوئی ندی بہ تشدید دال لکھ دے تو غلط نہیں۔ مگر بعض جگہ یہ تصرف بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً بھاشا کا لفظ کنگنا بہ سکون کاف تمام ہندوستان میں لکھا اور بولا [illegible] ہے۔ استاد ذوق نے اسے کنگنا نظم کیا ہے (سہرے میں) جو قابل تسلیم و تقلید نہیں ہے۔

خنساں (جہلم)

(۳) ا۔ پہلے لوگوں کا خیال تھا آسمان چکر کاٹتا ہے۔ لیکن اب یہ نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے اس لئے "گردش گردوں" کہنا صحیح ہے یا نہیں۔ اسی طرح کے کئی محاورات ہیں ان کا استعمال کہاں تک جائز ہے؟

(ب) آندھیاں چلنا درست ہے یا آندھیاں آنا:

اب زمیں ہلنے کو ہے اور آندھیاں آنے کو ہیں

(ج) "میں نے وہ الفاظ سادگی سے استعمال کئے۔ کسی کے دل کو دکھانا منظور نہ تھا۔" کیا یہاں سادگی کے معنی غلطی سے ہیں یا کچھ اور۔ اصل مطلب کیا ہے۔

شیخ محمد طفیل (امرتسر)

(۴) مجھے شاعر بننے کا شوق ہے، لیکن شعر نہیں کہہ سکتا۔ اس معاملے میں میری راہنمائی فرمائیں۔

(حافظ رفیع الدین)

(۵) اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر کون ہے اور اس کے بعد کون ہوگا؟ (دائم شفیع)

(۶) ہندوستان میں صحیح قوم پرست اخبار کون کون سے ہیں۔

(جیون لال)

(۷) میں حال کریم الدین سے ملنا چاہتا ہوں آپ کی کیا رائے ہے؟ (شاہ محمد)

(۸) میں "مخزن" کا خریدار بننا چاہتا ہوں، براہ کرم اس کے دفتر کا پتہ تحریر کر کے ممنون فرمایئے۔
(۹) مولٰینا سیماب کی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟　جوہر اعظمی

جوابات

نذیر احمد شاد بی۔ اے (ملتان)

(۱) لسان العصر خان بہادر سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی ایک مشرقی ماحول میں پیدا ہوئے، مشرقی تہذیب میں انہوں نے تربیت پائی۔ مذہب کے زیرِ سایہ زندگی بسر کی۔

مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا تصادم اور اس تصادم میں مشرقی تہذیب کی پسپائی۔ اس کے ساتھ مذہب سے عام بے اعتنائی کے مناظر نے ان کے احساس کو مجروح کیا۔ ان کی شاعری درحقیقت مغرب زدگی اور مغربی تہذیب کی پرستاری کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے جسے کبھی رو کر اور کبھی ہنس کر بلند کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک خدا۔ مذہب، ضمیر، کیرکٹر، اور مشرقیت کو مغربی تعلیم و تہذیب نے رخصت کر دیا ہے۔ انسانیت اس تہذیب کی کورانہ تقلید سے دُکھ اُٹھا رہی ہے۔ اکبر کی ساری شاعری انہیں شکایات کا دفتر ہے۔

اکبر کی قدیم غزلیات میں ابتذال اور پرانی شاعری کی بعض بدنما ادائیں موجود ہیں۔ لیکن جدید کلام (نظمیں ہوں یا غزلیات) بھرتی سے پاک ہے۔

البتہ چونکہ اکبر خدا اور مذہب سے بے اعتنائی، مغرب پرستی، اور مشرقیت کی موت کے متعلق بار بار مختلف پیرایوں میں اظہارِ خیال کرتا ہے۔ اس لئے تکرار خیالات کے سبب اکبر کا کلام مسلسل طور پر اکتائے بغیر نہیں پڑھا جاتا۔

البتہ اکبر ذوقی (ذوق کا پیرو) ہرگز نہیں۔ ذوق کا کلام تو صنعتوں کا ایک انبار ہے۔ فرسودگی، پست نوائی، بے کیفی اس کی شاعری کے بڑے بڑے نقائص ہیں۔ اور اکبر کا کلام خصوصاً جدید کلام ان معائب سے قطعتہً پاک ہے۔

(۵) فکر اور طرز مؤنث ہے۔ موٹر جدید لفظ ہے اور جدید مغربی الفاظ کی تذکیر و تانیث میں ملک کے اُن حصوں کی پیروی کرنی چاہیئے جن میں یہ چیزیں اور ان کے نام پہلی مرتبہ آئے اور زیادہ آئے۔ پنجاب میں موٹر کا لفظ مؤنث ہے اور یہی صحیح ہے۔ البتہ تار کا لفظ بھی یہاں مؤنث ہی بولا جاتا ہے۔ اور غلط ہے کیونکہ تار سارے ہندوستان میں ایک ساتھ آیا اور دلی لکھنؤ والوں نے اسے مذکر بولنا شروع کیا۔ تار کو مذکر ہی بولنا چاہیئے۔ اس کی جمع تاریں غلط ہے۔

سانس لکھنؤ میں مؤنث بولا جاتا ہے۔

"سانس دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے
اور چھرا کا دیا جلاد نے جاتے جاتے"

دہلی میں مذکر بولا جاتا ہے۔ اہلِ پنجاب تذکیر و تانیث میں عموماً دہلی کے پیرو ہیں

لغات مؤنث ہے۔

(۲) ندی بہ تخفیف دال بھاشا کا تلفظ ہے اردو کا نہیں۔ اردو میں بہ تشدید دال فصیح ہے۔ اگرچہ بہ تخفیف دال بھی غلط نہیں۔ کنگنا بہ سکون کاف صحیح ہے بہ فتحہ کاف فارسی غلط ہوگا۔

(۳) (الف) محاورات جس نظریہ یا خیال پر اول اول وضع کئے گئے ہیں انہیں کے مطابق اُن کا استعمال صحیح ہو سکتا ہے خواہ وہ نظریہ غلط ہی ثابت ہو چکا ہو۔ اس لئے "گردش گردوں" بالکل صحیح ہے۔

(ب) آندھیاں چلنا۔ آنا اور اُٹھنا ہر طرح درست محاورہ ہے

"اب زمیں ہلنے کو ہے اور آندھیاں آنے کو ہیں"

یہ بھی درست ہے۔

(ج) یہ فقرہ بھی درست ہے۔ سادگی سے یہاں مراد بے خبری اور انجان پن ہے۔

(۴) آپ کو شاعری کا بڑا شوق ہے۔ خدا رحم کرے۔ شعر کہنا چاہتے ہیں اور نہیں کہہ سکتے۔ واقعی آپ کی قابلِ رحم حالت ہے۔ مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے۔ خدارا اس شوق نارسا کو اپنی بیماری نہ بنا لیجیے۔ شاعر نہ ہونا آدمیت کا کوئی نقص نہیں ہے۔ نہ تعزیرات ہند میں کوئی ایسی دفعہ ہے کہ

"جو شاعر نہ ہو یا نہ بننا چاہے دو سال کی قید سخت کا مجرم ہے"

اردو شاعری کا انجام گداگری اور یا پھر فاقہ کشی ہوتا ہے۔ آپ کو اس انجام کا کونسا پہلو پسند ہے؟

میری رائے تو یہی ہے کہ اپنے اوپر رحم کیجئے اور اس خبط سے باز آجائیے!

قبلہ اردو شاعری تو شادی کی طرح "لڈو کے لڈو" ہیں جو کھائے پچھتائے اور جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔

اگر یہ سودا اُچھلے بغیر نہ مانے تو شاعر بننے کے منحوس وقت آنے سے پہلے افیم کی ایک بڑی سی گولی کھا کر سو رہئے!

(۵) اس وقت اردو کا سب سے بڑا شاعر اقبال ہے۔

"اور اُس کے بعد" کا جواب یہ ہے کہ

آپ اور مَیں۔

(۶) صحیح معنی میں قوم پرست اردو اخبارات ہندوستان میں بہت کم ہیں۔ روزنامہ ہند کلکتہ، ریاست دہلی اور پارس لاہور یہ ہر سہ اخبارات قوم پرست ہیں اور ان کی پالیسی قوم پرستانہ ہے۔ اُسے نباہتے بھی ہیں۔

(۷) آپ عامل کریم الدین سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس میں میرے مشورے کی کیا ضرورت ہے؟ مل لیجئے! آپ ہی جیسے شہدوں کی وجہ سے عامل کریم الدین کی دکان چل رہی ہے اپنے وجود کو بیکار نہ سمجھئے کہ خدا نے کوئی چیز بیکار پیدا نہیں کی۔

لیکن عامل کریم الدین سے شرف نیاز حاصل کرنے کا جو ہیضہ آپ کو ہوا ہے پہلے اس بیماری کا علاج کرائیے۔ بہتر تو یہ ہے کہ پہلے اپنے دماغ کا معائنہ ضرور کرا لیجئے۔ مبادا دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہو۔

(۸) "آپ مخزن کے خریدار بننا چاہتے ہیں" شوق سے بن جائیے! البتہ لاہور میں سے اس کا دفتر مدت ہوئی منتقل ہو چکا ہے۔ اُسے لاہور میں تلاش کرنے کی بجائے آپ کو ملک عدم تشریف لے جانے کی زحمت فرمانی پڑے گی۔

(۹) علامہ سیماب ملک کے چند در چند منتخب شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری بلند خیالات، پاکیزہ جذبات، اور دلنشیں تغزل کی سرمایہ دار ہے۔ اُن کی غزلیات شاداب زمینوں، بولتے ہوئے قافیوں اور فلسفیانہ نکتہ آرائیوں سے غزل سرا معاصرین میں درجۂ امتیاز رکھتی ہیں۔

اُن کی بعض نظموں اور غزلیات کے متعدد اشعار پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں۔ آگرے کی بجائے لاہور کے باشندے ہوتے تو پیغمبر بے کتاب بنا دئے جاتے۔

"کار امروز" اور "کلیم عجم" اُن کے ساحرانہ کارنامے ہیں۔

افسوس ہے کہ ایسا باکمال سحر کار اس عالم ضعیفی میں زندگی کی کشاکش سے دو چار ہے۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پہ کمال افسوس ہے

یہ افسوس زیادہ دل گداز بن جاتا ہے جب بے مایہ اور فرومایہ تک بندوں کو عام کالعوام کی پذیرائی اور اس سبب سے زندگی کی کامرانیوں سے ہمکنار دیکھا جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ ذوق سخن فہمی سے اسی قدر دور ہے جتنا گروہ عوام اور تعلیم یافتہ جماعت چونکہ تہذیب حاضرہ کی نمائندہ اور علوم و فنون کی حامل ہے۔ اس لئے اس کی بے فہمی اردو شاعروں کے لئے شاعری سے بیزاری کا سبب بن رہی ہے۔

---

۲ حاصل ہو جائے۔　　(بشیر احمد - خالصہ کالج امرتسر)

جواب:- آپ کی فرمائش کی تعمیل میں خواجہ حالی پر ایک مختصر سا مضمون اسی نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے۔

تاجور

ایک سوال:- آئندہ اپریل میں انٹرمیڈیٹ کے اردو پرچے کا امتحان ہوگا۔ براہِ کرم مولانا حالی پر کوئی مختصر مگر جامع مضمون ضرور شائع کر دیں تاکہ ہم طلبہ کو اردو امتحان دینے میں سہولت ...

بقیہ تبصرا

"قنوطیت یعنی فلسفہ یاس":- قنوطیت، یاسیت اور تشاؤم یہ تینوں لفظ ایک ہی مطلب لئے ہوئے ہیں، یعنی زندگی سے یاس و حرماں، ناامیدی و مایوسی۔ ایک قنوطی کی نگاہوں میں زندگی شر عظیم ہے، کائنات کے بنیادی عناصر تخریب کی طرف مائل نہیں، اس جذبے سے متاثر ہو کر کہتا ہے ؎ مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی / ہیولےٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا یا ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام / مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

اردو داں حضرات کو ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اس کتاب میں آسان و عام فہم زبان میں قنوطیت کی وضاحت کی ہے۔ یہ کتاب کیا ہے قنوطیت پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ فاضل مصنف نے دلائل و براہین کی روشنی میں قنوطیت پر اسطرح تنقید کی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ تکمیل نہیں رہا۔ جو حضرات قنوطیت کے نظریہ پر معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ اس موضوع پر انہیں دیگر تصانیف سے بالکل بے نیاز کر دے گی۔ کتاب کی کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ ہے۔ صفحات ایک سو دس۔ قیمت دو روپے (عہ)۔ پتہ:- ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب استاد فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن۔ ([illegible])

تبصرہ

سالنامۂ ساقی:۔ ایڈیٹر شاہد احمد بی۔ اے (آنرز) دہلوی۔ قیمت سالانہ عہر

ساقی اُردو کے مقتدر رسائل میں سے ہے۔ اِس کا پیش نظر سالنامہ تنوع مضامین اور ترتیب کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔

مولانا عنایت اللہ بی۔ اے دہلوی نے ہیملٹ کا اُردو ترجمہ پیش کر کے اُردو ادب میں بیش قیمت اضافہ اور بی۔ اے کے طلبہ پر احسان عظیم کیا ہے۔ اختر حسین رائے پوری کا ایک ایکٹ کا ڈرامہ زلزلہ بھی خوب ہے۔

افسانوں میں فورسڈ لینڈنگ۔ آہ جوانی۔ فسانۂ زمستاں اور دو حادثوں کے درمیان ہمیں بیحد پسند آئے۔

مضامین میں سے "پچاس برس پہلے کی دِلّی"۔ "اردو افسانہ نویسی" "داراشکوہ کا نظریۂ حیات" وغیرہ مستحق تحسین ہیں۔

نظمیں بھی دِلکش اور وجد آفریں ہیں۔ سہ رنگی و یک رنگی تصاویر سے رسالہ کی زینت میں اضافہ کی کوشش کی گئی ہے "فاؤسٹ کا خواب" اگر شائع نہ کی جاتی تو بہتر تھا۔ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ منیجر رسالہ ساقی دہلی سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

سالنامہ کنول:۔ ایڈیٹر منظر صدیقی اکبر آبادی۔ قیمت سالنامہ دس آنے۔

اکبر آباد (آگرہ) ترقی پذیر شاعری کا مرکز رہا ہے۔ کنول کے فاضل مدیر نے سالنامہ شائع کر کے ثابت کر دیا ہے۔ کہ اب پھر اکبر آباد ادب کا مرکز بن رہا ہے۔ مضمون نگار حضرات میں حضرتِ جوش ملیح آبادی۔ مولانا سیماب اکبر آبادی۔ حضرت ماہر القادری۔ جناب منصور احمد مدیر ادبی دُنیا۔ ڈاکٹر سیّد محی الدین زورؔ قادری ایم۔ اے۔ حضرت دردؔ کاکوروی۔ حضرت لطیف الدین احمد۔ اور دیگر بلند پایہ شعراء و ادبا کے اسمائے گرامی سالنامہ کی کامیابی کے شاہد ہیں۔ تصاویر خوب ہیں۔ ٹائٹل یک رنگ ہونے کے باوجود جاذب نظر ہے۔ صفحات ڈیڑھ سو کے قریب ہیں۔ منیجر رسالہ کنول۔ مرکز اشاعت آگرہ کے پتہ سے مل سکتا ہے۔

سالنامہ ادبی دُنیا:۔ ایڈیٹر منصور احمد قیمت سالانہ عہر حسب دستور رسالہ "ادبی دُنیا" نے بھی اپنا سالنامہ شائع کیا ہے۔ ہمیں مسرت ہے۔ کہ مولانا منصور احمد صاحب اِس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔ سالنامہ کیا ہے بقول مولانا شاہد احمد صاحب "دامانِ باغبان وکفِ گلفروش ہے"۔

افسانے۔ ڈرامے۔ علمی، ادبی و تنقیدی مضامین۔ اور منظومات سب اپنی اپنی جگہ رسالہ کی دلچسپیوں میں اضافہ کا موجب ہیں۔ سہ رنگی و یک رنگی آرٹ تصاویر کے علاوہ مضمون نگار حضرات کی تصاویر کا تو شمار ہی نہیں۔

منصور احمد صاحب کا ترجمہ۔ افسانوں میں دولہا دُلھن کی ڈائری اور خوشبو دار خط کامیاب افسانے ہیں۔ "دو مسئلے" قابل قدر ڈرامہ ہے۔ حِصّۂ نظم میں بہترین شعراء کا کلام شامل ہے۔ مضمون بھی ادب کے بہترین شاہکار ہیں۔ ضخامت ۲۳۶ صفحات:۔ منیجر ادبی دُنیا۔ کمرشل بلڈنگس لاہور

پندرہ روزہ شمع:۔ ایک عرصہ سے پنجاب کی فضائیں "شمع" "شمع" کے شور سے گونج رہی تھیں دیواروں پر ہر طرف "شمع" کے قد آدم پوسٹر لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ آخر صبر شکن انتظار کے بعد شمعِ ادب کی ضو فشانی کا وقت آہی پہنچا قلم سے مَس رکھنے والے یہ سُن کر بیحد خوش ہوں گے۔ کہ پندرہ روزہ رسالہ شمع لاہور یکم مارچ سے شائع ہونا شروع ہو گیا ہے۔ پہلے دو نمبروں کی ترتیب و تدوین اُس کے شاندار مستقبل کی آئینہ دار ہے۔ اور ہم اُس کے مضامین اور مستحکم انتظامات کے پیشِ نظر وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ "شمع" فی الحقیقت ہندوستان کی قلمی محفل کی شمع درخشاں ہے۔ رسالے کے پبلشر و پرائٹر شیخ مظہر الدین کنور دہلوی ہیں۔ اور ادارتی فرائض دو قابل قدر سرگرم اور میدان قلم و ادب کے شہسوار حکیم بدر محی الدین اور اختر رضوی سر انجام دے رہے ہیں۔ پانچ چھ رنگین تصاویر بھی اس کی ظاہری زیب و زینت کو دوبالا کر رہی ہیں۔

لسان العصر احسان ابن دانش۔ میرزا ادیب بی۔ اے۔ سراج الدین ظفر بی۔ اے۔ حاجی لق لق۔ الطاف مشہدی ایسے شعراء و ادبا کے نام اس کے ادبی معیار کے شاہد ہیں۔

قلم و ادب کے شائقین کو ضرور اس کی سرپرستی کرنی چاہیے۔ چندہ سالانہ تین روپے فی پرچہ ۲ آنے ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ "شمع" ۴۷ انارکلی لاہور

دیال سنگھ کالج میگزین:- حال ہی میں اس کا سالنامہ شائع ہوا ہے۔ اردو حصّہ کے ایڈیٹر بشیر اثر چکوالی نے تقریباً سو صفحات میں بیش قدر مضامین پیش کر کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ طلبۂ کالج کے علاوہ سید رضا قاسم مختار، سید عبدالحمید عدم ایسے مشاہیر ادب کو کالج میگزین میں جمع کرنا ادارہ کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ ہم اس کامیاب کوشش پر اثر صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

سوزِ ناتمام:- جناب عاشق بٹالوی کے سحر طراز افسانوں کا مجموعہ ہے۔ عاشق صاحب پختہ مشق افسانہ نویس ہیں اور چونکہ اپنے محسوسات اور تجربات و مشاہدات کو افسانوی رنگ میں پیش کر دیتے ہیں۔ اس لئے آپ کے افسانے بہت کچھ واقعیت کا پہلو لئے ہوتے ہیں۔ یہی خوبی آپ کو دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ "میں ہوں اپنی شکست کی آواز" آپ کا شاہکار ہے۔ جو مارچ کے شاہکار میں شائع کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ "زندگی" اور "عذرِ گناہ" وغیرہ بھی کامیاب اور اپنی طرز کے بے مثل افسانے ہیں۔ آخری افسانہ "حیاتِ تازہ" بھی بہترین افسانوں میں سے ہے جسے دوسرا نمبر دیا جا سکتا ہے۔

عاشق صاحب کا اندازِ نگارش پختہ، پیرایۂ بیان دلکش و شگفتہ، اور افسانے عبرت آموز ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ اہلِ ذوق نہایت احترام سے اس مفید و دلچسپ کتاب کا خیر مقدم کریں گے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ، قیمت صرف ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- مینیجر صاحب رسالہ "ادبی دنیا" لاہور۔

ہدیۂ اخلاص بحضرتِ اقبال:- مولوی محمد یحییٰ صاحب اعظم گڑھی کی دو نظموں "خطاب بہ شاعرِ حکیم ہند" اور "شاعرِ مشرق اور فلسفۂ حیات ملّی" کا مجموعہ ہے۔ جسے عبداللطیف صاحب اعظمی نے شائع کیا ہے۔ پہلی نظم علامہ سر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کی حکیمانہ شاعری پر بسیر حاصل تبصرہ ہے جس کے آخر میں کمالِ عقیدت و احترام کے ساتھ ناقد شاعر کی قلم سے ایک "شکوۂ بے اختیار" بھی ہے۔ آخری چند شعر ملاحظہ ہوں:

آج تو کل ملّتِ اسلام کا محبوب ہے
بلکہ مشرق کی تمام اقوام کا محبوب ہے
آج مسجودِ نظر ہے تیرا "فیضِ قلم"
کیوں نہ تڑپے دل اگر اٹھے غلط تیرا قدم
کاش ہو جاتا یہ تجھ پر رازِ پنہاں آشکار
بے سبب ہرگز نہیں یہ نالۂ بے اختیار
اس فغانِ درد کی شاہد محبت ہے تری
اس نوائے تلخ کا باعث عقیدت ہے تری
یہ نہیں تعریض، دل کے درد کا افسانہ ہے
ایک آہِ مضطرب، اک اشکِ بے تابانہ ہے
نقطہ چینی یہ نہیں اک داستانِ غم ہے یہ
آرزوئے ملّتِ اسلام کا ماتم ہے یہ

دوسری نظم شاعر کے پچھلے خیالات و معتقدات میں غیر معمولی انقلاب کا نتیجہ ہے جو شاید بطور کفارۂ گناہ لکھی گئی ہے۔ آخری بند کے چند منتخب شعر پیشِ نظر ہیں:-

آہ اب بھی امتِ خیر البشر ۔ ہے مئے غفلت سے مست و بے خبر
ہے نظامِ دیں سے سرتابی وہی ۔ اب بھی طاری ہے گراں خوابی وہی
جذبۂ احساس و خودداری نہیں ۔ اضطرابِ ذوقِ بیداری نہیں
آہ کیا اس ملّتِ خوابیدہ کو ۔ آہ کیا اس مسلمِ شوریدہ کو
حاجتِ پیغمبر و جبریل ہے ۔ انتظارِ صورِ اسرافیل ہے
اے خدا اس عندلیبِ زار کو ۔ گلشنِ مشرق کے خوش گفتار کو
آرزوئے حال و استقبال کو ۔ ملّتِ اسلام کے اقبال کو
فطرتِ برق و شرر کر دے عطا
اور بھی سوزِ جگر کر دے عطا

شائع حضرات عبداللطیف صاحب اعظمی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ قرول باغ دہلی سے تین آنے کے ٹکٹ بھیج کر منگوا سکتے ہیں۔

مخدوم الملک:- مرتبہ رشید احمد صاحب بہاری۔ یہ کتاب "مخدوم الملک" حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری بہاریؒ کا مفصل تذکرہ ہے جس میں آپ کی پیدائش، تعلیم، ازدواج، بیعت، مجاہدات، عبادات و ریاضات، کرامات وارشادات اور تصنیفات کا حال نہایت تحقیق و تفتیش کے بعد لکھا گیا ہے۔ زبان نہایت صاف اور سادہ ہے۔ حجم ۲۰×۳۰/۱۶ سائز کے ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲ آنے مجلد ۸ آنے (علاوہ محصول ڈاک) ملنے کا پتہ:- رشید اینڈ کمپنی لائبریری ایجنٹس اینڈ واچ ڈیلرس بہار شریف ضلع پٹنہ۔

مختصرات

سر ظفراللہ خاں کی احمدیت نوازی

عداوت اور دشمنی ہر انسان میں ایک قدرتی جذبے کی صورت میں موجود ہے۔ لیکن خدا ترس انسان جذبۂ عداوت کے اظہار میں حق و صداقت کے حدود سے تجاوز نہیں کیا کرتا، خیر القرون کے مسلمان اپنے جانی دشمن کے خلاف کبھی کوئی ایسا الزام منسوب نہیں کرتے تھے جو غلط ہو یا اگر واقعی ہو تو اس کے اظہار میں خوفناک انداز نہیں اختیار کرتے تھے، لیکن وہ خیر القرون کے مسلمان تھے اور وہ مبارک زمانہ ماضی بعید بن چکا ہے۔ اب اخلاق کا معیار بدل گیا ہے۔ عیاری کا نام تدبر اور فریب کاری کا لقب ڈپلومیسی قرار پایا ہے۔ دیانت اور صداقت صرف ڈکشنری کے الفاظ رہ گئے ہیں، خارج میں ان کا مصداق نایاب ہے۔ کسی کے خلاف عداوت کا اظہار اُس پر افترا، بہتان، تہمت اور کم سے کم غلو و مبالغے کے بغیر نہیں کیا جاتا۔

سب جانتے ہیں کہ سر ظفراللہ خاں ابتدا سے احمدی جماعت سے وابستہ ہیں، لیکن جب مسلم آؤٹ لک کے مالک کے خلاف ہائی کورٹ نے مقدمہ چلایا ہے اور کوئی مسلمان وکیل ہائی کورٹ کے خوف سے اس مقدمے کی پیروی کرنے پر آمادہ نہ ہوا تو اسی ظفراللہ خاں نے اپنے مستقبل کو ٹھکرا کر مقدمے کی پیروی کی اور اُن کی مدافعانہ تقریر سے متاثر ہو کر ملک کے مشہور لیڈر حضرت مولٰنا ظفر علی خاں صاحب نے اُن کی پیشانی چومتے ہوئے فرمایا تھا کہ "آپ نے یہ بہت بڑی اسلامی خدمت انجام دی ہے۔"

شیخ محمد امین بار ایٹ لا ر سابق ساگر چند کے مقدمے کی پیروی سے بھی مسلم وکلا نے انکار کر دیا تھا لیکن اسی "کافر" خدا ترس ظفراللہ خاں نے اپنے تمام معاشی مفاد کو نظر انداز کر کے اُن کے مقدمے کی مفت پیروی کی اور انہیں بچایا۔ اس پر تمام اسلامی پریس نے ظفراللہ خاں کی اسلام دوستی کے قصیدے شائع کئے تھے۔

پھر یہ وہی ظفراللہ خاں ہے جو پنجاب کونسل کے لئے اپنے حلقے کے مسلم رائے دہندوں کی جانب سے بلا مقابلہ کونسل میں بھیجا گیا، اسی ظفراللہ خاں نے پنجاب کونسل کی ممبری کے زمانے میں اسلامی مسائل پر دھواں دھار تقریریں کیں اور مسلم رہنما اس کی داد دیتے رہے۔ اسی ظفراللہ خاں کو گول میز کانفرنس کے لئے تمام مسلم ممبران کونسل نے چُنا اور بقول مسز سروجنی نیڈو :-

"ظفراللہ خاں نے سب سے موثر اور شاندار طور پر ہندوستانی مسائل کو گول میز کانفرنس میں پیش کیا۔"

انہیں ظفراللہ خاں کے پیرو مرشد مرزا بشیر الدین محمود احمد امام جماعت احمدیہ قادیان کو کشمیر ایجی ٹیشن کے زمانے میں مسلم کشمیر کمیٹی کا احرار کے ساتھ سر اقبال نے صدر بنایا، لیکن کچھ دنوں سے چند ذاتی مصلحتوں کے پیش نظر بعض سیاسی پارٹیوں نے جب سے احمدیوں کے خلاف شور و شغب کو اپنی پارٹی کا بنیادی مسئلہ بنایا اُس وقت سے ان ظفراللہ خاں میں کیڑے ڈالے جا رہے ہیں اور اُن کے خلاف بہتان تراشی جوش و انہماک کے ساتھ جاری ہے۔

کہا جا رہا ہے کہ ظفراللہ خاں ریلوے میں صرف احمدیوں کو بھرتی کر رہے ہیں۔ ادھر غیر مسلم پریس انہیں متعصب مسلمان سمجھ کر ان کے خلاف زمین و آسمان کے قلابے ملا ہی رہا تھا کیوں کہ وہ لوگ ظفراللہ خاں کی غیر معمولی قابلیت، کاردانی اور نڈر ہو کر مسلمانوں کے حقوق رسانی کے انداز سے واقف ہیں۔ ان کی مخالفت کچھ اس وجہ سے نہ تھی کہ ظفراللہ خاں ختم نبوت کے قائل ہیں یا نہیں۔ وہ تو صحیح طور پر یہ سمجھ چکے تھے کہ ظفراللہ خاں اپنی ممبری کے عہد میں ہندوؤں اور عیسائیوں سے مسلمانوں کے غصب کئے ہوئے حقوق واپس لینے کی اہلیت رکھتا ہے اور وہ ضرور ایسا کرے گا۔ غیر مسلم پریس اور غیر مسلم رہنماؤں کے خطرات کچھ بے جا نہ تھے کیوں کہ سر ظفراللہ خاں نے ریلوے کے تمام محکموں کو بلا رکھا تھا

اور ہر سہ ماہی پر ہر محکمے سے ملازمین کا گوشوارہ طلب کر کے مسلمانوں
کے تناسب پر زور دیتے رہتے تھے۔

لیکن مسلمان رہنماؤں کو دوست دشمن کی تمیز کے لئے
بصیرت ہی نہیں ملی۔ انہوں نے غیر مسلم پریس کی مخالفت کی تائید
کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ظفر اللہ خاں نے مسلم پریس کی معاندانہ تحریروں
سے متاثر ہو کر وائسرائے سے یہ کہہ دیا کہ میں ریلوے ڈیپارٹمنٹ
کو چھوڑنا چاہتا ہوں، کیونکہ جب وہ لوگ جن کی میں خدمت
کر رہا ہوں میری مخالفت پر آمادہ ہیں تو مجھے کیا ضرورت ہے
کہ اپنے وقت اور آرام کو مشکلات میں ڈالوں۔"

آخر کار وہی ہوا جس کا خطرہ تھا کہ ظفر اللہ خاں کے انکار
اور انکار پر اصرار نے وائسرائے کو ریلوے کا محکمہ ایک یورپین
کے سپرد کرنا پڑا۔ اب صرف یہی نہ ہوگا کہ مسلمان ریلوے میں
بدستور سابق ایک لاوارث قوم کی حیثیت میں رہ جائیں گے بلکہ
ہندو اور سکھ بھائی بھی ریلوے میں ظفر اللہ خاں کی عدم موجودگی
کو بری طرح محسوس کریں گے، ریلوے میں پھر یورپین، اینگلو
انڈین اور دیسی عیسائیوں کا دور دورہ ہو جائے گا۔ مڈل پاس
دیسی عیسائی قابل سے قابل ہندو مسلمان اور سکھ امیدواروں
کے مقابلے میں قابل ترجیح قرار دئے جائیں گے۔ ورنہ سر ظفر اللہ خاں
کے عہد ممبری میں اکثر بلند منصب ہندو ریلوے ملازموں کی زبانی
یہ سنا گیا ہے کہ سر ظفر اللہ خاں کے عہد میں کسی غیر مسلم کے ساتھ
بے انصافی کی شکایت پیدا نہیں ہوئی اور یہ کہ وہ یورپین اور انڈین
امیدواروں کے معاملے میں ہندوستانی امیدواروں کی حمایت
کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سر ظفر اللہ خاں ریلوے میں صرف احمدیوں
کو بھرتی کر رہے ہیں۔ کاش اس بارے میں تھوڑی سی زحمت
اٹھا کر ذاتی طور پر معلومات فراہم کی جائیں اور بلا تحقیق مادشما
کے زبانی بیانات کو الہام کا رتبہ دے کر مخالفانہ نعروں سے
آسمان سر پر نہ اٹھایا جاتا۔

اچھا آؤ ذرا ٹھنڈے دل سے اس سوال پر نظر ڈالیں
کہ کیا سر ظفر اللہ خاں دوسروں کا حق چھین کر احمدیوں کو بھرتی
کر رہے ہیں یا یہ الزام ان پر ایک ظالمانہ بہتان ہے۔ اصل
معرکے کا مقام ریلوے بورڈ ہے۔ ریلوے کے اعلیٰ مناصب
کی تنخواہ تین ہزار سے پانچ ہزار تک ہوتی ہے۔

سر ظفر اللہ خاں سے پیشتر ریلوے بورڈ میں برائے نام ایک
مسلمان تھا جو ان کے جاتے ہی ریٹائر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد
ریلوے بورڈ مسلمان افسروں سے بالکل تہی داماں ہو گیا تھا۔
سر ظفر اللہ خاں نے مسلم حقوق کے پیش نظر دو ہزاری اور سہ
ہزاری منصبوں پر حسب ذیل مسلمانوں کا تقرر کرایا:۔

(۱) مسٹر زیڈ، ایچ خاں ڈپٹی ڈائرکٹر۔
(۲) مسٹر الیف، ایم خاں۔ " "
(۳) سید یعقوب شاہ " "
(۴) مسٹر حسن " "
(۵) خواجہ عبید اللہ " "

اور یہ سب کے سب غیر احمدی ہیں۔ انہیں اگر احمدی کہہ
دیا جائے تو شاید ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر دیں گے۔ ان
مناصب پر پہلے یورپین حضرات مسلط تھے۔

خواجہ عبید اللہ کئی یورپین اور ایک قابل ترین احمدی مسٹر صوفی
کو سپرسیڈ کر کے ڈپٹی ڈائرکٹر بنائے گئے ہیں۔

اگر کوئی غیر مسلم یا غیر احمدی مسلمان بھی ریلوے ممبر ہوتا تو
مسٹر صوفی کی لیاقت، کاردانی اور سینیارٹی کے پیش نظر ان کو
یہ منصب دیتا۔ اسی بنا پر مسٹر صوفی بے چارہ یہ کہنے میں حق بجانب
ہے کہ میں نے تو احمدی ہونے کا نقصان اٹھایا ہے۔"

ہر منصف مزاج جس کی بصیرت پر غیر اسلامی عناد کے
پردے نہ پڑے ہوئے ہوں، ان اعلیٰ مناصب پر تمام غیر احمدیوں
کے تقرر کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ سر ظفر اللہ خاں احمدیوں کو بھرتی
کر رہے ہیں۔

اب رہا مسٹر غلام ربانی اختر اور جہلم کے ایک نوجوان احمدی
کا معاملہ جسے سامنے رکھ کر فلک فرسا نعرے لگائے جا رہے
ہیں اس کی حقیقت یہ ہے:

کہ مسٹر اختر سر ظفر اللہ خاں کے جانے سے پہلے اپنے
حسن کارکردگی سے اسسٹنٹ وارڈن بنا دئے گئے تھے۔ یہ
سر جوزف بھور کا عہد تھا۔ معلوم نہیں مسٹر جوزف بھور احمدی ہیں
یا احمدیوں سے انہیں کوئی خاص ہمدردی تھی، ان کے متعلق تو
تمام ہندو مسلم ریلوے ملازمین یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ وہ دیسی

عیسائیوں کے حامی تھے۔

یہ مسٹر غلام ربانی اختر وہ نوجوان ہے جسے ایک بین الاقوامی ٹورسٹ نے غیر معمولی ٹورسٹ خیال کرکے ایک ہزار روپیہ یہ کہہ کر بطور انعام دیا تھا کہ ایسا نوجوان میں نے اپنی سیاحت عالم میں کہیں نہیں دیکھا۔ اس واقعہ سے مسٹر اختر کی ترقی کی نوعیت کا ہر انصاف پسند اندازہ کرسکے گا۔

جہلم کے احمدی کا یہ واقعہ ہے۔

کہ مشہور ہر دلعزیز اخبار نویس سید انعام اللہ شاہ مرحوم، ایڈیٹر "دورِ جدید" کا وہ بھتیجا ہے۔ سید انعام اللہ شاہ کے تعلقات ہر طبقے اور ہر سوسائٹی میں جیسے کچھ تھے اُن سے اخبار بین طبقہ آگاہ ہے۔

اس نوجوان کو سید غلام حسین شاہ نے ایک عارضی جگہ ۳۵ روپے کی دیدی تھی اور پھر انہوں نے ہی اُسے علیحدہ بھی کردیا تھا۔ سر ظفر اللہ خاں بہ حیثیت ریلوے ممبر کسی کو ریلوے میں اعلیٰ منصب تو دلا سکتے تھے، لیکن چھوٹی چھوٹی ملازمتوں سے انہیں دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کو ایک ذاتی تجربہ بھی ہے۔

ایک غیر احمدی نوجوان جو لاہور کے میڈیکل کالج میں تعلیم پا رہا ہے میرے ایک دوست کا لڑکا ہے، میرا یہ دوست اُس کے میڈیکل کالج کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اُس کے کہنے سے میں نے سر ظفر اللہ خاں سے اُس نوجوان کی ملازمت کے لئے سفارش کی۔

سر ظفر اللہ خاں سے میرے بیس سال کے دوستانہ تعلقات ہیں اور اس واقعے سے پہلے میں نے کبھی اُن سے کوئی سفارش نہ کی تھی، اُن کے میرے ایسے تعلقات ہیں کہ اگر سر ظفر اللہ خاں کے اصول کے خلاف نہ ہوتا تو وہ اس نوجوان کو ایجنٹ سے کہہ کر ضرور ملازمت دلا دیتے، لیکن انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے کسی ریلوے ملازم سے خواہ ایجنٹ ہو یا کوئی اور کبھی سفارش نہیں کی، کیونکہ ایسا کرنے کے بعد میں اُن کے فرائض منصبی کے متعلق باز پرس کرنے کی حیثیت میں نہیں رہ سکتا۔ آپ اس نوجوان سے کہیں کہ وہ میڈیکل کالج کی تعلیم میں لگا رہے اور میں اُسے تا ختتام تعلیم اپنی جیب سے وظیفہ دوں گا۔ چنانچہ اُس طالب علم کو ان کی جانب سے ماہ بماہ تعلیمی وظیفہ مل رہا ہے۔

اس ذاتی تجربے کے بعد میں تو کبھی یہ تسلیم نہیں کرسکتا کہ سر ظفر اللہ خاں چھوٹی چھوٹی ملازمتیں احمدیوں کو دلا رہے ہیں جب سے سر ظفر اللہ خاں نے ریلوے ممبری کا چارج دیا ہے غیر احمدی اعلیٰ مسلمان ریلوے افسروں کو میں نے اظہار تاسف کرتے دیکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ریلوے سے اُن کی علیحدگی مسلمان ریلوے ملازمین اور مسلم قوم کو ایک تکلیف دہ احساس کے ساتھ یاد رہے گی۔ بلکہ ہندو اور سکھ حضرات بھی اس علیحدگی کو اسی احساس کے ساتھ یاد کریں گے۔

سر ظفر اللہ خاں احمدی ہیں، اس سے کسی کو انکار نہیں، یہ امر کوئی راز نہیں، وہ ڈنکے کی چوٹ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن جب وہ اسمبلی کے لئے اُمیدوار رہے تھے تو انہوں نے اعلان کیا تھا کہ "میں اگرچہ احمدی ہوں لیکن عام مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت اور حمایت میرا فرض ہوگا، اور کوئی ایسا سوال جو احمدیوں اور غیر احمدیوں میں مابہ الاختلاف ہوگا، اس میں میں عام مسلمانوں کے مفاد کی حمایت کروں گا۔ میں بہ حیثیت ممبر کبھی اپنے آپ کو احمدی خیال نہیں کروں گا۔"

پنجاب کونسل میں ان کی قابلانہ تقریریں مطبوعہ صورت میں موجود ہیں انہیں پڑھ کر ہر شخص یہ اندازہ کرلے گا کہ وہ اپنے عہد پر کس حد تک قائم رہے ہے۔

سر ظفر اللہ خاں کو بعض اخبار نویسوں اور کچھ ذاتی مصالح رکھنے والے رہنماؤں نے مسلمانوں میں ہوّا بنا دیا ہے، لیکن میں ایک غیر احمدی ہوتے ہوئے بھی اپنے بست سالہ تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ ایسا خدا ترس، پابندِ صوم وصلوٰۃ، انصاف دوست، سادہ معاشرت اس اعلیٰ پوزیشن کے آدمیوں میں کوئی دوسرا میری نظر سے نہیں گزرا، اور ان نام نہاد مسلمان لیڈروں میں تو یقیناً کوئی بھی ان صفات کا حامل نہ ہوگا۔

شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ اپنی تنخواہ کا ایک معقول حصّہ خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں۔ بہت سے غیر احمدی مسلمان طلبہ بلکہ غیر مسلم بھی ان کی امداد سے تعلیم پا رہے ہیں اور بہت سے تعلیم ختم کرکے کامیاب زندگی کے مالک بن چکے ہیں۔

غیر احمدی مسلم انجمنوں، تحریکات اور حادثات میں اُن کی امداد ضرور شامل ہوتی ہے۔ لیکن معاندین عن کا مطمح نظر سر ظفر اللہ خاں کو

کا فرِ بے دین، احمدیت نواز ظاہر کرنے تک محدود ہے ۔ سر ظفر اللہ خاں میں دُنیا بھر کے عیوب دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں ۔ ان کے لئے معتبر سے معتبر شہادت، مبین سے مبین ثبوت بھی ظفر اللہ خاں کی بے گناہی کے لئے کافی نہیں ۔ وہ تو بقول شاعرِ عربی :

" وجودُکَ ذنبٌ لا یقاسُ بہٖ ذنبٌ "

ظفر اللہ خاں کے وجود ہی کو گناہ خیال کرتے ہیں ۔

ٹائم اسکیل اور گریڈ بندی

ٹائم اسکیل کا سسٹم جاری نہ ہونے کے سبب استادوں کی حق تلفیاں اب حدِ برداشت سے بڑھ چکی ہیں ۔ ساری تعلیمی فضا پر بیدلی سی چھائی ہوئی ہے ۔

اکثر استاد جن کے نتائج امتحان مسلسل طور پر سو فیصدی نکل رہے ہیں، تعلیم و تدریس کے فن میں ایک ماہرِ تعلیم کا درجہ حاصل کر چکے ہیں مگر پہلے گریڈ کو ختم کر کے سالہا سال تک ترقی کا ناکام انتظار کر کے معاشی زندگی کی مسرتوں سے محروم زندگی بسر کر رہے ہیں، گویا پہلا گریڈ ان کی ترقی کی زندگی تھی اور گریڈ کا اختتام اُس زندگی کی قبر ۔ اور اس قبر کا سوگوار مجاور غریب استاد بن گیا ہے

اس عالم بیدلی کا قدرتی اثر یہ ہو رہا ہے کہ اچھے تعلیمی کارکنوں کی طاقت عمل مفلوج ہو چکی ہے ۔ وہ ایک فرض کی ادائگی کی خاطر تعلیم و تدریس کا کام انجام دے رہے ہیں مسلسل حق تلفیوں نے تعلیم کو اُن کا محبوب مشغلہ نہیں رہنے دیا ۔ افسردہ دل اور پژمردہ زندگی استاد ملک کی قسمت کے آئندہ مالکوں میں بھلا زندگی کا ولولہ کیوں کر پیدا کر سکتے ہیں ۔

آنریبل وزیر تعلیم کو اپنے عہد وزارت کی روشن یادگار کے طور پر ٹائم اسکیل کو جاری کر دینا چاہیئے! تاکہ ہر استاد اپنے معاشی مستقبل سے مطمئن ہو کر اپنے اندر روح عمل کو تازہ رکھ سکے اور اپنے شاگردوں کے دلوں میں جوشِ زندگی پیدا کرنے کی سعی میں لگا رہے ۔

واقعہ یہ ہے کہ جذبۂ بیدلی کے ساتھ مسلسل دماغی جد و جہد استادوں کے دل و دماغ اور صحت پر بہت بُرا اثر ڈال رہی ہے ۔ دوسری اہم ضرورت یہ ہے کہ موجودہ گریڈوں پر فراخ دلانہ نظرِ ثانی کرنی چاہیئے! اِس سلسلے میں سب سے پہلے موجودہ بے امتیازی کو مٹانے کی ضرورت ہے مثلاً :

(۱) السنہ مشرقیہ کے استادوں کا گریڈ صرف انہیں کے لئے مخصوص رہنا چاہیئے ۔

اُن کے ساتھ ڈرل ماسٹروں، ایس وی اور ورنیکولر ٹیچروں کو نتھی کرنا صدر درجے کی بے امتیازی ہے ۔

(۲) ملکی زبانوں کے استادوں کے لئے جُدا گریڈ ہونا چاہیئے جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہو۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم ملکی زبانوں کے استادوں کا گریڈ السنۂ مشرقیہ کے معلموں سے کم رکھنے کے حامی ہیں، مطلق نہیں ۔ بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے ہر مضمون کے استادوں کا گریڈ صرف انہیں کے لئے مخصوص کیا جائے ۔

دوسری بات قابلِ لحاظ یہ ہے کہ گریڈ بندی پر نظر ثانی کرتے ہوئے مشرقی اور ملکی زبانوں کی اہمیت کے مطابق گریڈوں کی قلیل المقداری پر ہمدردانہ غور و تامل اور کریمانہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ انگریز ہمارے ملک کے لئے اتنے مہنگے ثابت نہیں ہوئے جسقدر انگریزی زبان ہمیں مہنگی پڑ رہی ہے کیونکہ انگریزوں نے ہمارے جسموں کو غلام بنایا، لیکن انگریزی نے ہمارے دماغوں ہمارے خیالوں، ہماری شریانوں کے خون کو غلام بنا دیا ہے مگر ہماری بے بصیرتی کس قدر افسوسناک ہے کہ انگریزوں سے زیادہ ہم انگریزی کے پرستار اور پجاری بن گئے ہیں، ہماری ملکی زبان تباہ ہو چکی ہے، ہماری مشرقی زبانیں دم توڑ رہی ہیں اور اس مصیبت کے زیر اثر ہماری ملکی تہذیب اور ہماری مشرقی معاشرت و تمدن فنا کے کنارے آ لگے ہیں ۔

ملکی زبان کا حق تو یہ تھا کہ وہ تمام مضامین کے لئے ذریعۂ تعلیم بنائی جاتی اور اس کا رتبہ وہی قرار دیا جاتا جو اس وقت انگریزی زبان کے سر منڈھ دیا گیا ہے اور انگریزی کو وہ مقام ملتا جس میں ملکی زبانیں اپنی زندگی کے سانس شمار کر رہی ہیں ۔ لیکن محکمہائے تعلیم اور تعلیمی اداروں میں اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے ۔ انگریز حاکم ہیں انہیں خوش کرنے کی ضرورت ۔ اس ضرورت کو ضرور پورا کیجئے، لیکن انہیں خوش رکھنے کے طریقے اور بہت سے ہیں جس حصۂ ملک کے

باشندوں نے سب سے پہلے انگریز حاکم کو یہ سمجھایا کہ
" صاحب آپ کو ملکی زبان سیکھنے کی کچھ ضرورت
نہیں، ہم انگریزی سیکھ کر آپ کو اس زحمت سے
بچائے لیتے ہیں۔"
وہ حصۂ ملک اور اُس کے رہنے والے ہندوستان کے
دامن زندگی کا بدنما داغ ہیں۔
اصل تو یہ ہے کہ ہم اپنی ملکی زبان کو بھول کر اپنے
آپ کو بھول چکے ہیں۔
خیر یہ افتاد بھی اہل ملک کی قسمت میں تھی لیکن سوال یہ ہے
کہ اب جب کہ صوبے آزاد ہو رہے ہیں، انگریز حاکموں کو یہ اصرار
بھی نہیں کہ تم انگریزی کو اپنی دماغی بیماری بنائے رکھو ادھر غیر
زبان میں تعلیم دل و دماغ کو ماؤف کر چکی ہے ۔ آخر کب
تک اپنے معصوم بچوں اور نوجوانوں کے دماغوں پر اس بارگراں
کو مسلط رکھا جائے گا۔ کب وقت آئے گا کہ ہماری تعلیم ایک
ایسی زبان کی زنجیروں سے آزاد ہوگی جسے بولنے اور پڑھنے کے
لئے جغرافی حدود کی آب و ہوا ہمارے کام و زبان کو تیار نہیں کر
سکتی۔

ہندوستانی بچہ اپنی تعلیمی نشو و نما کے عروج تک مضامین
کو سمجھ کر پڑھنے کی بجائے انگریزی زبان کے اسپیلنگ اور اُس
کی اجنبی ساخت سے اُلجھا رہتا ہے اور ساری تعلیمی زندگی اس
پر نثار کرنے کے بعد بھی صحت کے ساتھ اس کے بولنے، پڑھنے
اور لکھنے پر قدرت نہیں پاتا۔
مختصر یہ کہ ملکی زبان کی تعلیمی اہمیت کو محسوس کرنے کا وقت
آگیا ہے بلکہ سچ پوچھئے تو یہ وقت جا چکا ہے۔ ملکی زبان اور ادبیات
سے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ یکسر ناآشنا ہو رہا ہے اور اسی وجہ سے
محکمہائے تعلیم کے افسران اور تعلیمی ادارات کے ارباب نظم و
نسق ملکی زبان سے ناآشنا ہونے کے سبب اس کی ترویج و تعلیم
کی جانب بھی توجہ نہیں کرتے۔ ضرورت ہے کہ ماہرین تعلیم ملکی زبان کو
ذریعۂ تعلیم بنانے کا اقدام کریں اور عثمانیہ یونیورسٹی کے کامیاب
تجربے کو اپنے ادارں کے لئے دلیل راہ بنائیں۔ اس وقت ملکی
زبان کے استاد بے طرح معاشی مشکلات میں مبتلا ہیں اور
چونکہ ملکی زبان تعلیمات میں ایک غیر ضروری حیثیت میں زندہ ہے

اس لئے ملکی زبان کے اساتذہ بھی اپنی بے حیثیتی سے نالاں زندگی
گزار رہے ہیں۔

مولوی فاضل، شاستری اور منشی فاضل

یہ حقیقت شاید فارسی کے اساتذہ کے لئے تلخ ثابت ہو
مگر اس کے حقیقت ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عربی اور
سنسکرت فارسی کے مقابلے میں مشکل ترین زبانیں ہیں۔ اس کے علاوہ
منشی فاضل کا سارا نصاب صرف ادبی ہے۔ لیکن مولوی فاضل اور
شاستری کے نصاب مختلف علوم و فنون پر حاوی ہیں۔
منشی فاضل کے امیدواروں میں ۵۰ فی صدی وہ لوگ ہوتے
ہیں جنہوں نے اپنی تعلیمی زندگی میں کبھی فارسی کو ہاتھ نہیں لگایا لیکن
وہ انگلش میں بی۔ اے بن جانے کی سہولت حاصل کرنے کے
لئے پانچ چار ماہ میں درسی کتابوں کو رٹ رٹا کر منشی فاضل کے امتحان
میں شامل ہو جاتے ہیں اور ان کی کامیابی کا اوسط کسی طرح اُن
امیدواروں کی اوسط کامیابی سے کم نہیں ہوتا جو شروع سے فارسی
پڑھتے آئے ہیں۔ مختلف دفاتر کے کلرک جن کی طبیعت ریاضی
سے مانوس نہ ہو سکی اور اس لئے انٹرنس میں کامیاب نہ ہو سکے۔
اپنی دفتری ملازمت کی ترقی کے لئے چھ ماہ کی چھٹی لے کر منشی
فاضل کے امتحان میں شریک ہو جاتے ہیں اور کامیابی کے بعد پھر
تین سال میں صرف انگلش کا امتحان دے کر انٹرنس سے ایف۔ اے
اور ایف۔ اے سے بی۔ اے بن جاتے ہیں اور اس طرح دفاتر میں گریجوئیٹ
کلرکوں کے حقوق ترقی میں شامل ہونے کا حق حاصل کر لیتے ہیں۔
لیکن آپ نے یہ کبھی نہ سنا ہوگا کہ کسی کلرک نے چھ ماہ میں مولوی
فاضل کی تیاری کر کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے اور اس
راستے سے بی۔ اے بنا ہے۔ کیوں کہ مولوی فاضل عربی کا آخری
اور مشکل ترین امتحان ہے۔ عربی اور فارسی میں بہ حیثیت دقت
و اشکال ایک اور پچاس کی نسبت ہے۔ اس سے کم ہرگز نہیں
پھر مولوی فاضل کے نصاب میں فقہ، حدیث، تفسیر، منطق، فلسفہ
جیسے مشکل علوم بھی داخل ہیں جو زبان سے قطع نظر ذاتی طور پر
شروع سے پڑھنے پڑتے ہیں۔
یہی حال سنسکرت کا ہے کہ وہ عربی کی برابر بلکہ شاید اُس
سے بھی دشوار تر زبان ہے۔

لیکن محکمہائے تعلیم مولوی فاضل، منشی فاضل اور شاستری کو مساوی خیال کر کے انہیں مساوی درجہ بخش رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی بے امتیازی ہے اور اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ افسران تعلیم میں عربی، سنسکرت اور فارسی کی باہمی مسافت و بعد اور نشیب و فراز کا صحیح اندازہ کرنے والے نایاب ہیں۔

محکمۂ تعلیم کو اس بارے میں عربی اور سنسکرت کے حقوق امتیاز کو قائم کرنا چاہیئے!

راقم الحروف سنسکرت سے واقف نہیں، سنسکرت کے متعلق اس کا علم سماعی ہے۔ البتہ عربی اور فارسی کے دونوں آخری امتحان پاس کر چکا ہے۔ مجھے جامعۂ دیوبند میں درس نظامیہ کی تکمیل کرنے کے بعد بھی مولوی فاضل کے امتحان کی تیاری میں ایک سال لگانے پر مجبور ہونا پڑا تھا، لیکن منشی فاضل کا امتحان صرف ۱۴ دن کے مطالعے کے بعد پاس کر لیا اور ۸۷ کامیاب امیدواروں میں چوتھے نمبر پر پاس ہوا۔ حالانکہ عہد طفلی میں گلستاں کے چار باب تک فارسی پڑھی تھی جو نہ پڑھنے کے برابر سمجھی جا سکتی ہے لیکن چونکہ فارسی زبان میں عربی کے نوّے فیصدی الفاظ آتے ہیں، اس لئے عربی کے زور پہ یہ امتحان ۱۴ دن کی محنت سے پاس کر لیا۔

خلاصہ یہ کہ اس مسئلے پر مجھے رہنمائی کا حق حاصل ہے۔

پنجاب یونیورسٹی میں فارسی کو عربی کی مساوی حیثیت گزشتہ سولہ سال ہوئے ملی تھی ورنہ اس سے پہلے عربی اور سنسکرت کا تو مساوی رتبہ تھا ان کا ہر پرچہ ۱۵۰ نمبر کا ہوتا تھا اور فارسی کا ۱۲۰ کا۔ فارسی کو عربی کے ہمرتبہ بنانے میں فرقہ وارانہ جذبات سے زیادہ کام لیا گیا۔ ورنہ ان دونوں کو مساوی حیثیت دینا انصاف اور علم دونوں کے خلاف ہے۔

ایجوکیشنل کانفرنس

گزشتہ ۲۴ - ۲۵ اپریل کو لاہور میں علامہ عبداللہ یوسف علی کی صدارت میں پنجاب ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔

اس کے زیر اثر پنجاب نان گورنمنٹ سکولز فیڈریشن، پنجاب ٹیچرز ایسوسی ایشن، پنجاب ایس، سی، ایس ایسوسی ایشن کے اجلاس بھی ہوئے۔ ان تعلیمی انجمنوں کے اجلاس میں پنجاب کے ہیڈ ماسٹر، ماہرین تعلیم اور عام اساتذہ کثرت سے شامل ہوئے۔

حسب دستور بہت سی تجاویز منظور ہوئیں۔ تجاویز پر دھواں دھار تقریریں بھی ہوتی رہیں۔ سب سے اہم تجویز جو اس اجلاس میں گرماگرم بحثوں کے بعد منظور ہوئی یہ تھی کہ:

"تعلیمی کانفرنس کا یہ نمائندہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ انٹرنس کے تمام مضامین (انگلش کے سوا) ورنیکولر میں پڑھائے جایا کریں"

اس تجویز پر بعض دوربین اساتذہ نے مطالبہ کیا کہ تجویز میں ورنیکولر کی بجائے اردو کا لفظ رکھا جائے تاکہ آئندہ یہ تجویز پولیٹکل ہنگامے برپا کر کے صوبے کے اتحاد کو خطرے میں ڈالنے کا باعث نہ بنے۔

اس پر لالہ برج لال انسپکٹر آریہ سکولز پنجاب سیکرٹری فیڈریشن نے معترضوں کو اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا کہ:

"مڈل کی جماعتوں میں تمام مضامین اردو میں پڑھائے جاتے ہیں، وہاں بھی ورنیکولر سے اردو ہی مراد تھی اور اس تجویز میں بھی یہی مراد ہوگی۔ اس لئے ورنیکولر کے لفظ کو اردو کے لفظ سے تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔"

لیکن معترضین کی اس بیان سے تسلی نہیں ہوئی، اور سچ یہ ہے کہ اُن کے خدشات بے جا نہ تھے۔ آجکل پنجاب کے سوا سارے ملک میں اردو زبان کے خلاف متحدہ اور سرگرم کوششیں جاری ہیں مبادا ورنیکولر کا لفظ اپنی عمومیت معنی کے لحاظ سے شر انگیز عناصر کو بے جا فائدہ اٹھانے کے مواقع بہم پہنچائے۔

پنجاب کی تعلیمی زبان ابتدا سے اردو چلی آتی ہے کہ اردو درحقیقت پنجابی ہی کی ایک لٹریری شکل ہے۔

اس تجویز میں ورنیکولر کا لفظ بہت سے خطرات کا حامل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اردو ہندی کے سوال اٹھانے والے حضرات اس میں ورنیکولر کو اردو ہندی اور گورمکھی سے یکساں طور پر تعبیر کرنے لگیں اور ملکی خلفشار میں ایک اور تنازعے کی بنیاد پڑ جائے۔

لالہ برج لال سیکرٹری نے اگرچہ اطمینان دلانے کی کوشش کی، لیکن جو لوگ حالات کی رفتار اور انقلاب کا اندازہ رکھتے ہیں، اُن کا یہ خدشہ بے جا نہیں کہ آئندہ اس لفظ سے غلط فائدہ اٹھانے کی سعی کی جائے گی۔

نامرادی کو خوشی کے دلنشیں سانچے میں ڈھال! مشق کر گتکا پھری کی، ہاتھ چاقو کے نکال!
زمزمے گا! رقص کر! بازی بچھا! بربط سنبھال! بڑھ گیا تیری نشاطِ عمر میں ایک اور سال!

کس لیے ہر وقت تجھ سے خوش رہا جاتا نہیں
دم غنیمت جان گزرا وقت ہاتھ آتا نہیں

آج تیری زندگی پر عیش کا در باز ہے ہوسٹل کی شان گھر کی آن سے ممتاز ہے
راگ سے بھرپور ایام طرب کا ساز ہے غم سے آزادی ہے سامانِ نیاز و ناز ہے

ورنہ بی۔ اے کی سند آغاز ہے آفات کا
اس سحر کا نور ہر چشمہ ہے کالی رات کا

ہوسٹل میں فکر دل کا میہماں ہوتا نہیں غم یہاں کوئی نصیبِ دشمناں ہوتا نہیں
اس زمیں پر رعب و داب آسماں ہوتا نہیں چھوڑ کر کالج کبھی انساں جواں ہوتا نہیں

سینہ خالی، دل پریشاں خشک لب آنکھیں اجاڑ
ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں مصیبت کے پہاڑ

ہے کہیں شادی کا جھنجٹ اور کہیں دشمن سے چوٹ سبحہ و زنّار کے حربے، نکو کاری کی اوٹ
نوکری، بیماریاں، منت، سفر، اولاد، ووٹ الغرض بگلے کی صورت انگ اُجلا من میں کھوٹ

خود بخود جب طمع کے میداں میں اُٹھتے ہیں قدم
آدمیت توڑ دیتی ہے پریشانی میں دم

مسخ چہرہ ہو کے رہتا ہے ریا کا اشتہار　　دل کی کالک صاف ہوتی ہے جبیں سے آشکار
دیدۂ خود بیں میں رہتا ہے شرارت کا خمار　　جھوٹ کے بھپکوں سے ہو جاتا ہے سینہ تنگ و تار
بندشِ اخلاق قلبِ جیلہ جُو سہتا نہیں
آدمی پھر فی الحقیقت آدمی رہتا نہیں

ایسے ہوتے ہیں بہت کم خوش نصیب و کامگار　　جن کو مِل جاتی ہے قسمت سے فضائے خوشگوار
ہاں کبھی کوشش کے اندھے تیر کر جاتے ہیں وار　　بے زری کو ورنہ کب ملتا ہے زرداری میں بار
بھوک میں کچھ ضبط کی تلقین ہو سکتی نہیں
ڈگریوں کو چاٹ کر تسکین ہو سکتی نہیں

احسان دانش

رباعیات

شکوۂ احباب

احباب تو جینے نہیں دیتے یا رب!
دل چاک ہے، سینے نہیں دیتے یا رب!
نادانوں کا التفات، اللہ اللہ
اب بھی مجھے پینے نہیں دیتے یا رب!

ذوقِ گناہ

کٹ جائے یہ عمر آہ کرتے کرتے
فردِ ہستی سیاہ کرتے کرتے
رحمت، مری ہمت کو بڑھا دے یا رب!
تھک جاؤں میں جب گناہ کرتے کرتے

میرزا دانی جالندھری

کرنول کے آخری تاجدار کی حکومت سے بیدخلی کے اسباب

(گذشتہ سے پیوستہ)

معلوم ہوتا ہے کہ کمیشن اور حکومت وقت نے اس اہم پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا کہ نواب کو ہر قسم کا حق حاصل تھا کہ وہ ایک منظم فوج ہر وقت تیار رکھے، اور ضرورت کے وقت اپنی حفاظت یا حکومت کمپنی کی امداد کرے، نواب کا یہ فعل صرف اسی تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کے آبا و اجداد نے بھی ایک سے زیادہ مواقع پر اپنی فوج سے حکومت کی امداد کی تھی صرف یہی نہیں بلکہ شاہی خاندان کے افراد کو ان جنگوں میں حصہ لینے کے لئے بھجوایا تھا۔ چنانچہ لارڈ منٹو نے ذیل کے خط مورخہ ۲۷ رفروری ۱۸۱۰ء میں ان خدمات کا اعتراف کیا ہے :۔

"آپ کے مذکورہ صدر قاصد نے کچھ دنوں پہلے مجھ سے کہا تھا کہ کرنل کلوز کی خواہش کے مطابق کیپٹن سیڈنہام نے آپ کی فوجیں جالنہ پور کی طرف اس غرض سے روانہ کر دی ہیں کہ وہ کرنل مونٹروز کے تحت کی برطانوی افواج کے ساتھ مل جائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا یعنی آپ کی فوجیں ہماری فوجوں کے ساتھ ساتھ کوچ کر رہی ہیں ۔ آپ نے جس گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور معرضِ بحث افواج کے روانہ کرنے میں جس عجلت سے کام لیا ہے اس سے آپ کے اور برطانوی حکومت کے گہرے تعلقات کا صحیح صحیح پتہ چلتا ہے نیز یہ کہ ایسے افعال سے برطانوی تاج سے آپ کی حقیقی وفاداری کا بھی کافی ثبوت ملتا ہے ۔ آپ کا یہ قابلِ تعریف کارنامہ میرے لئے بیحد مسرت اور طمانیت کا باعث ہوا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کرنل مونٹروز آپ کے بھائی کے شایان شان سلوک کرنے میں کبھی دریغ نہ کریں گے ۔ بلکہ انہیں ہمیشہ آپ کے خانوادہ شاہی کے خاص آداب اور حکومت برطانیہ کے ساتھ آپکے پُر خلوص دوستانہ تعلقات کا خیال رہے گا۔"

حکومت کو ہر وقت اختیار حاصل تھا کہ جب چاہے نواب کی افواج کو گھٹا دے بڑھا دے، توپ خانہ کو توڑ کر پرزے پرزے کر دے جنگ کے دوسرے سازوسامان کو برباد کر دے اور آئندہ کے لئے نواب کے ملک میں اسلحہ اور بارود گولی کی درآمد کی قطعی طور پر ممانعت کر دے۔ لیکن یہ سب کچھ صرف اس وقت زیبا تھا جب کہ نواب حکومت کے احکام کی تعمیل میں لیت ولعل برتتا یا برطانوی تاج کے اقتداری اعلیٰ کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا، ان صورتوں میں نواب کا تخت سے ہٹا دیا جانا واجبی ہوتا مگر ہمیں تعجب ہوتا ہے جب یہ دیکھتے ہیں کہ نواب کا طرزِ عمل بالکل وفادارانہ رہا اور اس کے باوجود اُس کو بُرے دن دیکھنے پڑے ، اس نے کمشنروں کو اپنے پوشیدہ اسلحہ کے دکھانے میں ذرہ برابر بھی تساہل نہ کیا۔ اس کے علاوہ قلعہ اور پوری سلطنت کو حسب ایمائے کمپنی کمشنروں کے آتے ہی خود بخود حوالے کر دیا تاکہ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور اس وقت تک بالکل خاموشی کے ساتھ علاقہ زورا پور میں گوشہ نشیں رہا۔ جب تک کمشنروں نے حکومت کی ہدایات کے مطابق پورے الزامات کی تحقیقات نہ کر لی ۔ اس کے باوجود حکومت کی پالیسی توقع کے خلاف رہی، حکومت کا اصل مقصد اپنی سلطنت کو وسعت دینا تھا۔ اس لئے اس نے کرنول کی جاگیر کو اپنی سلطنت سے ملحق کر لیا۔ حالانکہ حکومت کا یہ طرزِ عمل خود اس کے بیانات اور اظہارات کے خلاف تھا۔ چنانچہ ایک خط نمبر ۴۴۳ مورخہ ۷ راکتوبر ۱۸۳۹ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے :۔

"فضیلت مآب کو آپ کی رائے سے کامل اتفاق ہے۔ اگر نواب نے کرنول کا قلعہ بلاتکلف حوالہ کر دیا ہے اور ہمارے احکامات اور شرائط کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہے ۔ تو ایسی صورت میں اس امر کی چنداں ضرورت نہیں کہ فی الحال اس کی سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے ۔"

ان واقعات کے بعد ہم فوجی اشیاء کی خفیہ فراہمی کے مسئلہ کو لیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ بظاہر یہ فعل نواب کی اہم ترین غلطی اور زبردست عہد شکنی معلوم ہوتا ہے، لیکن جب ہم واقعہ کی تفصیلات میں پہنچ کر کمشنروں کی رپورٹ پر غور کرتے ہیں تو ہم کو صریح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نواب نے یہ حرکت عمداً یا کسی خاص ارادہ یا بُری نیت سے نہیں کی تھی، بلکہ پوری کارروائی اس کے دماغی فتور کا نتیجہ تھی، اس لئے کہ ایک سازشی انسان جس نے بڑے مقاصد کے تحت جنگی ساز و سامان مہیا کیا ہو اس طرح غیر محفوظ طریقہ پر ہرگز نہیں رکھ سکتا تھا جس کی اطلاع ہر کس و ناکس کو ہو جائے۔ نواب نے جو بھی ذخیرہ فراہم کیا تھا وہ سب کچھ معمولی حفاظت کے ساتھ کھلے مقام پر پڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ نواب کا ارادہ واقعی وہی تھا جس کا الزام اس پر رکھا گیا تھا۔ تو ایسی صورت میں ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ کیا نواب کو فوج کی ضرورت نہیں تھی؟ کیا اس کا ارادہ اس تمام خفیہ ذخیرہ کے ساتھ بذاتِ خود یا چند سپاہیوں کے ساتھ کسی دشمن کا مقابلہ کرنا تھا؟ معمولی عقل کا انسان بھی اس امر کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہے گا کہ اسلحہ اور سپاہی لازم و ملزوم ہیں۔ اگر نواب کو لڑائی ہی مقصود تھی تو وہ سپاہی بھی ساتھ ساتھ جمع کرتا تاکہ فوجی قوت مکمل ہو سکے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نواب غلام رسول خاں نے اپنی فوج کو منظم کرنے کی کبھی تکلیف ہی گوارا کی اور نہ اس کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی، تنظیم کا سوال تو خاص اہمیت رکھتا ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ نواب مذکور نے اپنے آخری دورِ حکومت تک کسی وقت بھی پابندی سے تنخواہیں تک تقسیم کرنے کی کوشش نہیں کی، جب کبھی ان غریبوں کی حالت زار پر رحم آ جاتا تو تھوڑا بہت اناج یا اس قسم کی اور چیزیں تقسیم کروا دیتا۔ جب فوجیوں کی یہ حالت ہو تو اس پر ہم فوج کی باقاعدگی کا اندازہ کر سکتے ہیں اور بعض روایات کے مطابق یہ کہہ سکتے ہیں کہ نواب کی فوج کی بندوقوں کی ایک نال ہی سیدھی تھی اور نہ ایک توپ ہی ٹھیک حالت میں تھی۔ بارود صرف روزانہ سلامی کے لئے استعمال ہوتی تھی اس کے بعد اللہ اللہ خیر صلّا کا حساب تھا۔ اگر ضرورت پڑے تو بارود خانہ سے ایک سیر بارود زائد نہیں نکل سکتی تھی۔ ذیل کے ایک اقتباس عدد ۹۰ مورخہ ۲۲ فروری ۱۸۴۰ء (Minutes of Consultation) سے ہمارے بیان کی تصدیق ہو جائے گی

"قابلِ احترام گورنران کونسل کو سابقہ خط والی رائے سے پورا پورا اتفاق ہے اور قلعہ کرنول سے جو بارود برآمد ہوئی ہے اس کی کچھ مقدار پتھروں کے اڑانے کان کنی کے تجربوں، صبح اور شام توپوں کے دغنے اور کچھ حصہ فوج کے استعمال کے لئے حاصل کرنے کا آپ کو مجاز گردانا جاتا ہے اور باقی حصہ اگر کرنول میں خریدار پیدا ہوں تو فروخت کر دیا جائے ورنہ جلا دیا جائے۔"

یہ اسی بارود کی مقدار کا ذکر ہے جو صرف نواب کی سلامی کی توپوں کے لئے روزانہ استعمال ہوتی تھی۔ یہ ذخیرہ سال کا سال خرید لیا جاتا تھا، اس کے علاوہ صبح اور شام کی توپوں کے لئے ایک مقررہ مقدار ہر سال لے لی جاتی تھی۔ ان دو ذخیروں کے علاوہ تیسرے کسی غیر معمولی ذخیرہ کا کہیں بھی ذکر نہیں آیا۔

لہٰذا ایک ایسی فوج جس کے پاس بارود گولی تک کافی مقدار میں نہ ہو وہ کسی دشمن کا تو کیا ڈاکوؤں اور لٹیروں تک کا مقابلہ نہیں کر سکتی، قلعہ کی دیواریں خستہ حال اور غیر محفوظ حالت میں پڑی ہوئی تھیں قلعہ کی حفاظت کے خیال کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ فصیل کے بیرونی حصہ پر ایک خاص مقام سے نہایت چوڑی سیڑھیوں کا سلسلہ انتہائے دیوار تک تھا جس کے ذریعہ ایک بھاری فوج صرف چند منٹ میں قلعہ کے اندر بلا کسی مداخلت کے داخل ہو سکتی تھی۔ اس قسم کے حالات سے ہم سوائے اس کے اور کیا نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ نواب غلام رسول خاں کو اسلحہ جمع کرنے کا مرض تھا، جیسا کہ ہم نے پیشتر بارہا کہا ہے کہ اس حرکت سے نواب کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ نواب کی مرغ بازی، عمدہ عمدہ قسم کے اور اعلیٰ نسل کے مرغ جمع کرنے کا انہماک اور ان کو لڑانے کا شوق درجہ کمال کو پہنچنے کے باعث ضرب المثل کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ پس اسلحہ جمع کرنے کے شوق کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ مرغ بازی اور فراہمی اسلحہ کا شوق مساویانہ درجہ رکھتے تھے۔ لیکن یہ بات بھی نہ بھولنی چاہیئے کہ تعمیر امکنہ اور باغبانی کا ذوق بھی کچھ کم نہ تھا، یہ تمام حرکتیں اس کے جنون کا کافی ثبوت تھیں۔ اس کی بیوقوفی کی انتہا کے ثبوت میں ایک اہم واقعہ پیش کیا جاتا ہے کہ اس نے چند روز تک ایسے مقام پر قیام کیا جس کے اطراف بارود کے خزانہ تھے اور وہ بھی بالکل غیر محفوظ حالت میں۔ اب آپ خود بتائیں

کہ یہ پگلے پن کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے۔" اب جنون کے زمانہ میں بھی اس نے کسی وقت اپنے جمع کردہ اسلحہ کے بل بوتے پر اس قسم کا خیال تک ظاہر نہیں کیا کہ وہ برطانوی حکومت سے لڑنا چاہتا ہے یا اس پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لڑائی یا جنگ سے غیر ارادہ کا کافی ثبوت اسی وقت مل جاتا ہے جب کمشنز کرنول کے علاقہ میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کے شہر میں داخل ہونے پر نواب نے پرتپاک خیر مقدم کے لئے اپنے امراء روانہ کئے۔ جب وہ لوگ محل میں آئے تو خود نواب نے آگے بڑھ کر جوشِ عقیدت اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور انہیں شان و شوکت سے لاکر اپنی گدی پر بٹھایا۔ جب انہوں نے حکومت کے احکام سنائے تو بغیر کسی اعتراض کے خاموشی کے ساتھ شہر اور ملک کرنول کو ان کے حوالے کر کے خود ایک دور مقام پر جاکر ٹھہر گیا۔ تاکہ کمشنروں کو تحقیقات میں کسی قسم کی مداخلت کا اندیشہ نہ ہو۔ صرف یہی نہیں کیا بلکہ انہیں تحقیقات کے دوران میں ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ غلام رسول خاں اگرچہ اپنی جگہ پاگل، مجنوں اور بے وقوف انسان تھا لیکن وہ لڑاکو، سازشی یا حکومت برطانیہ کا نافرماں بردار نواب نہیں تھا بلکہ اس کی بجائے کمشنروں کی تحقیق و تلاش میں وہ ایک مستقل مزاج اور حکومت برطانیہ کا یار وفادار نیز ایک ایسا غیر جانب دار شخص ثابت ہوا جس کو کسی نواب یا رئیس سلطنت سے برطانیہ کے خلاف سازشی خط و کتابت کا مطلق تعلق نہیں۔

اب ہمیں ذرا اپنے موضوع سے ہٹ کر نوابان کرناٹک کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ تاکہ ہم یہ معلوم کرسکیں کہ ان نوابوں کے تعلقات حکومت برطانیہ اور نوابان کرنول کے ساتھ کیسے تھے۔

ایک سے زائد موقع پر علاقہ کرناٹک میں کمپنی کو تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور شورشوں کے وقت امن قائم کرنے میں بہت سی مشکلوں سے دوچار بھی ہونا پڑا۔ اس کے علاوہ نوابان کرناٹک کے دور حکومت میں رعایا سے محاصل وصول کرنے یا نوابان کرناٹک اور ان کی باج گزار ریاستوں مثل ٹانجور کے جھگڑے چکانے اور سب سے بڑھ کر ان ریاستوں سے کمپنی کو خود اپنا قرض وصول کرنے میں کتنی تکلیفیں سہنی نہیں پڑیں۔ یہ جملہ ریاستوں کے والی ایک نہیں بلکہ کئی مرتبہ کمپنی اور برطانوی قوم کی نظروں میں جھوٹے ٹھہر چکے ہیں۔ محمد علی خاں یا عمدۃ الامراء کی اطاعت پذیری کا سوال ہمیشہ معرض بحث میں رہا ہے حالانکہ ان دونوں نے جو کبھی شان و شوکت یا قوت حاصل کی اور آخر وقت تک اپنے حلیفوں سے بچتے رہے وہ محض کمپنی کی مہربانی کا طفیل تھا۔ محمد علی کے بھائی محفوظ خاں اور اس کے والد انوار الدین خاں نے انگریزوں کو وقتاً فوقتاً مختلف قسم کی جو تکلیفیں پہنچائی ہیں اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (Manual of Carnatic & Karnool) کا پہلا حصّہ۔ اس کتاب میں نوابان کرناٹک کے سازشی اور ظالمانہ کردار کا پورا پورا ثبوت ملے گا لیکن کمپنی نے ان کو بُری نظر تک سے نہیں دیکھا۔ کجا لنا تو کس کو ایک بے گناہ اور معصوم خیال نواب غلام رسول خاں کو جس پر بلاوجہ عائد کردہ الزامات کی تحقیق اور برّیت کے باوجود حکومت نے ایسی مصیبت نازل کی کہ اس کے خاندان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھکانے لگا کر چھوڑا۔ کمپنی یہ جانتی تھی کہ جنوبی ہند میں حکومت برطانیہ کے جانی دشمن ٹیپو سلطان کے ساتھ عمدۃ الامراء کی سازشی مراسلت جاری تھی۔ حکومت کے لئے اس سے بڑھ کر قابلِ اعتراض چیز کیا ہوسکتی تھی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جانتے ہوئے بھی حکومت نے نواب موصوف سے کوئی بازپرس تک نہ کی، اس مراسلت کا اصل مواد سرنگاپٹم کی تباہی کے بعد ہاتھ آیا۔ جس کا کچھ اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"عمدۃ الامراء جس نے اپنے باپ محمد علی کے انتقال کے بعد ۱۷۹۵ء میں حکومت کی باگ ہاتھ میں لی، شروع ہی سے کمپنی سے متنفر تھا اور کمپنی کے ساتھ جو بھی وعدے کئے تھے ان کے پورا کرنے کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ حتیٰ کہ ٹیپو سلطان اور کمپنی کی آخری فیصلہ کُن جنگ کے موقعہ پر بھی اس نے موعودہ ساز و سامان کی سربراہی روک لی جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کمپنی کے ساتھ اس کی نیت صاف نہیں ہے۔ سرنگاپٹم کی تسخیر کے بالکل ہی بعد سلطان کے سرکاری کاغذات میں اس قسم کے مراسلے بھی برآمد ہوئے جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ علاقہ ارکاٹ کے دونوں والوں سے ٹیپو سلطان کی خفیہ مراسلت تھی۔ اس مراسلت کا کچھ حصّہ بے معنی سا تھا لیکن اس کا حل سلطان کے بعض سرکاری کاغذوں میں موجود تھا جس کا پیچ در پیچ مطلب انگریزوں اور ان کے حلیفوں کے نام تھے، یعنی انگریزوں کے لئے "تازہ وارد" کے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے اور سرکار نظام کو "ہیچ" یعنی کچھ بھی نہیں اور مرہٹوں کو "پوچ" یعنے حقیر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

اس میں شک نہیں ان دستاویزات سے اس سے زیادہ اہمیت کا اور کوئی خاص انکشاف نہ ہوسکا لیکن چونکہ یہ مراسلت کمپنی کے ایک دشمن کے ساتھ تھی اور نواب کا یہ عمل ۱۷۹۲ء کے ایک معاہدہ کے خلاف اشتعال انگیز شکل پر مبنی تھا لہذا ایسی صورت میں اگر کمپنی نواب موصوف کو تخت سے علیحدہ بھی کر دیتی تو اس کا یہ عمل حق اور انصاف کی پالیسی پر مبنی ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے قابل اعتراض اور اہم معاملہ میں گورنر جنرل کا طرز عمل وہی رہا جو پہلے تھا۔ شاید آخر میں گورنر جنرل کی طرف سے کوئی بازپرس ہونے والی تھی، لیکن نواب کی طویل علالت نے اس مسئلہ کو لیت و لعل میں ڈال دیا، اور کمپنی نے بھی اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔

۱۵ر جولائی ۱۸۰۱ء کو نواب عمدۃ الامراء کا انتقال ہو گیا۔ نواب کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا علی حسین تخت پر بیٹھا، اس نوجوان شہزادہ کے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی درپردہ یہ کوشش شروع ہو گئی۔ کہ کسی طرح اس کو راضی کر لیا جائے کہ اپنی حکومت کمپنی کی حکومت سے ملحق کر دے تاکہ کرناٹک کا ایک بڑا علاقہ انگریزی اقتدار کے تحت آجائے، لیکن اس قضیہ کے طے ہونے سے قبل اس شخص کی نااہلیت اور مملکت کی امور میں ناقابلیت نے اس کو تخت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ اس کا جانشین خود اس کا چچازاد بھائی عظیم الدولہ ہوا۔ اس شخص کے نواب بنانے میں انگریزوں ہی کا ہاتھ تھا۔ کمپنی نے پہلے پہل اس کو اپنا ہم خیال بنالیا اور پھر حکومت کا لالچ دے کر اس سے یہ شرط منظور کرالی کہ سالانہ ایک معقول معاوضہ اور خطاب نوابی کے صلہ میں وہ کرناٹک کا پورا علاقہ انگریزی حکومت کے اقتدار میں ہمیشہ کے لئے شامل کر دیگا۔"

ہم نے دیکھ لیا کہ عظیم الدولہ کو حکومت کن شرائط کے تحت ملی تھی، لیکن اس کے باوجود تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ برسر اقتدار ہونے کے بعد نواب مذکور نے کمپنی کی کوئی شرط اور کسی معاہدہ کی تکمیل نہیں کی، کمپنی کے آڑے وقت فوجی یا مالی کسی قسم کی امداد نہیں کی اگر کسی وقت تھوڑی بہت مدد کچھ کی بھی ہے تو سچے دل سے نہیں بلکہ شرائط کی سخت جکڑ بندیوں کے باعث محض ظاہرداری کی خاطر، ہم شروع سے اس بات کو خاص طور سے دیکھ رہے ہیں کہ خاندان کرناٹک کا کوئی فرد انگریزوں یا ان کی حکومت کے موافق نہیں تھا۔ جس کا مزید ثبوت مسٹر ہنڈ کے مندرجہ ذیل خط بنام کورٹ آف ڈائرکٹرس مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۷۸۷ء سے ملتا ہے:۔

"جب میں یہ خط لکھ رہا تھا۔ نواب کے لڑکوں کے پاس سے ایک اطلاع آئی جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ان کا باپ فرانسیسیوں کے ساتھ واقعی ملا ہوا ہے، جس کے ثبوت میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ حال ہی میں چار قیدی ارکاٹ سے پونڈیچری روانہ کئے گئے، اس امر سے ہمارے تعلقات مشتبہ ہو جاتے ہیں، لہذا ہمیں چاہیئے کہ نواب اور اس کے لڑکوں کو اپنا بنانے کی ممکنہ کوشش کریں، اور ان کے پچھلے معاہدوں کا اعادہ کر کے اپنے مفاد کو مستحکم کرنے کی کوشش کریں اور اگر ممکن ہو تو اس بات کی بھی کوشش کی جائے کہ علاقہ مدراس کو دوبارہ سے اپنے قبضہ میں لانے کے لئے ایک خاص شرط منظور کرالی جائے۔ میرے خیال میں یہ امر زیادہ مشکل اس لئے نہیں ہے کہ وہ خود اب تک اس کا اقرار کرتے چلے آرہے ہیں۔ اگرچہ میں یہ جانتا ہوں کہ نواب کے مشیر ظاہری اور فوری فائدہ سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے آدمی اعتبار کے قابل کب ہو سکتے ہیں۔"

اس ضمنی بحث کے بعد پھر سے ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے ۔۔۔۔۔ بدبخت نواب غلام رسول خاں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ نواب موصوف یا اس کے آبا و اجداد نے اپنی حلیف حکومت یعنی حکومت برطانیہ کے ساتھ کسی موقعہ پر بھی دھوکہ یا دغا کا سلوک نہیں کیا۔ کمشنروں کی روئداد سے کسی ایسے واقعہ کا ہرگز پتہ نہیں چلتا کہ نواب سازشی کردار کا حامل تھا، بدقسمت نواب اور اس کے اجداد حکومت برطانیہ کو یار وفادار سمجھ کر ہمیشہ ان کی مدد کرتے رہے ہیں حق تو یہ ہے کہ محض وفاداری اور دوستی کے مغالطہ میں انہوں نے معزز کمپنی کی امداد میں اپنی بھلائی برائی اور اپنے اور بیگانے کی جان و مال تک کا خیال نہ کیا۔ حتیٰ کہ جب ضرورت پڑی ہے تو اپنے عزیز اقربا کے جانی ایثار تک سے دریغ نہ کیا۔ لارڈ منٹو کے خط کا اقتباس جو پچھلے صفحات

میں دیا جا چکا ہے اور لارڈ ہیسٹنگز کے ایک خط مورخہ ۲۲ جون ۱۸۱۸ء کے اقتباس سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نواب نے ان معاملات میں کسی قسم کی گرم جوشی اور دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

"آپ نے اپنے وعدے کے موافق ایک فوجی دستہ کو پورے طور پر مسلح کرنے میں واقعی قابل تعریف کام کیا ہے۔ اس واقعہ سے ہمارے ساتھ آپ کی حقیقی دلچسپی اور دوستی کا اظہار ہوتا ہے، ہمیں اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ آپ کی وعدہ خلافی اور نافرمانی کے متعلق ہم کو جو غلط فہمی تھی اس کو آپ نے فضیلت مآب معزز معززاں مسٹر ہولٹ گورنر مدراس کے خریطہ کے پہنچتے ہی نہایت تدبر اور دانشمندی کے ساتھ بہت جلد دُور کر دیا، اور اپنے چھوٹے اور وفا شعار بھائی احمد خاں اور اپنے۔۔۔۔ چچا عبدالرحمٰن خاں کی سرکردگی میں پانسو پیدل اور پانسو سوار کی ایک منظم اور باقاعدہ فوج کو ہمارے سپہ سالار جنرل لیک کے ساتھ تعاون عمل کرنے کے لئے بھیج کر اپنی وفاداری کا ثبوت دیا تاکہ ہم اور آپ مل کر متحدہ طور پر مغرور اور بے ایمان سردار باجے راؤ کو اس کی بداعمالیوں کی خاطر خواہ سزا دے سکیں"۔

(باقی آئندہ)

غلام محمد خاں (عثمانیہ)

غزل

اب پسند آئیں ادائیں نہیں دیوانوں کی
دھجیاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں گریبانوں کی

سجدے کرتا ہوں میں چوکھٹ پہ صنم خانوں کی
کونسی بات ہے اب مجھ میں مسلمانوں کی

خوگرِ درد بھی ہوں، شوق سے بیتاب بھی ہوں
شمع کے بھیس میں تقدیر ہوں پروانوں کی

جھلملاتے ہوئے تاروں کو یہ کیا سوجھی ہے
دیکھنے آئے ہیں دنیا مرے ارمانوں کی

شمع لائے ہیں تری بزم میں مطلب یہ ہے
یاد آئے تجھے بھولے ہوئے پروانوں کی

پھر کہاں لیکے چلی حسرتِ دیدار مجھے
پاؤں پر گرد ابھی باقی ہے صنم خانوں کی

تنگ ہے پھر بھی یہ دنیائے محبت خنداںؔ
دل کے ہر ذرّے میں وسعت ہے بیابانوں کی

رام جویا خنداںؔ

قطعات

ایک شام

جا رہا تھا میں سر جھکائے ہوئے گزری اک ماہرو برابر سے
بھر کے اپنی نظر میں کچھ کرنیں اُس نے سینے میں ڈال دیں میرے

مدہوش رات

چاندنی، تارے، ابر کے ٹکڑے ہائے کس قہر کی حسیں ہے رات
لیجئے وہ پھوار پڑنے لگی آج کیوں ہوش میں نہیں ہے رات!

مدفنِ شباب

جہاں دیدنی ہے لہو کی روانی! برستی ہے جس جائے ارغوانی
جسے کہتے ہیں سرزمینِ محبت وہیں دفن ہے میری کافر جوانی

رعنائی خیال

نہ دل ہے نہ ہنگامہ آرائیاں ہیں تحیر ہے، حرماں ہے تنہائیاں ہیں
یہ عشق و محبت، یہ بادہ، یہ نغمہ سب اپنے تخیل کی رعنائیاں ہیں

اُمنگ

فضا نہ تھی کبھی اتنی جواں مرے نزدیک ہوا کے جھونکے مرے واسطے نئے ہیں آج
مری امنگ ہے پرتو فگن گلستاں پر سفید پھول بھی رنگین ہو گئے ہیں آج

چاندنی رات

فضا ہے نور کی بارش سے سیم گوں اس وقت جہانِ مست پہ طاری ہے اک سکوں اس وقت
نہ چھیڑ دردِ جدائی کی داستانیں اے دل تجھے خبر نہیں میں کس کے پاس ہوں اس وقت

از
اختر انصاری دہلوی
بی اے (آنرز)

"غلط العام فصیح"

کا ناجائز فائدہ

میں یہ مضمون "شاہکار" میں شائع کرانے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ جس کے قابل ایڈیٹر علامہ تاجور ہیں۔ اگر غلط العام فصیح کے معنی سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہے تو میں امید کرتا ہوں کہ حضرتِ تاجور اس مقدمہ کی صراحت فرما کر مجھے، نیز شائقینِ ادب کو مطمئن کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔

(زاہد احسنی)

غلط العام کے معنی بیان کرنے میں عام و خاص کا اختلاف ہے۔ عام و نیم خواندہ آدمی اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ جس لفظ کو عام طور پر بولا جاتا ہو خواہ بولنے والے بازاری اور دیہاتی ہی کیوں نہ ہوں وہ فصیح ہے۔ اس کو تحریر و تقریر میں استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن اربابِ علم و ادب کہتے ہیں کہ وہ لفظ جو پڑھے لکھے مستند ادبا و شعرا میں رواج پا چکا ہو اور اسی طبقہ میں عمومیت سے استعمال کیا جاتا ہو وہ غلط العام فصیح کے ذیل میں آتا ہے۔ اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں:
"غلط العام فصیح، و غلط العوام قبیح"

جہاں تک مشاہدہ کا تعلق ہے اس بیماری نے ہمارے ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ یہ ایک سیلاب ہے جو اپنی پوری طاقت سے صحیح لغات کو پامال کرتا ہوا، اور صحتِ لفظی کے سرسبز و شاداب پودوں کو اکھاڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ جہاں کسی نے غلطی کی اور اس کی گرفت ہوئی فوراً "غلط العام فصیح" کہہ کر نجات حاصل کر لی۔ گویا یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جس کو جا و بیجا چلایا جا سکتا ہے اور اس سہارے کی بنیاد پر ہمارے شعرا و ادبائے عصر صحتِ الفاظ کی تحقیقات سے قطعاً بے نیاز ہو گئے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مستقبل قریب میں فی صدی ۹۹ مطلق العنان بن کر رہ جائیں گے اور بقائے ادب کو جس کاوش و تحقیقات کی ضرورت ہے وہ ایک بے معنی چیز بن کر رہ جائے گی۔

یہ تیغ عام طور پہ لغات کی گردن پر چلائی جا رہی ہے۔ ہم لوگ باہم کا قافیہ بے تکلف موسم اور صورت کا میت لکھ جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اکثر و بیشتر الفاظ کا استعمال ہم لغات کے خلاف کرتے رہتے ہیں اور ہمارا یہ مذموم فعل گرفت کی حدود سے بالاتر ہوتا ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ پہلے زبان بنی۔ الفاظ مقرر ہوئے۔ اس کے بعد قواعد و لغات کی تدوین عمل میں آئی۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جب لغات کو مدوّن کیا جا رہا تھا تو اُن میں ایسے الفاظ بھی شامل کر دئے گئے تھے جو مقرر کردہ الفاظ کے خلاف ہوں، نہیں ہرگز نہیں۔ لغات میں وہی الفاظ حرکات و اعراب کے ساتھ لکھے گئے جو اس وقت کے اہلِ زبان حضرات نے مقرر کئے تھے۔ گویا جن الفاظ کو ہم غلط بولتے ہیں وہ ہماری اختراع ہے اہلِ زبان اور اربابِ لغات نے ان کے مقرر ہونے کے بعد نہایت تحقیق سے صحیح لکھا تھا۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آج ہم کو یہ حقِ اجتہاد کہاں سے حاصل ہو گیا کہ ہم علی الاعلان لغات کی مخالفت کریں اور اپنے اس عیب و جہالت پر "غلط العام فصیح" کا پردہ ڈال کر معترضین کی زبان پر مہرِ سکوت لگا دیں۔ ہم کو ہر حال میں لغت کی پابندی کرنی ہوگی اور لغت سے جو فیصلہ ہوگا وہ ہمارے حق میں ناطق ہوگا۔ اگر ہم نے کوئی لفظ غلط استعمال کیا ہے۔ تو یقیناً ہم کو اپنی غلطی ماننی پڑے گی۔ ورنہ اس کے برخلاف یہ معنی ہوں گے کہ لغات ایک بے معنی اور بے کار چیز ہے، جو ہماری لائبریریوں پر زبردستی کا بار ہے۔ جس کے متعلق ہمیں فوراً

این دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ

پر عمل کرنا چاہیئے اور کہ جن لوگوں نے لغات کی تدوین میں طرح طرح کی کاوشیں اٹھائیں، وقت صرف کیا وہ ان کا مجنونانہ فعل تھا جس کا بیکار ہونا دورِ موجودہ کے آزاد ادبا و شعرا نے ثابت کر دیا ہے۔

لیکن ہماری روزانہ کی طرزِ عمل بتاتی ہے کہ لغات بیکار نہیں ہم

بحث کے مواقع پر لغت کی ورق گردانی کرتے ہیں اور اُس کے ذریعہ اپنی دعوے کی دلیل دیتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہوئے ہمارا یہ فعل کسقدر مضحکہ خیز ہو جاتا ہے کہ جب ہم کوئی لفظ لغت کے خلاف استعمال کرتے ہیں، اُس وقت لغت کے احکام کو پسِ پشت ڈال کر غلط العام فصیح کا نعرہ لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گویا ہم بندۂ غرض ہیں اور ہمارا قانون اپنے مفید مطلب بات کو لے لیتا ہے۔ اس اجتماعِ ضدین کو کیا کہا جائے۔

لطف تو یہ ہے کہ آجتک غلط العام فصیح الفاظ کی کوئی فہرست بھی اس کے دعویداروں نے مرتب نہیں کی، جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں فلاں لفظ امتدادِ زمانہ سے بدل گئے ہیں۔ تاکہ اُن کو لغات سے نکالا جا سکتا یا موجودہ استعمال کے مطابق لغات میں اُن کو دکھایا جا سکتا۔ یا آئندہ شائع ہونے والی لغات میں کوئی نشان لگا دیا جاتا کہ یہ لفظ پہلے یوں تھا اور اب غلط العام فصیح کے حامیوں نے یوں کر دیا ہے۔ یہاں تک یہ قیامت برپا ہے کہ ایک عامی سے لے کر ایک مستند شاعر تک اس علت میں گرفتار ہے اور ٹوکنے پر سب ایک ہی فقرہ دہرا دیتے ہیں کہ "غلط العام فصیح" اور لفظی معاملے میں کسی لفظ پر بحث ہو اسی کی آڑ لے لی جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ زمانہ اپنی رفتار کے ساتھ ہر چیز میں تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔ اردو ہی کو لیجئے۔ وَلی دکنی اور میر و سودا کے زمانے کے الفاظ آج قطعاً متروک ہیں اُن کو استعمال کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مگر کسی چیز کا متروک ہو جانا اور بات ہے اور اُس کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنا الگ چیز ہے۔ اگر آج کوئی پرانے زمانہ کے الفاظ استعمال کرنے لگے تو اُسی طریقہ سے ادا کرنے پڑیں گے۔ جیسے وہ اپنی جگہ ہیں۔ ہمیں ان میں ترمیم و تنسیخ کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح سب لوگ لغت کے حافظ نہیں ہوتے۔ بے پڑھے لکھے آدمیوں کا خاصہ ہے کہ وہ زبر کی جگہ زیر اور زیر کی جگہ پیش استعمال کر جاتے ہیں۔ یا کسی لفظ کو آسانی سے استعمال کرنے کے لئے اس میں کوئی ترمیم کر لیتے ہیں۔ وہی الفاظ بار بار سنتے سنتے پڑھے لکھوں کے کانوں میں بس جاتے ہیں۔ جن کو وہ صحیح سمجھ کر خود بھی استعمال کرنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تقلید غلط ہے۔ ورنہ ہر دیہاتی جس کی بول چال میں الفاظ و محاورات وہی استعمال ہوتے ہیں۔ جو زبان میں مروج ہیں۔ مگر اُن کو جس طرح وہ توڑ موڑ کر غلط سلط استعمال کرتے ہیں، وہ ظاہر ہے۔ پس جس طرح کوئی دیہاتی اپنی زبان کو تحریر میں لاتے ہوئے یہ کہنے کا حقدار ہے کہ غلط العام فصیح اسی طرح لغات کے خلاف ایک لفظ بھی استعمال کرنے والا غلط العام فصیح کی آڑ نہیں لے سکتا۔ ورنہ اُس میں اور گنوار میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ کیونکہ وہ کثرت سے غلطیاں کرتا ہے۔ یہ قلت سے قانونِ لغات کی مخالفت کے مرتکب دونوں ہیں۔ جس طرح وہ اپنے دیہاتی بھائیوں سے گاؤں کی بولی سنتے سنتے اُسی کو صحیح ماننے لگا ہے، اسی طرح یہ ادیب یا شاعر صاحب بھی ایک یا چند الفاظ سنتے سنتے اُن کی صحت پر ایمان لے آئے ہیں۔ چوری سونے کی ہو یا لوہے کی قانون میں سزا برابر ہے۔

یہاں تک عرض کر دینے کے بعد یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ زبان میں تغیر ہوا ہے۔ ہو رہا ہے۔ ہوتا رہے گا۔ بہت سے لفظ بڑھیں گے، بہت سے محاورات میں ترمیم و تنسیخ ہو رہی ہے۔ یا ہو چکی ہے۔ ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم صرف الفاظِ لغات کے ہی پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اور اسی کی ترمیم کو ہم غلط العام کہہ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ زبان میں صرف الفاظ ہی نہیں ہوتے، محاورے ہوتے ہیں، حروف ہوتے ہیں، واحد جمع، اشعار۔ غرض غلط العام کا قانون ہر جگہ کام کر سکتا ہے۔ اگر اسی زد میں کچھ الفاظ بھی آ چکے ہوں تو چنداں مضائقہ نہیں لیکن اِس بات پر ہم کو تمام تر غور کی ضرورت ہے کہ جو لفظ یا محاورہ وغیرہ اساتذۂ متقدمین استعمال کر گئے ہیں ہم اُسی پر اکتفا کریں اور اپنی ناواقفیت سے تمام لغت کو تباہ کرنے کے درپے نہ ہوں۔ اگرچہ غلطی ہر حال میں غلطی ہے۔ خواہ وہ ایک مبتدی سے ہو یا ایک مستند منتہی سے، لیکن غلط العام کے تحت میں جن غلطیوں کا ارتکاب ہمارے متقدمین میں سے ہوا ہے، وہ بجائے خود ایک الگ چیز بن کر داخلِ لغات یا کتبِ فن میں داخل ہو چکی ہیں۔ مثال کے طور پر مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) تمہیں۔ ہمیں۔ بجائے تم ہی۔ ہم ہی۔ استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ مستقل طریقہ پر لغات اردو میں جگہ پا چکے ہیں۔ حالانکہ غلط ہیں اور تم ہی، ہم ہی کا مخفف ہیں اور یہی نہیں کہ لغت میں ایک علیحدہ لفظ بن گئے ہیں بلکہ تم ہی، ہم ہی کے مقابلے میں اچھے بھی معلوم ہوتے ہیں۔

(۲) تھا۔ تھے۔ بجائے ہا، ہے۔ ہونا مصدر سے یہ مشتق ہیں

لیکن کسی اردو قواعد میں آپ ہا ہے نہیں پائیں گے - گویا یہ ایک الگ چیز بن گئی -

(۳) "ذرا سے" یا "ذرا سے" دونوں طرح لکھا جاتا ہے - جس کے معنی تھوڑے کے لئے جاتے ہیں - یہ مخفف ہے - "ذرّہ" کا کثرت استعمال نے اس کے معنی ہی بدل دئے - اب اگر کوئی ذرا کہے تو اُس کے معنی ذرّہ ہرگز نہیں سمجھے جائیں گے -

(۴) سہی - ایسا ہی سہی - تمہیں سچے سہی وغیرہ اربابِ تحقیقات اس کا مخرج صحیح بناتے ہیں - جو قرینِ قیاس بھی ہے - لیکن عام لوگوں کی غلطی نے اس کے معنی - املا، محلِ استعمال سبھی بدل دئے اور یہ لفظ بجائے خود ایک الگ لفظ بن گیا -

(۵) "خدا معلوم" جس کے معنی ہوئے خدا علم کیا گیا اور جو بجائے خدا جانے استعمال ہوتا ہے - ظاہر ہے کہ یہ بات غلط ہے لیکن ہماری بول چال میں اس کے یہی معنی ہو گئے اور کوئی لغت اس کو غلط بھی قرار نہیں دیتا - پس یہی غلط العام فصیح ہو سکتا ہے -

(۶) ہر ایک - بمعنی "ہر" برابر بولا جاتا ہے، اگر ہم اس کا تجزیہ کریں تو "ایک" قطعاً حشوِ قبیح نظر آئے گا - مگر چونکہ داخلِ زبان ہو چکا - اس لئے باوجودیکہ غلط ہے، مگر صحیح ہے - فصیح ہے اور اسی کی اشاعت پر لغات بھی مجبور ہیں -

(۷) باغیچہ، دریچہ - بمعنی باغچہ - درچہ - مثلاً خوان چہ - دیگچہ اسمائے تصغیر ہیں جن کے بنانے کا قاعدہ یہی ہے کہ اسم کے آگے چہ، لگا دیا جائے - تو اسم تصغیر ہو جائے گا - مگر چونکہ غلط العام ہو کر باغیچہ اور دریچہ وغیرہ میں اسم کے آگے "ی" کا اضافہ ہو گیا ہے - اسی چیز کو قاعدہ میں داخل سمجھ لیا گیا اور لغات نے بھی اسی غلط لفظ کو فصیح مان کر اپنے دامن میں جگہ دے دی -

(۸) حور واحد ہے - حور جمع ہے - لیکن حور کو ہر جگہ بمعنی واحد استعمال کیا جاتا ہے - دورِ حاضرہ کے لغات تشریح کر دیتے ہیں کہ یہ لفظ جمع ہے اور واحد میں استعمال ہوتا ہے -

(۹) اولاد - جمع ہے ولد کی، لیکن کلیتہً واحد کے معنی میں مستعمل ہے - لغات میں بھی اب اس کی تشریح نظر آنے لگی ہے -

(۱۰) ؏ دل کی بات ہے حضور آپ سنیں ہا سے ضرور

بروزن مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن - اگر مصرعہ ہذا کی وزن مندرجہ پر تقطیع کریں، تو حضور کی "ر" اور ضرور کی "ر" تقطیع سے گر جائے گی۔ مصرعہ کے آخر میں تو ایک حرف زائد ہونا تقریباً ہر بحر میں جائز کر لیا گیا ہے - لیکن درمیان کے لئے کوئی قاعدہ نہیں تھا - لیکن اب چند بحروں کے لئے یہ بات جائز کر لی گئی ہے اور تمام عروضی اس کو تسلیم کر چکے ہیں - عروض کی تازہ تصنیفوں میں بھی اس کا ذکر کر دیا جاتا ہے -

مندرجہ بالا معروضہ سے یہ مقصد ہے کہ غلط العام فصیح کا اطلاق زبان کے ہر شعبہ میں ہوتا ہے - نہ کہ صرف الفاظ ہی پر اور جو جو چیزیں غلط العام ہو کر فصیح تسلیم کی جا چکیں ہیں - فنی کتب میں قریب قریب اُن کا ذکر آ چکا ہے - ہماری روزمرّہ کی گفتگو میں اس قسم کی بہت سی باتیں نظر آئیں گی - جو اصل معنوں کے خلاف بولی جاتی ہیں - اگر ہم غور کریں تو اسی چیز سے ایک چھوٹی موٹی کتاب بنائی جا سکتی ہے - ہاں تو اصلاً یہ ہیں "غلط العام فصیح" کے معنی جس کو ہم لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ صرف الفاظِ لغات ہی کو غلط بولنا غلط العام فصیح میں داخل ہے - لغات تو زبان کے پختہ ہونے کے بعد ترتیب دئے گئے - اس میں ترمیم و تنسیخ کا کس کو اختیار ہے اور یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ لغات کے تمام الفاظ صحیح ہی تحریر کئے گئے ہوں کیا یہ ممکن نہیں کہ لغات کی تدوین سے پہلے بہت سے الفاظ غلط ہو چکے ہوں - جن کو فصیح مان کر لغات میں اُسی طرح لکھ دیا ہو - جس طرح بولتے ہوئے سنا گیا - بہرحال یہ زیادتی کسی طرح روا نہیں کہ ہم لوگ الفاظ کی تحقیقات کئے بغیر جس طرح اپنے یہاں کے عام و عوام کو بولتا سنیں اُسی کو قرآن و حدیث مان لیں، ہمارا فرض ہونا چاہیئے کہ الفاظ کی تحقیقات کریں اور اُسی طرح بولیں جس طرح لغات بتائیں - یہ غلط العام فصیح کی آڑ لینی تو اپنی حماقت اور لاعلمی کا اعلان کرنا ہے -

اب میں بطورِ مثال چند ایسے الفاظ پیش کرتا ہوں، جو "غلط العوام قبیح" کے ذیل میں شمار کئے جائیں - یعنی وہ ہیں کچھ اور بولے کچھ جاتے ہیں - اگر ناظرین و ادارہ نے اس سلسلہ کو مفید تصور کر لیا، تو اور بہت سے الفاظ بطور اقساط پیش کرنے کی کوشش کروں گا - ورنہ اسی گزارش پر مضمون کو ختم سمجھئے کہ الفاظ کو صحیح استعمال کیا جائے اور لغات کے بارے میں غلط العوام فصیح ایک بے معنی بات تصوّر کی جائے -

الفاظ	معانی	صراحت
آدَمی	انسان حضرت آدم سے نسبت رکھنے والا۔	بسکون دال غلط ہے بہ فتح دال صحیح۔ [1]
آرَد	آٹا	بفتح را غلط ہے بسکون را صحیح۔
بابُر	بادشاہ پدر ہمایوں	بضم بائے ثانی صحیح ہے بفتح غلط ہے [2]
بیگم	زنِ عمدہ	بکسر کاف فارسی صحیح ہے بفتح کاف اس معنی میں غلط [3]
پِشّہ	مچھر	بکسر اوّل غلط ہے بفتح اول صحیح ہے [4]
پُلاؤ	مشہور کھانا۔	بفتح اوّل صحیح ہے بضم اوّل غلط ہے [5]
ترجَمہ	ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا۔	بفتح تا و جیم صحیح ہے بضم جیم غلط ہے۔ [6]
تنازُع	جھگڑا کرنا۔	یہ تغافل کے وزن پر ہے بفتح زا غلط ہے۔

ابر احسنی گنوری

[1] بلکہ اس کے برعکس۔ [2] اردو میں بابر بہ فتحہ با صحیح ہے
[3] اردو کا تلفظ اردو میں صحیح ہے۔ [4] پشہ بکسر اوّل ہی صحیح ہے۔ [5] اردو میں بہ فتحہ اوّل غلط ہوگا۔
[6] اردو تلفظ ہی اردو میں صحیح ہے۔ (تاجور)

نوٹ:- مضمون نگار نے "غلط العام فصیح" کا جو مفہوم بتایا ہے۔ تسلیم۔ لیکن اُن کا یہ نظریہ صحیح نہیں کہ اردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ کا استعمال جبھی صحیح ہوگا جب اصلی زبان کے تلفظ کے ساتھ ہو۔ یہ اصول قطعاً گمراہ کن ہے۔ اردو زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ مستند ادبا و شعرا نے جس تلفظ سے بھی استعمال کئے ہیں وہی تلفظ صحیح ہوگا، خواہ اُن کا اصلی تلفظ کچھ ہو۔

انگریزی کی لینٹرن اردو میں لالٹین بن گئی اور مستند سے مستند فصحا بھی لالٹین ہی کہنے لگے۔ اب کوئی اصرار کرے کہ اردو میں لالٹین کو لینٹرن کہو تو اُس کا اصرار ناقابلِ تسلیم۔

بعض الفاظ ایسے ہیں کہ اردو میں ان کا اصلی تلفظ بھی صحیح ہے اور اردو تلفظ بھی۔ جیسے میّت بہ کسرِ یا و بہ فتحہ یا دونوں صحیح۔ رہا موسم کا لفظ اگرچہ عربی میں بہ کسرۂ سین ہے لیکن اردو میں اصلی تلفظ غلط قرار دیا جائے گا۔ کیونکہ موسم کو باہم اور عالم کے قافیوں میں تمام شعرا نے باندھا ہے یہ غلط تلفظ "غلط العام فصیح" کے زمرے میں شامل کرنا پڑیگا۔ مفرد ہو یا حالتِ ترکیب میں موسم اردو میں بہ فتحہ سین ہی استعمال ہوگا اور پھر بھی میں اسے مہند یا مورد الفاظ کے ذیل میں شمار نہیں کروں گا۔ یعنی اصلی تلفظ کے ساتھ بہ حالتِ ترکیبی میں بھی استعمال ہونا چاہیئے۔ مضمون نگار نے اخیر کے جدول میں جن الفاظ کے اردو تلفظ کو غلط ٹھہرایا ہے۔ میں اُن کے اردو مروجہ تلفظ ہی کو صحیح سمجھتا ہوں اور اُن کے اصلی تلفظ کو اردو میں غلط خیال کرتا ہوں۔ کیونکہ اُن الفاظ کا اردو تلفظ فصحا میں بھی رواج پا گیا ہے۔

خود عربی میں دوسری زبانوں کے الفاظ اپنے اصلی تلفظ کے خلاف استعمال ہوتے ہیں اور عربی میں اُن کا استعمال عربی تلفظ ہی فصیح سمجھا جاتا ہے المعرب والدخیل عربی لغت کا مستقل باب ہے۔ ملاحظہ کیجیئے۔ اور عربی ہی پر کیا انحصار ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ داخل ہیں اور غیر اصلی تلفظ کے ساتھ۔ اُن زبانوں میں بولے جاتے ہیں اور اُن کا غیر اصلی تلفظ ہی فصیح متصور ہوتا ہے۔

بیگم کو اردو میں بیگم بہ کسرِ کاف فارسی یا بہ ضمۂ کاف فارسی بیگُم یا بیگمؒ بولنا تو مضحکہ خیز ہے۔ خواجہ آتش نے المضاعف کو المضاف اور بیگم بہ ضمۂ میم کو بیگم بہ فتحۂ میم استعمال کرنے پر ناسخ کے پیرووں کو جو جواب دیا تھا کہ "جب ہم ترکی یا عربی زبان میں شاعری کریں گے تو بیگُم اور المضاعف ہی لکھیں گے۔" بالکل معقول اور صحیح جواب دیا تھا۔ مولینا آزاد کا یہ جواب نقل کر کے اُسے تسلیم نہ کرنا قابلِ تقلید نہیں۔ بس ایک ہی اصول ہے۔ اُن کو ہم نے جن الفاظ کو دوسری زبانوں سے لے کر جس تلفظ اور املا میں اردو میں استعمال کیا اور فصحائے اردو میں اُس کا رواج ہوا۔ اردو میں صرف وہی تلفظ صحیح ہوگا۔ اصلی تلفظ اور املا سے اُن الفاظ کو کوئی واسطہ نہ رہے گا۔ مختصر یہ کہ فصحا اور مستند ادبا کا استعمال ہی سندِ صحت و فصاحت ہے اور بس۔ تاجور

تعلیمی ادارات

بنارس ہندو یونیورسٹی

بنارس ہندو یونیورسٹی کے قیام کا خیال پنڈت مدن موہن مالوی کے دماغ میں پیدا ہوا، جس کو اوّل اوّل انہوں نے ۱۹۰۴ء میں ایک جلسے کے سامنے پیش کیا، یہ جلسہ منٹ ہاؤس بنارس میں مہاراجہ سر پربھو نارائن والئے بنارس کی زیر صدارت انعقاد پذیر ہوا تھا، دسمبر ۱۹۰۵ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس بنارس میں ہوا، اس کی شرکت کے لئے ہندوستان کے تمام صوبوں سے ہندو علماء و زعماء اور قوم پرست افراد آئے تھے۔ ۳۱ دسمبر کو ٹاؤن ہال بنارس میں ہندو اکابر و زعماء کا ایک جلسہ ہوا، جس میں مالوی جی نے یونیورسٹی کی اسکیم پیش کی۔ آئندہ سال الٰہ آباد میں ہندو مہاسبھا کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں بھی یہ اسکیم پیش کی گئی اور طے پایا کہ یونیورسٹی کے قیام کے لئے ایک کروڑ روپیہ جمع کیا جائے۔

اسی زمانے میں مسز اینی بیسنٹ بھی جو سنٹرل ہندو ہائی سکول کے ٹرسٹیز بورڈ کی صدر تھیں، بنارس میں "بھارت کا وشو ودیالیہ" (ہندوستان کا دارالعلوم) قائم کرنے کی سعی کر رہی تھیں، چنانچہ جامعہ کا چارٹر حاصل کرنے کے لئے بہت سے آدمیوں کے دستخط سے ایک میموریل بھی انہوں نے حکومت کے پاس روانہ کر دیا تھا، علاوہ ازیں ممتاز اور سربرآوردہ ہندوؤں کی ایک جماعت "بھارت دھرم مہامنڈل" بنارس کے ماتحت ہندو ادبیات کی تعلیم کے لئے "شاردا وشو ودیالیہ" کے نام سے ایک درسگاہ قائم کرنی چاہتی تھی۔ اس جماعت کے سرکردہ مہاراجہ رامیشور سنگھ آف دربھنگہ تھے، ایک شہر میں ہندو قوم کے تین تین دارالعلوم کا قیام صحیح نہیں تھا۔ اس لئے پنڈت مدن موہن مالوی، مسز اینی بیسنٹ اور مہاراجہ دربھنگہ سے ملے اور دونوں کو اپنی اسکیم میں شریک کر لیا۔

اس کے بعد مہاراجہ دربھنگہ اور مالوی جی لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند اور حکومت ہند کے رکن تعلیم بٹلر سے ملے اور کچھ شرائط کے ساتھ وعدۂ امداد مل گیا، دسمبر ۱۹۱۱ء میں ہندو یونیورسٹی سوسائٹی کی تشکیل عمل میں آئی اور نئے سال سے الٰہ آباد میں اس کا دفتر کھل گیا۔ اس سوسائٹی کے صدر مہاراجہ دربھنگہ اور آنریری سکریٹری مالوی جی منتخب ہوئے۔

مئی ۱۹۱۱ء میں یونیورسٹی کے لئے سرمایہ کی فراہمی کا کام شروع ہو چکا تھا اور چند ہی مہینے میں ۳۰ لاکھ روپے کے وعدے مل چکے تھے۔ اکتوبر میں مہاراجہ دربھنگہ بھی اس وفد میں شامل ہو گئے جو فراہمی سرمایہ کے لئے ملک میں دورہ کر رہا تھا، مہاراجہ دربھنگہ کی شرکت سے وفد کو خاص کامیابی ہوئی، یہ وفد ہر صوبے میں گیا اور یونیورسٹی کے سرمائے میں راجہ، مہاراجہ، تعلقہ دار، زمیندار، امیر، غریب، مرد، عورت سب نے شرکت کی چنانچہ ۱۹۱۲ء کے آخر تک ۸۲ لاکھ روپے سے زیادہ کے وعدے ہو گئے اور تقریباً ۴۲ لاکھ روپے نقد مل گئے۔

اس کے ساتھ حکومت ہند سے خط و کتابت بھی ہوتی رہی، چنانچہ ۱۹۱۵ء میں یونیورسٹی قانون پاس ہو گیا اور ۴ فروری ۱۹۱۶ء کو بلدۂ بنارس سے دو تین میل کے فاصلے پر جانب جنوب یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اس تقریب کی شرکت کے لئے ہندوستان کے متعدد والیان ریاست، صوبوں کے گورنر اور بڑے بڑے زعماء اور اکابر ملک بنارس آئے تھے، سنگ بنیاد رکھنے کی تاریخی تقریب نائب السلطنت لارڈ ہارڈنگ کے ہاتھ سے عمل میں آئی۔

۱۹۱۸ء میں سر گنگا رام کی نگرانی میں یونیورسٹی کی عمارتوں کا سلسلۂ تعمیر شروع ہوا، تین سال کے اندر متعدد عمارتیں تیار ہو گئیں۔

۱۹۲۱ء میں سابق شاہ ایڈورڈ ہشتم بحیثیت ولیعہد ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے، انہوں نے یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔

جن اغراض و مقاصد کے پیشِ نظر ہندو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) سنسکرت علوم و فنون اور ہندو تہذیب و تمدن کی ترویج و ترقی۔

(۲) جدید آرٹس، سائنس اور ان کی شاخوں کی تعلیم و تکمیل۔

(۳) جدید علوم و فنون کی ایسی تعلیم جس سے ملک کی صنعت و حرفت اور خوش حالی و فارغ البالی کو ترقی ہو۔

(۴) طلبہ کو نہ صرف مذہب و اخلاق کی تعلیم سے بہرہ ور کرنا بلکہ انہیں بہترین سیرت و کردار سے آراستہ کرنا۔

یونیورسٹی کی مختلف درسگاہیں

(۱) سنٹرل ہندو کالج:- ہندو یونیورسٹی کے قیام سے بہت قبل سے یہ کالج موجود تھا اور اپنے نصب العین میں ہر طرح کامیاب تھا، جب بنارس میں یونیورسٹی کا قیام طے پایا تو کالج کے ٹرسٹیوں نے اسے یونیورسٹی کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ جب تک یونیورسٹی کی عمارتیں تیار نہیں ہوئی تھیں اسی کالج کی مختلف عمارتوں میں یونیورسٹی کے طلبہ تعلیم پاتے تھے، اس حیثیت سے یونیورسٹی کا اولین کالج یہی ہے۔

اس کالج کے دو حصے ہیں، آرٹس اور سائنس، اوّل الذکر شعبے میں ایم۔اے تک کی، اور ثانی الذکر میں ایم۔ایس سی تک کی تعلیم ہوتی ہے، آرٹس کے شعبے میں انگریزی، ہندی، سنسکرت، پالی، برج بھاشا، اردو، عربی، فارسی، بنگلہ، مراٹھی، فرنچ، اور جرمن زبان نیز تاریخ سیاست، اقتصادیات، فلسفہ، نفسیات اور قدیم ہندو تہذیب و تاریخ اور ریاضی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ سائنس کے درجے میں... علم الحیوانات، علم النباتات، زراعت، معدنیات، معالجات وغیرہ کی تعلیم ہوتی ہے، اس شعبے میں شیشہ سازی، روغن سازی، صابن سازی، چینی کے برتن اور کھلونے بنانے کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

زراعت اور نباتات کی تعلیم کے شعبوں کے ساتھ کھیت اور باغ بھی ہیں، معدنیات، معاشیات، حیوانیات وغیرہ کی تعلیم کے لئے میوزیم موجود ہیں، آرٹس اور سائنس کے مختلف شعبوں سے متعلق تعلیمات کے جسقدر سامان اور ذخائر یہاں فراہم ہیں ہندوستان کے کسی دارالعلوم میں نہیں ہیں۔

ایم۔اے اور ایم۔ایس سی میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد طلبہ کے لئے جدید تحقیقات کے سامان بھی فراہم ہیں، جدید تحقیقات میں جو طلبہ کامیاب ہوتے ہیں انہیں ڈاکٹر کی ڈگری دی جاتی ہے، یہ کالج یونیورسٹی کا سب سے بڑا دارالعلوم ہے، ۱۹۳۳ء کے اعداد و شمار کے مطابق اس کالج میں ۲۲۰۷ طالب العلم تھے اور معلمین کی تعداد ایک سو نو تھی۔

(۲) قدیم ہندو تہذیب و اخلاق کا دارالعلوم:- اس کالج میں سنسکرت کی قدیم کتابوں کے ذریعہ ہندو مذہب و فلسفہ اور تصوف و اخلاق کی تعلیم دی جاتی ہے اور وید وغیرہ پڑھائے جاتے ہیں، یہ دارالعلوم ان علوم و معارف کا ہندوستان میں بے مثل مرکز سمجھا جاتا ہے۔

(۳) آیورویدک کالج:- اس کالج کو یونیورسٹی نے ۱۹۲۷ء میں قائم کیا، اس میں قدیم آیورویدک کی تعلیم ہوتی ہے اور جدید ایلوپیتھک کی بھی۔ تاکہ ہندوستان کا قدیم طریقۂ علاج بھی باقی رہے اور یہاں کے تعلیم یافتہ معالجین جدید اصول معالجہ سے بھی بے بہرہ و ناواقف نہ رہیں۔ اس کا نصاب چھ سال میں پورا ہوتا ہے۔ اس میں علم الابدان اور علم الادویہ وغیرہ کی بھی تحصیل کرنی پڑتی ہے، جو لوگ یہاں تکمیل تعلیم کرتے ہیں انہیں "آیورویداچاریہ" کی ڈگری دی جاتی ہے۔

اس کالج کے ساتھ ایک شفاخانہ بھی ہے جس میں قدیم و جدید دونوں طریقوں سے علاج کیا جاتا ہے۔ سو مریضوں کی جگہ کا انتظام ہے، متعدی امراض کے مریضوں کے لئے علیحدہ وارڈ موجود ہیں۔ اب سے تین سال قبل اس میں دو سو طلبہ تھے اور ۱۴ اساتذہ، کالج کے ماتحت ایک آیورویدک باغ بھی ہے۔

(۴) ٹریننگ کالج:- تمام ہندوستان سے انتخاب کرکے ۵۴ - ۵۵ طلبہ اس میں داخل کئے جاتے ہیں۔ اس میں عورتیں بھی تعلیم پاتی ہیں، مختلف مصالح کے پیشِ نظر یہ کالج ہندو اسکول کے ساتھ شہر میں رکھا گیا ہے، اس کے اساتذہ کی تعداد چھ ہے۔

(۵) لا کالج:- اس کالج کا کورس دو برس کا ہے، مستقل پروفیسروں کے علاوہ آنریری طور پر بھی بعض اصحاب تعلیم دیتے ہیں۔

(۶) زنانہ کالج:- اس کالج میں عورتوں کو اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے اصول صحت، نفسیات اطفال اور موسیقی کی تعلیم کا خاص اہتمام ہے، یہاں عورتیں ہی تعلیم دیتی ہیں، مرد اسی صورت میں پروفیسر مقرر کئے جاتے

ہیں جب کسی موضوع کی تعلیم کے لئے بہتر معلمہ نہیں ملتی ۔

اس کالج کی طالبات کی ایک مجلس بھی قائم ہے، جس میں جمع ہو کر یہ آپس میں تبادلۂ خیالات کرتی ہیں، یہ طالبات ایک لیڈی سپرنٹنڈنٹ کی زیر نگرانی رہتی ہیں جو ڈاکٹر بھی ہیں، لڑکیوں کے رہنے کے لئے ایک ہوسٹل بھی کالج ہی کی عمارت میں ہے، ہوسٹل کے ساتھ ایک احاطہ ہے جس میں لڑکیوں کی سیر و تفریح، کھیل کود اور ورزش کا سامان موجود ہے ۔

کالج میں تعلیم پانے والی لڑکیوں کی تعداد روز بروز ترقی پذیر ہے ۔

(۷) انجنیئرنگ کالج :- ہندوستان بھر میں انجنیئرنگ کی تعلیم کے لئے اس پایہ کا دارالعلوم نہیں ہے - اس میں میکنیکل انجنیئرنگ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور الیکٹریکل انجنیئرنگ کی بھی، یعنی لوہے کی مشین اور کل پرزوں کا بنانا بھی سکھایا جاتا ہے اور بجلی کی روشنی اور اس کے متعلقات کی بھی تعلیم ہوتی ہے ۔ یہاں انجنیئرنگ کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا انتظام موجود ہے، چار سال تک کالج میں مطالعہ کرنے اور ایک سال کسی کارخانے میں عملی طور پر کام سیکھنے کے بعد طلبہ کو سند تکمیل عطا کی جاتی ہے ۔

یہ کالج ہندوستان بھر میں مشہور ہے چنانچہ ہر سال برطانوی ہند اور ریاستوں سے بڑی تعداد میں طلبہ کی درخواست ہائے داخلہ آتی ہیں، لیکن ان میں سے صرف سو درخواستیں منظور کی جاتی ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں اس کالج میں ۴۵۰ طلبہ تھے اور ۲۵ اساتذہ ۔

ہندو یونیورسٹی کے انجنیئرنگ کالج نے ملک کی ایک بڑی ضرورت پوری کر دی ہے، جب تک یہ کالج قائم نہیں ہوا تھا ہندوستان کے طلبہ کو یورپ، امریکہ اور جاپان جانا پڑتا تھا، اب ہندوستان کے مختلف شہروں میں اس کالج کے انجنیئر کمال قابلیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں ۔

(۸) کان کنی اور دھات پگھلانے کی تعلیم کے لئے یونیورسٹی میں ایک جداگانہ شعبہ موجود ہے، ہندوستان میں اس فن کی تعلیم صرف دھنباد کے سرکاری ادارہ میں ہوتی ہے، لیکن طلبہ کی زیادہ تعداد یونیورسٹی ہی میں آتی ہے ۔

(۹) موسیقی کی تعلیم :- موسیقی سیکھنے والے طلبہ کے لئے موسیقی کے معلم موجود ہیں، روزانہ شام کو موسیقی سکھائی جاتی ہے ۔

(۱۰) فوجی تعلیم :- یونیورسٹی میں فوجی تعلیم بھی ہوتی ہے۔ سو سے اوپر نوجوان فوجی تعلیم پارہے ہیں، حکومت کی طرف سے ان کے لئے وردیاں اور بندوقیں ملی ہوئی ہیں، ایک سارجنٹ مقرر ہے جو باقاعدہ فوجی تعلیم دیتا ہے، اس صوبہ کی یونیورسٹی اور کالجوں کے فوجی تعلیم پانے والے طلبہ ہر سال کسی شہر میں جمع ہوتے ہیں اور ان میں کھیل کود اور ورزش وغیرہ کا مقابلہ ہوتا ہے ۱۹۲۵ء میں پہلا مقابلہ ہوا تھا، اس وقت سے لے کر ۱۹۳۳ء تک ہندو یونیورسٹی کے طلبہ چھ بار اول رہے ہیں ۔

(۱۱) ہائی اسکول اور مدرسے :- ان اداروں کے علاوہ یونیورسٹی کے ماتحت ایک ہائی اسکول بھی ہے جس میں ایک ہزار سے زیادہ طلبہ تعلیم پاتے ہیں، اس پیمانہ کے ہائی اسکول ہندوستان بھر میں دو تین ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں ۱۲۰۰ طلبہ اور ۶۰ اساتذہ تھے ۔

سنسکرت کے چھوٹے طلبہ کے لئے ایک درسگاہ ہے جس میں دس سے زیادہ معلم ہیں اور متعلمین کی تعداد بھی کافی ہے، چھوٹی لڑکیوں کے لئے ایک اسکول ہے جس میں دو سو سے زیادہ لڑکیاں پڑھتی ہیں ۱۹۳۳ء میں اس مدرسہ کی معلمات کی تعداد ۲۴ تھی، یہ تعلیمگاہیں شہر میں ہیں ۔

اس طرح ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم تک کا اہتمام کر کے یونیورسٹی اپنے مقاصد کی تکمیل میں سرگرم ہے ۔ اس میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے اور کبھی بیرون ہند سے بھی طلبہ آتے ہیں ۔ نادار اور ہونہار طلبہ کو فیس معاف کر دی جاتی ہے اور تعلیمی وظائف بھی دئے جاتے ہیں ۱۹۳۳ء میں اسکولوں کے طلبہ کے علاوہ یونیورسٹی کے متعلمین کی تعداد ۳۵۰۰ تھی اور معلمین کی تعداد ۲۰۰ سے زائد تھی ۔

یونیورسٹی کے شعبہائے تعلیم میں صنعت و حرفت کی تعلیم کا شعبہ بہت مفید اور کامیاب ثابت ہو رہا ہے، یہاں کے تعلیم پائے ہوئے کتنے نوجوان کامیاب زندگی گزار رہے ہیں، اس شعبے میں نوجوانوں کو تیل، عطر، لونڈر، پاؤڈر، رنگ، سٹیل پنسل، چاک، کھلونے، چینی کے برتن، چوڑی، وغیرہ روزمرہ استعمال میں آنے والی چیزوں کی صنعت سکھائی جاتی ہے، اس شعبے نے ایک خاص طریقہ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ گھی کی تحقیقات کی جاتی ہے اور چربی کی آمیزش صحیح طور پر معلوم کر لی جاتی ہے - اس کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے میونسپلیٹیوں کے کتنے ہیلتھ آفیسر یہاں آچکے ہیں ۔

حکومت ہند اور ریاستیں وظائف دے کر اپنے طلبہ کو کام سیکھنے کے لئے بھیجتی ہیں، یہاں کے انجنیئرنگ کالج نے اب تک انجنیئروں کی ایک بڑی تعداد تیار کر کے ملک کی گراں بہا خدمت انجام دی ہے، معدنیات اور کان کنی نیز دھات گلانے کی تعلیم دینے والے شعبوں سے بھی ملک کو زبردست فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔

دوا سازی کی تعلیم کا شعبہ بھی قائم ہے، اس شعبے کے کامیاب ہو جانے کے بعد یہاں دوائیں تیار ہونے لگیں گی اور ایک بڑی رقم جو دواؤں کی قیمت کی صورت میں ملک سے باہر چلی جاتی ہے بچ جائے گی

(۲) ہندی پبلکیشن بورڈ:- ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا مقصد ابتدا ہی سے یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کے پیش نظر رہے اور اب تک اس میں ایک گونہ کامیابی بھی حاصل ہو چکی ہے، اسی غرض سے یونیورسٹی میں ایک ہندی پبلکیشن بورڈ قائم ہے، جو سائنس اور حکمت کی کتابیں ہندی میں تیار کر رہا ہے۔

(۳) کتب خانہ:- یونیورسٹی کے ماتحت ایک کتب خانہ بھی ہے، اس میں مختلف علوم و فنون کی تقریباً دس ہزار کتابیں ہوں گی۔ ملک کی تازہ ترین عمدہ تصانیف برابر کتب خانہ میں آتی رہتی ہیں، جو کتابیں روزمرہ کی ضروریات کی ہیں وہ متعلقہ کالجوں میں رہتی ہیں، باقی کتابوں سے طلبہ اور اساتذہ کو ہر وقت فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل رہتا ہے۔

یونیورسٹی کی آبادی

یونیورسٹی کی آبادی تقریباً ۲ میل کے طول اور سوا میل کے عرض میں ۱۳۰۰ ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس آبادی میں ۲۱ میل لمبی متعدد سڑکیں ہیں جن کا بیشتر حصہ پختہ ہے، یونیورسٹی کی عمارتیں بعض کے علاوہ سب ایک خاص ترتیب سے بنائی گئی ہیں۔ ایک قطار میں اساتذہ اور افسران جامعہ کے سکونتی مکانات ہیں، دوسری قطار میں دارالطلبہ کی عمارتیں ہیں جن کے سامنے کھیل کے میدان ہیں، میدان کے بعد ایک لائن میں کالج کی عمارتوں کا سلسلہ ہے، ان عمارتوں کے بعد پھر میدان ہے، جتنے میدان ہندو یونیورسٹی میں ہیں شائد ہندوستان کی کسی تعلیم گاہ میں نہ ہوں گے، چند خاص قابل ذکر چیزیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) طلبہ کے لئے سات ہوسٹل ہیں جن میں سے ایک میں نسوانی کالج کی طالبات رہتی ہیں اور بالائی منزل پر ان کا کالج قائم ہے، علوم قدیمہ کی تعلیم کا کالج بھی ہوسٹل ہی کے ایک بالاخانے میں ہے۔

(۲) آرٹس کالج کی عمارت:- اس کالج کی عمارت مندر نما ہے۔ اور اتنی مستحکم اور شاندار بنی ہوئی ہے کہ راجگانہ عمارتوں سے چشمک زنی کرتی ہے، اسی عمارت کے بالائی حصے میں پرو وائس چانسلر اور رجسٹرار کے دفتر ہیں، خزانہ اور بکڈپو ہے، زیریں حصے کے ایک گوشے میں دارالمطالعہ قائم ہے، وسط کا وسیع ہال جلسوں، لکچروں اور تقریبوں کے کام آتا ہے۔

(۳) ایک عمارت میں علم الحیوانات وعلم النباتات کی تعلیم ہوتی ہے۔

(۴) ایک عمارت ہے جس میں علم الکیمیا کی تجربہ گاہ ہے، اسی عمارت کے مختلف حصص میں کان کنی، دوا سازی، معدنیات اور صنعت و حرفت کی تعلیم دی جاتی ہے۔

(۵) صنعت و حرفت کی درسگاہ کے قریب ایک گیس پلانٹ ہے جہاں گیس تیار ہوتی ہے۔

(۶) زراعتی کالج کے لئے علیحدہ عمارت موجود ہے۔

(۷) انجنیئرنگ کالج کی عمارت، فیکٹری اور ورکشاپ کی عمارتیں۔

(۸) لائبریری کی شاندار عمارت۔

(۹) شیواجی ہال، جس میں ورزش وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

(۱۰) سندر لال دواخانہ کی عمارت۔

(۱۱) آریوویدک فارمیسی کی عمارت۔

(۱۲) ایمپی تھیٹر۔ یہاں بیٹھ کر ہزاروں آدمی کھیل کود کا سالانہ مقابلہ دیکھتے ہیں۔

(۱۳) ڈیری فارم۔

(۱۴) آیورویدک باغ۔

(۱۵) علم النباتات کی تعلیم کے لئے سبزہ زار۔

ابھی یونیورسٹی کے ہر شعبے میں مسلسل ترقی ہو رہی ہے اور نئے نئے شعبے جاری کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، وسیع پیمانے پر ایک مطبع بھی قائم ہونے والا ہے، ایک مندر کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا ہے جو مجوزہ نقشے کے مطابق تیار ہونے کے بعد ایک بےنظیر مندر ہوگا۔

آبادی کی صفائی اور عمارتوں اور سڑکوں کی مرمت خود یونیورسٹی کے ذمے ہے، پانی اور روشنی کا انتظام بھی وہی کرتی ہے، یونیورسٹی کے انجنیئرنگ کالج کا پاور ہاؤس برقی روشنی مہیا کرتا ہے اور بجلی کے کوئیں اور پمپ سے پانی بہم کیا جاتا ہے۔

"لطفِ شب"

دیدنی تھا بزمِ عشرت کا سماں کل رات کو
حُسن در آغوش تھا سارا جہاں کل رات کو

میکدے کا گوشہ گوشہ کیف سے معمور تھا
چل رہا تھا سکّۂ پیرِ مغاں کل رات کو

دَور تھے آنکھوں ہی آنکھوں میں مئے خوش رنگ کے
رقص کرتی تھی عروسِ کہکشاں کل رات کو

ہر نفس کا زیر و بم تھا نغمۂ ناہید اثر
ہر نفس پر کوندتی تھیں بجلیاں کل رات کو

چادرِ سیماب تھی یا نُور کا طوفان تھا
روشنی برسا رہا تھا آسماں کل رات کو

چاند کے جھرمٹ میں تھا روشن ستاروں کا ہجوم
ہو رہی تھیں انجمن آرائیاں کل رات کو

ہنس رہے تھے انجمِ شب تاب فرطِ جوش سے
لُٹ رہی تھی دولت کون و مکاں کل رات کو

دہر کی ہر شے پہ چھایا تھا شبابِ رنگ و بو
تھا جہاں کا ذرّہ ذرّہ نوجواں کل رات کو

تھے گُل و گلزار گویا رشکِ فردوسِ بریں
جلوہ افگن تھی بہارِ جاوداں کل رات کو

فرطِ شادی سے چمن کا ذرّہ ذرّہ مست تھا
لے رہی تھی بوئے گُل انگڑائیاں کل رات کو

نو عروسانِ چمن سب ہو گئے تھے بے نقاب
نوجوانانِ چمن تھے شادماں کل رات کو

ہر طرف موجِ ہوا پھیلا رہی تھی بوئے دوست
منتشر تھی گیسوئے عنبر فشاں کل رات کو

دہر کی ہر شے شگفتہ تھی فضا تھی عطر بیز
منتشر تھیں حُسن کی رنگینیاں کل رات کو

بام و در سے ہو رہی تھیں زندگی کی بارشیں
محوِ خوابِ ناز تھا خوابِ گراں کل رات کو

رنج و غم دنیا میں گویا نام کو باقی نہ تھا
تھی مسرت ہی مسرت حکمراں کل رات کو

اِس ہجومِ رنگ و بو میں سانس لینا تھا محال
رُک گیا تھا زندگی کا کارواں کل رات کو

بادشاہِ عشق تھا، میری حکومت تھی سلیم
زینتِ محفل تھی وہ نورجہاں کل رات کو

سلیم (حیدرآباد دکن)

تعلیمات

جاپان کی ترقی میں تعلیم کا حصّہ

جاپان کی ترقی میں جاپان کی تعلیم کا خاص حصّہ ہے تعلیم جاپان کی ایک زبردست طاقت ہے، جاپانی حکومت اور جاپانی پبلک دونوں نے تعلیم کے اس اصل اصول کو اپنی عملی زندگی میں داخل کر لیا ہے کہ کسی ملک کے اقبال و ادبار کا دار و مدار معیارِ تعلیم کی بلندی و پستی اور ترقی و تنزل پر ہے، یہی وجہ ہے کہ جاپانی حکومت اور جاپانی پبلک دونوں تعلیم کو بلند، عملی اور عام بنانے میں اپنی بہترین مساعی صرف کر رہی ہیں۔

جاپان میں ابتدائی تعلیم لازمی ہے، چھ برس سے چودہ برس تک کی عمر کا کوئی جاپانی بچہ ایسا نہیں جو اسکول نہ جاتا ہو، پورے جاپان میں ایک خاندان بھی آپ کو ایسا نہ ملے گا جو ناخواندہ ہو، خاندان تو خاندان ایک فرد کا بھی علم سے بے بہرہ ملنا مشکل ہے۔ تعلیم کے معاملے میں اعلیٰ و ادنیٰ، مالدار و مفلس، مالک و مزدور، کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا، تمام ابنائے ملک کو نوشت و خواند سے بہرہ ور کرنا حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے۔

جاپانی درسگاہوں کی تعلیم ہندوستانی اسکولوں کی طرح صرف کتاب خوانی تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ نونہالانِ ملک کو چودہ سال کی عمر تک جو اُن کی ابتدائی تعلیم کی تکمیل کا زمانہ ہے حصولِ معاش کے قابل بنا دیا جاتا ہے اور وہ اس لائق ہو جاتے ہیں کہ.... ذمّہ دارانہ زندگی کے میدان میں قدم زن ہونے کے بعد عملی مشکلات کے مقابلے سے عہدہ برآ ہو سکیں، جاپان کی صنعتی و تجارتی ترقی کا خاص سبب وہاں کی عملی تعلیم اور اس کی عمومیت ہے۔ آپ جاپان جائیں اور اس کی تعلیمی جدوجہد کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تعلیم کے لائق سو فیصدی بچے مصروفِ تعلیم ہیں۔

جاپانی بچوں کی غائتِ تعلیم معلوم کرنے کے لئے آپ کو جاپان کے آئینِ حکومت کے حسبِ ذیل مقاصدِ تعلیم ملاحظہ کرنے چاہئیں:۔

"اس تعلیم میں بچوں کو قوم اور قبیلے کے بہترین ارکان بنانے پر خاص توجہ کی جائے گی، علاوہ بریں عملی زندگی میں عام طور پر جسقدر علم و ہنر کی ضرورت ہوتی ہے اس کی تعلیم بھی ہوگی، ساتھ ہی بچوں کی جسمانی نشو و نما کا بھی کامل لحاظ رکھا جائے گا۔"

جاپانی درسگاہوں کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اُن میں بچوں کو جو تعلیم دی جائے اس سے وہ عملی زندگی میں مستفید ہو سکیں، چنانچہ وہاں کی درسگاہوں میں بچوں کو انہیں مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے جن کا تعلق ان کی عمومی زندگی سے ہوتا ہے اور جو اُن کی آئندہ زندگی کے لئے مفید اور کارآمد ہوتے ہیں۔

جاپانی بچوں میں خود اعتمادی و خودداری کا مادہ پیدا کرنا جاپانی تعلیم کے اصولِ خاص میں داخل ہے، وہاں بچوں کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے کہ جوان ہو کر وہ دوسروں کا سہارا تلاش نہ کریں، ان کے اندر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا جذبہ کارفرما ہو، وہاں کے اسکولوں میں بچوں کے جذبات و احساسات کو دبانے اور پامال کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی، بلکہ انہیں برانگیختہ اور بیدار کیا جاتا ہے، نصابِ تعلیم سے باہر کے سوال پر ماسٹر انہیں ڈانٹ کر خاموش نہیں کر دیتے انہیں تسلی بخش جواب دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تاکہ وہ اسی طرح غور و فکر اور شوق و حوصلہ سے کام لیا کریں۔

جاپانی طریقۂ تعلیم محض اسباق رٹوانے پر مبنی نہیں ہے، اس میں بچوں کی ذہنی وسعت و بلندی کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہاں پر اعلیٰ تعلیمیافتہ معلم نہیں ہو سکتا، اس کے لئے طریقۂ تعلیم کا ماہر ہونا بھی ضروری ہے، وہاں لڑکوں کو زدوکوب

کرنے کا دستور نہیں ہے، بچوں کے لئے اتنی سزا کافی سمجھی جاتی ہے کہ انہیں دیر سے چھٹی دی جائے یا کھیل میں شریک نہ کیا جائے۔ وہاں بچوں کی سزا دہی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ انہیں اسکول آنے سے روک دیا جائے، اس سے آپ جاپانی تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی خوبی و خوشگواری کا اندازہ فرما سکتے ہیں، اسکول نہ آنے دینے کو بچہ سزا تصور کرتا ہے۔

ابتدائی درسگاہوں میں تعلیم مفت ہے، پھر بھی کوئی خاندان اپنے بچوں کو تعلیم دلانے سے قاصر ہو تو حکومت اور پبلک کی جانب سے امداد کے انتظامات موجود ہیں، اس لئے جاپان میں افلاس و ناداری کے باعث کوئی بچہ ناخواندہ نہیں رہ سکتا۔

جاپان کی اسی کامیاب تعلیمی جد و جہد اور سرگرمی نے اپنے ملک کو اس قابل بنا دیا ہے کہ ان کا ہر فرد ملک کی ترقی میں مشین کے پرزوں کی طرح اپنے فرائض کامل و خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے۔

ترکی کی تعلیمی سرگرمیاں

اتاترک مصطفٰے کمال کے ذریعہ خداوند قدوس نے ترک قوم کو جو برکات و حسنات عطا فرمائی ہیں، ان کا شمار و اعادہ دشوار ہے۔ ترکی میں ابتدائی تعلیم لازمی ہو چکی ہے اور ہر طرح کی تعلیم مفت دی جاتی ہے، بعض اعلیٰ مدارج تعلیم میں امراء کے لڑکوں سے فیس لی جاتی ہے، لیکن عام طور پر ان درجوں میں بھی مفت ہی تعلیم دی جاتی ہے، اس لئے وہاں عام حیثیت کے لوگوں کی اولاد کو بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں۔

ابتدائی سکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ایک ساتھ ہوتی ہے، بعض کالجوں میں بھی مخلوط تعلیم کا طریقہ جاری ہے اور بعض تعلیم گاہیں ایسی ہیں جن میں صرف لڑکے تعلیم پاتے ہیں یا صرف لڑکیاں پڑھتی ہیں۔

مدرسوں کا نظام کاملاً جمہوری ہے، ہر مدرسہ سے متعلق ایک مجلس منتظمہ ہوتی ہے جس میں اساتذہ کے ساتھ طلبہ بھی داخل ہوتے ہیں، طلبہ کو مجلس میں بیٹھ کر آزادی کے ساتھ رائے دینے کا حق حاصل ہے، وہ انتظامی معاملات میں اپنے اساتذہ کے خلاف بھی رائے دیتے ہیں، یہ مجلس تعلیم گاہ کے پورے انتظام و اہتمام کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

ترکی اسکولوں میں طلبہ کو جسمانی سزا دینے کا قاعدہ نہیں ہے۔ صرف اخلاقی سزا دی جاتی ہے وہ بھی اس ضابطے اور آئین کے ساتھ کہ ان کی حمیت و خودداری پامال و مجروح نہ ہو، طلبہ کو جو سزائیں دی جاتی ہیں ان کی دوسروں کو خبر بھی نہیں ہوتی، لڑکا، ماسٹر، اور لڑکے کا سرپرست، تین کے علاوہ چوتھا نہیں جان سکتا کہ کس لڑکے کو کیا سزا دی گئی۔ ہر لڑکے کی سزا دہی کے لئے ایک علیحدہ رجسٹر ہوتا ہے، اس میں اس کی سزا درج کی جاتی ہے، ایک لڑکے کے رجسٹر کو دوسرا لڑکا نہیں دیکھ سکتا۔

کامیاب امتحان طلبہ کو کسی قسم کا انعام نہیں دیا جاتا، طلبہ کا تمول و افلاس بھی پردۂ اخفا میں رکھا جاتا ہے۔ ان سب کی غرض و غایت یہی ہے کہ طلبہ ایک دوسرے کے مقابلے میں ذلیل نہ ہوں، ترکی کا یہ اخلاقی نکتہ ہندوستانی درسگاہوں میں بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے۔

چودھری احسان الحق
بی۔اے

موت

وہ قریب آرہی ہے، ہر صبح میں اُسے نزدیک تر پاتا ہوں۔
کوئی اس کے آنے سے رنجیدہ ہے، کوئی مسرور۔
لیکن جب اس کا آنا یقینی ہے، تو کیوں نہ میں اپنا کام جلد ختم کر دوں۔
میرے ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے سے اس کی رفتار تو کم نہ ہوگی۔

محمد ایوب

مُحاسبہ

(بارگاہِ ایزدی میں ایک محبّت آمیز گُستاخی)

یہ نظم عدمؔ صاحب نے حضرتِ تاجورؔ کی نظم "عیدِ شدید" سے متاثر ہو کر لکھی ہے جو ماہ فروری کے شاہکار میں شائع ہو چکی ہے۔

(یزدانی)

پڑھ کے تیرا مرثیہ اے شاعرِ افسردہ دل — ہو گئی ہے زندگی کی ہر مسرّت مُنفعل

اِس جہاں کو ایک بے قیمت سی شئی پاتا ہوں میں — فکر کی گہرائیوں میں ڈوبتا جاتا ہوں میں

رُوح میں چُبھتا ہوا سا ایک استفسار ہے — کیا خدا انسان سے بھی برسرِ پیکار ہے؟

میرا استفسار الحق اِطالبِ تصریح ہے — زندگی کیا اُس تماشاگر کی اک تفریح ہے؟

کچھ کھلونے سے بناتا ہے، مٹا دیتا ہے وہ — کتنے دل اِس کھیل میں لیکن دُکھا دیتا ہے وہ

دل جسے کہئے خدائے عشق کے سجدوں کا فرش — دل کہ جس کے سامنے کچھ بھی نہیں تو قیرِ عرش

دل کھلونا ہے، مگر ذی رُوح اور حسّاس ہے — زندگی کا ایک گردابِ امید و یاس ہے

دل، غریب انسان کا دل، سنگِ بنیادِ جہاں — حوصلہ ور، حاملِ بارِ زمین و آسماں!

دل کہ جس کی طاقتوں پر چل رہی ہے کائنات — دل، خداوندِ عمل، سرچشمۂ سوزِ حیات

دل، خدا کے فلسفے کو جس نے بخشی زندگی — جس کے دم سے محفلِ ہستی میں ہے تابندگی

دل نہ ہوتا گر بشر کے پاس تو معدُوم تھا — اک فرشتے کی طرح احساس سے محرُوم تھا

ہے فرشتہ وہ بشر، جو قلب سے محروم ہے — جس کے لب پر صرف "یا جبار" و "یا قیوم" ہے

آہ! انساں نے سنبھالے کاروبارِ کائنات — ہمتِ انساں پہ ہے سب انحصارِ کائنات

اور یزداں آزماتا ہے بشر کو اور ابھی — کر رہا ہے مشتعل دردِ جگر کو اور ابھی

مانتا ہوں میں اجل فطرت کا اک انعام ہے — تلخ بے حد آدمی کی زندگی کا جام ہے

مانتا ہوں میں کہ یہ اُس کا اٹل قانون ہے — موت اُس افسانہ گر کا آخری مضمون ہے

موت کیا خود فطرتِ بالغ نظر مجبور ہے — موت سے فطرت کو عرفانِ بشر منظور ہے

موت کے قبضے میں کچھ ایسے بھی ہیں اونچے مقام — جس جگہ پہنچا نہیں عقل فرو ہمت کا کام

بالیقیں کچھ ماورائے بزمِ آب و گل بھی ہے — علم ظاہر ہی نہیں دنیا میں، علمِ دل بھی ہے

مانتا ہوں موت بھی اک راز کی تفسیر ہے — عشق کو بیدار کرتا ہے جو، یہ وہ تیر ہے

عشق کیا ہے علمِ باطن، عشق کے اعجاز سے — آدمی ہوتا ہے واقف ایک اونچے راز سے

پھر بھی دل تو ٹوٹ جاتا ہے تلافی اس کی کیا — آئینہ جو پھوٹ جاتا ہے تلافی اس کی کیا

میں تسلی کا نہیں قائل، مرا دل چور ہے — جو سزا دے گا مجھے میرا خدا منظور ہے

میں کروں گا حشر کے دن سب سے پہلے یہ سوال — ساتھ میرے دفترِ اعمال کے لے ذوالجلال

اپنے روشن کارناموں کی گرہ بھی کھول لے

اپنی جباری کو میری بیکسی سے تول لے

عدم

میں آپ کو کیا سمجھتا ہوں

سلسلۂ سوال و جواب میں میری ایک مختصر تنقید کی تردید میں مرزا یگانہ لکھنوی نے مضمون بھیجا ہے، اُن کا اصرار ہے کہ حرف بہ حرف شائع کیا جائے اور اپنے لئے القاب جو انہوں نے تجویز کئے ہیں اُن کی اشاعت پر بھی مصر ہیں، چونکہ میری تنقید کے جواب میں یہ مضمون آیا ہے اس لئے میں اصولِ صحافت کا احترام کرتے ہوئے اسے صاحبِ مضمون کے حسب ایما ر ایک حرف کی تبدیلی کے بغیر شائع کر رہا ہوں۔ میری تنقید کے بعض فقروں سے انہوں نے ایسے معنی اخذ کر لئے جو میرے ذہن میں نہ تھے۔ بلند خیالات، سہل زبان اور عام فہم اندازِ بیان میں نظم کرنا میرے نزدیک بھی کمالِ شاعری میں داخل ہے۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ مرزا صاحب کے کلام میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی، مگر پھر بھی وہ یہ خیال رکھتے ہیں کہ اُن کا کلام اگلی صدی کے لوگ سمجھیں گے۔ بہرحال میں اپنے اشاعتی اقتدار سے کوئی بجا فائدہ بھی اُٹھائے بغیر اس مضمون کو شائع کرتا ہوں، اگرچہ میری خواہش تھی کہ وہ اندازِ بیان میں متانت و سنجیدگی کو ملحوظ رکھتے۔

(تاجور)

میرے مہربان دیرینہ مولانا تاجور صاحب سے کسی نے میری شاعری کے متعلق رائے دریافت کی، آپ نے اپنے رسالہ شاہکار میں اس کا جواب دیتے ہوئے میری شاعری کی کچھ ادھوری سدھوری تعریف کر کے میرے کیرکٹر کو بھی لپیٹ لیا یعنی وہی پرانا دکھڑا کہ "میرزا یگانہ شعرائے لکھنؤ نیز غالب کے خلاف "چھچھورپن" سے کبھی باز نہیں آتے اور اب تک اس کا خمیازہ جھیل رہے ہیں۔"

سوال تو تھا شاعری کے متعلق، مگر وہاں کیرکٹر اور سوانح حیات پر بھی "تنقید" ہونے لگی۔ آخر غالب کے خلاف چھچھورپن سے کیوں باز آتے؟ چھچھورپن کو چھچھورپن تو وہ سمجھے جو شریف و مہذب ہو۔ میرزا یگانہ نے جب تہذیب و شرافت پر لات مار کر، سیاں شہد سے کے ساتھ صیغہ اخوت پڑھ کر اسے اپنا منہ بولا بھائی بنا لیا تو پھر تہذیب و شرافت کی توقع رکھنا کیا معنی؟

شیخ تو نے خوب سمجھا میر کو
واہ وا اے بے حقیقت واہ وا

خیر آپ نے جو کچھ مجھے سمجھا سمجھا، غلط ہو یا صحیح، مگر دیکھنا تو یہ ہے کہ میں آپ کو کیا سمجھتا ہوں۔

آپ فرماتے ہیں:۔

(۱) "میرزا یگانہ طنزیات کے مالک ہیں۔" بیشک بہت سچی تعریف فرمائی۔

(۲) "کلام میں پختگی ہے۔" درست فرمایا، مگر یہ بھی تو فرمایا ہوتا کہ کلام یگانہ اُن خامیوں سے پاک و صاف ہے جو غالب کے ہاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

(۳) "سوز و ساز، ناکامی و نامرادی کے جذبات سے کلام معمور ہے۔" یہ تعریف بھی ایک حد تک درست ہے، مگر ناقص اور گمراہ کُن۔ سوز و ساز تو قیامت کا ہے مگر کہیں تو یہ سوز و ساز آشکارا ہے اور کہیں طنزیات کے پردے میں اس طرح چھپا ہوا ہے کہ درد آشنا بالغ نظروں کے سوا عام لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا البتہ درد کا ایک اجمالی اثر ضرور پڑتا ہے۔ ناکامی و نامرادی کی کیفیات جسقدر ہیں وہ نہ ہمہ تن آپ بیتی ہیں نہ ہمہ تن جگ بیتی۔ ذاتی و شخصی واردات بھی ہیں اور خارجی مشاہدات کے مرقعے بھی ہیں، مگر ان تمام سوز و گداز کے علاوہ جوش و خروش، عالی حوصلگی و اولوالعزمی، خودشناسی و خوداعتمادی بھی میرزا یگانہ کے طرزِ زندگی اور ان کی شاعری میں نمایاں ہے کہ ایک اندھا بھی ٹٹول کر دیکھ سکتا ہے۔

(رباعی)

دیوانہ روی کا حق ادا کرتا چل ÷ چلنا تو یہی شور بپا کرتا چل
گردش میں بھنور ہی بونڈلا چکے ہیں ÷ ہاں تو بھی یوں ہی رقص فنا کرتا چل

دیکھو Pessimism میں Optimism کا مستانہ بانکپن کیا جوش و خروش دکھا رہا ہے، ناممکن ہے کہ مذاق عامہ اتنی حسین اتنی ارفع و اعلیٰ سخنوری کی قدر پہچان سکے۔

مطلع

مستانہ رقص کیجئے گرداب حال میں
بیڑا ہے پار ڈوب کر اپنے خیال میں

اپنے خیال میں غرق ہو کر پار ہو جانا ایک ایسی حقیقت کبریٰ ہے جہاں نظری حیثیت سے بھی پہنچنا دشوار ہے مگر ایسے لوگ بھی دنیا میں ہوتے ہیں جو محض قوتِ خیال کی بدولت تمام مشکلوں سے نجات پا جاتے ہیں۔ ہرگز مذاق عامہ اس شاعری کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا ؎

ہاں کیوں نہ پار اتر چلوں خمیازہ جھیل کر
ڈوبے مری بلا عرق انفعال میں

یہ ہے میرزا یگانہ کا شخصی کیرکٹر۔ شرم و ندامت کی بلا میں گرفتار رہنے سے رُوح ذلیل ہو جاتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ گناہوں کا خمیازہ جھیل کر پار اتر جاؤ۔ بڑے پلے کا شعر ہے، جس کی سمجھ میں آ جائے وہ دوسرے لفظوں میں اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرے تو عجب نہیں، بعض معاصرین یہی کر رہے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں اور ہنستا ہوں ؎

مستِ انا بھلے کو پیمبر نہ بن گیا
سوجھی تو خوب نشۂ بے اعتدال میں

واللہ نگاہِ شوق کی معراج ہے یہی
وہ خواب دیکھئے جو نہ آئے خیال میں

ممکن کی آرزو میں مُوئے کتنے نامراد
اچھی گزر گئی مری فکرِ محال میں

غور کیجئے، ان اشعار کے مطالعہ سے دل میں جوش و خروش پیدا ہوتا ہے یا افسردگی؟ ؎

چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا
دلیلِ راہِ محبّت ہے فیصلہ دل کا

دُھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا
نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

کبھی تو موج میں آئے گا تیرا دیوانہ
اشارہ چاہئیے ہے جنبش سلاسل کا

دل کو لہراتا ہے ہنگامۂ زندانِ بلا
شورِ ایذا طلبی وجد میں لاتا ہے مجھے

پائے آزاد ہے زنداں کے چلن سے باہر
بیڑیاں کیوں کوئی دیوانہ پہناتا ہے مجھے

صبر اتنا نہ کر کہ دشمن پر
تلخ ہو جائے لذت بیداد!

جل جلالہٗ مسلمات عامہ کے خلاف اُلٹی بات کہی۔ ترک صبر کی تلقین کی ہے مگر کس جذبے کے تحت؟ دشمن کے جذبۂ ستم پروری کا پاس و لحاظ ہے۔ تڑپ لو جتنا تڑپ سکو، کیونکہ یہی مقصد یہی مُدعا ہے دشمن کا کہ تمہیں تڑپتا دیکھ کر خوش ہو۔ صبر و سکوت سے کام لو گے تو دشمن کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ ستم پروری کا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ عملی طور پر تو کجا نظری حیثیت سے بھی اخلاق کی اس بلندی پر پہنچنا دشوار ہے۔ ناممکن ہے کہ پبلک اس مذاقِ شعری تک پہنچ سکے یا اردو لٹریچر ایسے اشعار کا جواب پیش کر سکے۔ گزشتہ تیس سال کے اندر کیا کیا حیرت انگیز حقائق و معارف شاعرانہ آرٹ کے ذریعہ سے یگانہ نے پیش کئے مگر ملک نے سمجھا تو یہ سمجھا کہ میرزا یگانہ کے خیالات محدود ہیں، محاورہ بازی کر لیا کرتے ہیں۔

لاحول ولاقوۃ! مگر "محاورہ بازی" بھی ایک قدرتی جوہر ہے ہر ایک کے بس کی بات نہیں ؎

لپٹتی ہے بہت یادِ وطن جب دامنِ دل سے
پلٹ کر اک سلام شوق کر لیتا ہوں منزل سے

نہیں معلوم کیا لذت اُٹھائی ہے اسیری میں
دلِ وحشی پھڑک اُٹھتا آوازِ سلاسل سے

تصوّر نے دکھایا شاہدِ مقصود کا جلوہ
اُتر آئی ہے لیلیٰ سرزمینِ دل پہ محمل سے

سرزمینِ دل پر لیلیٰ خود اُتر آئی ہے۔ جل جلالہٗ۔ فرمائیے دل و دماغ کو تازگی و شگفتگی محسوس ہوتی ہے یا پژمردگی۔ حیات انسانی

واردات وکیفیات رنگارنگ کا مجموعہ ہے رنگا ہے چنیں گاہے چناں جس میں تلخی وشیرینی۔ انبساط وانقباض سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یگانہ کے کلام میں سوز وگداز بہت زیادہ اور بدرجہ کمال پایا جاتا ہے۔ (اگر یہ سوز وگداز نہ ہوتا محض انبساط ہی انبساط ہوتا تو میرزا یگانہ ایک سچے شاعر کہے جانے کے مستحق نہ ہوتے کیونکہ حیات انسانی کی ترجمانی محض تصویر انبساط سے مکمل نہ ہوتی) مگر یہ سوز وگداز وہ ہے جو مردوں کے شایاں ہے پست ہمتوں کی نالہ وزاری نہیں ہے۔ وہ ناکامی جس سے ہمت ومردانگی کے جوہر مٹنے کی بجائے اور زیادہ نشو ونما پاتے ہیں۔ وہ ناکامی جو آئندہ کی کامیابی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ وہ ناکامی جو میرزا یگانہ کو اپنے جادۂ مستقیم سے پیچھے نہ ہٹا سکی۔ آگے ہی بڑھتے گئے جس کا زندہ ثبوت غالب شکن ہے ؎

ناخدا زمن بگزر سوئے دیگراں بنگر
کارِ من بدریا در، دست وپا زدن تنہا

بھلا ناکامی وبیکسی ایسے اولوالعزم افراد کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ ہولناک ماحول میں بھی دل اتنا قوی ہے کہ خوف وہراس کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ ہمت وغیرت یہ کہتی ہے کہ ناخدا ہٹ جا میرے پاس سے۔ دوسرے کی خبر لے۔ چھوڑ دے مجھے تنہا تلاطم میں ہاتھ پاؤں مارنے دے۔ ایسے نازک وقت میں بھی، ناخدا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بجائے دوسروں کی طرف متوجہ ہونے کی ہدایت کرتے ہیں۔ عالی حوصلگی و خود اعتمادی، ایثار وہمدردی کا جذبہ ایسے وقت میں بھی کام کر رہا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ایسے عالی حوصلہ انسانوں کی ناکامی بھی خود غرضوں کی کامیابیوں سے ارفع واعلیٰ ہے۔ طوفان بغاوت کا مقابلہ کرنا۔ اپنی اولوالعزمی کا امتحان لینا، ابنائے زمانہ کی حاسدانہ و مخاصمانہ طاقتوں کو آزمانا یگانہ کی عملی زندگی ہے۔ اپنا بھی امتحان کر لیا اور مخالفین کا زور بھی آزما لیا Pessimism میں بھی... Optimism کا پہلو نکال لیا۔ ابنائے زمانہ نے یگانہ کی ذہنیت کو ان کے مرکز خاص سے ہٹا کر اپنے معیار پہ کھینچ لانے، ان کی ہمتوں کو پست کر دینے کی امکانی تدبیریں کیں تو سہی مگر تمام مشکلوں کو ٹھکراتے ہوئے آگے ہی بڑھتے گئے (غالب پرستی کے دور میں غالب شکن سا شورش انگیز رسالہ لکھ دینا کیا آسان تھا؟) اور ادبی دنیا میں اپنی طرز زندگی کی قابل تقلید مثال پیش کر کے ترانہ اور آیات وجدانی جیسے کلاسیکل آرٹ کا اضافہ کر دیا۔ اقتصادی ناکامیوں کے باوجود اپنے ادبی مشن میں کامیاب رہنے کی زندہ مثال یگانہ کی شخصیت ہے ؎

میں کہاں اور کہاں کے پست و بلند
ایک ٹھوکر میں تھا بکھیڑا پاک!
بولو جے میرزا یگانہ ـــــ کی
پھڑک اٹھے چچا میاں تہ خاک!

(۳) ان کی شاعری کے مضامین وخیالات محدود ہیں مگر اندازِ بیان سے تکرار خیالات کو تازہ کر دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔"

مولانا کی رائے سچ اور جھوٹ کی معجون مرکب ہے۔ تکرار خیالات اور تکرار شعر میں بڑا فرق ہے۔ ایک خیال اگر پانچ سات اشعار میں مکرر نظم ہوا ہے تو اس ایک خیال کے ساتھ مختلف اشعار میں اور کچھ خیالات بھی ہیں یعنی مکرر اور غیر مکرر خیالات کے مجموعہ سے ایک شعر دوسرے سے یقینی مختلف ہے یعنی ایک مکرر خیال کا حامل ہونے کے باوجود ہر شعر اپنی ایک مستقل ہستی رکھتا ہے۔ یہ تکرار خیال ویسی ہی ناقابل لحاظ ہے جیسی میر و غالب کے ہاں۔ یہ بحث ایک جداگانہ مضمون چاہتی ہے۔ مکرر دمنشا یہ خیالات کے اشعار کو خارج کر دیجئے۔ اس کے بعد دیکھئے گا تو اچھوتے مضامین آرٹ کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اس کثرت سے بیسویں صدی کے کسی غزل گو کے ہاں نہ ملیں گے۔ اس دائرہ بحث سے قومی و سیاسی و مذہبی نظمیات کے ڈھول ڈھمکے باہر ہیں۔

مولانا نے یہ عجیب الٹی بات کہی کہ میرزا یگانہ کے ہاں خیالات محدود ہیں۔ اے سبحان اللہ۔ وہی مختصر سا مجموعہ آیات اور وہی مختصر سا ترانہ جو بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے تازگی وشگفتگی مضامین۔ حکیمانہ ودردمندانہ حقائق زندگی۔ مردانہ وشریفانہ آئیڈیل اور حسن عمل کا حیرت انگیز مرقع ہے (شاعروں کو وجد میں لانے والا اور نقالوں کا جی چھڑا دینے والا) اسی سے انکار کیا گیا ہے۔ اس انکارِ عظیم پر پبلک کی ادبی ترقی جتنا ناز کرے بجا ہے۔

میرزا غالب کے ہاں مکمل آرٹ کے نمونے چالیس پچاس یا زیادہ سے زیادہ ایک سو اشعار ہیں۔ برخلاف اس کے

یگانہ کی آیات وجدانی میں ایسے مکمل اشعار کی تعداد تین سو سے کم نہیں یعنی غالب سے سہ چند۔ اور ترانہ کا تو کسی سے تقابل ہی بیکار ہے کیونکہ اردو میں اس آرٹ کا جواب ہی نہیں۔ اس پر بھی کوئی انکار کرے تو وہ جانے اور اس کا ضمیر!

(۵) "ان کا خیال ہے کہ میرا کلام اگلی صدی کے لوگ سمجھیں گے۔ میری رائے میں یہ اپنے متعلق حسن ظن ہے یا اس صدی کے لوگوں سے سوء ظن۔ کیونکہ ان کے کلام میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی یا یوں کہہ لیجئے کہ اسقدر آسمان پیما رفعت نہیں ہے کہ اگلی صدی کے لوگ جو مریخ والوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائینگے ان کی رفعت کا اندازہ کر سکیں گے۔"

مولانا کی یہ رائے اگرچہ یگانہ پر طعن و تشنیع کی نیت سے ہے مگر اس میں بھی یگانہ کی مدح کا پہلو نکل آیا جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو جائے گا۔ آپ کے نزدیک میرزا یگانہ کے کلام میں پیچیدگی نہ ہونا گویا اس بات کی دلیل ہے کہ حقائق و معارف کی بلندیاں، آرٹ کی نزاکتیں اور گہرائیوں سے خالی ہے۔ جو منتہائے کمال ہے وہی گویا آپ کے نزدیک دلیل نقص ہے۔ حقائق بلند پر اس آسانی سے تصرف کرنا جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ پتھر کو پانی کر دینا آپ کی نگاہ میں کوئی کمال نہیں ہے۔ میرزا یگانہ ابھی کلام کو پیچیدہ بنا سکتے تھے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے مگر پیچیدگی اسی کے کلام میں ہوگی جس میں تصرف کی قابلیت نہ ہو۔ جس کی نظر تو حقائق عالیہ تک پہنچ سکے مگر یارائے بیان نہ ہو کچھ مجھ زبان ہو سے

کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا
فکر کی بلندی یا حوصلہ کی پستی ہے

کیا حکم لگایا جائے گا اس شعر پر۔ عامیانہ مضمون ہے یا حکیمانہ؟ دیکھنے میں سیدھا سادہ۔ کوئی پیچیدگی نہیں۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ یہ نظم ہے۔ مگر کتنی بڑی حقیقت کا مرقع ہے۔ ختم سفر۔ فکر کی بلندی۔ حوصلہ کی پستی پیش پا افتادہ باتیں ہیں جن سے ایک عامی بھی واقف ہوتا ہے۔ مگر ان حقیقتوں کے باہمی ربط و تقابل سے فکر بلیغ نے کتنا اہم نتیجہ نکالا ہے۔ سفر ختم کیوں نہیں ہوتا اس کا سبب قریب تو یہی نظر آئے گا کہ حوصلہ کی پستی ہے کہ ایک ایک قدم اٹھانا گویا ایک منزل طے کرنا ہے۔ سبب بعید یہ کہ حوصلہ کی بلندی کبھی سفر کو ختم نہیں ہونے دیتی۔ منزل پر منزل مارنے کے بعد بھی نئی نئی راہیں نئی نئی منزلیں نکلتی آتی ہیں اور حوصلہ عالی آگے ہی بڑھائے لئے جاتا ہے۔ کیا یہ شاعری محدود خیالی و تنگ نظری کی دلیل ہے۔ مولانا نے یہ بات کہی تو طعن و تحقیر کی راہ سے کہ شاید مریخ تک پہنچ جانے والے میرزا یگانہ کے کلام کو سمجھ... سکیں گے مگر فی الحقیقت ان کی زبان سے یہ کلمہ تحسین نکل گیا کیونکہ اس شعر کی حقیقت کبریٰ کا زیادہ صحیح اندازہ انہیں لوگوں کو ہو سکے گا جو مریخ تک پہنچ جائیں گے۔ وہاں پہنچنے کے بعد بلند سے بلند تر منزلیں سامنے آتی جائیں گی تو اس وقت یگانہ کی بلندیٔ فکر کی قدر کریں گے۔ سادگی و پرکاری کے صحیح مفہوم سے جو لوگ آشنا ہیں انہیں یہ صفت کلام یگانہ میں سر سے پاؤں تک نظر آئے گی مگر ایک ناواقف یا منکر جو کلام کی سادگی و پرکاری کو حسن نہیں بلکہ عیب سمجھتا ہے (کیونکہ یہاں کوئی گنجلک کوئی پیچیدگی ہی نہیں) یہ کہہ دیگا کہ میرزا یگانہ کی شاعری کیا؟ وہ تو فقط نثر کو نظم کر دیتے ہیں۔ بے شک ایسے لوگوں کی نگاہ میں سچے آرٹ کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہو سکتی۔

A True art must Suffer.

منزل ہی نہیں کوئی ٹھہرنے کے لئے
عالم عالم ہے سیر کرنے کے لئے
ہر پست و بلند ہے گزرنے کے لئے
یہ پاؤں ہیں کیا زمیں پہ دھرنے کے لئے؟

کلام میں کوئی پیچیدگی، کوئی خامی نہیں۔ سیدھے سادے برجستہ انداز سے کام لیا گیا ہے۔ مگر مریخ تک پہنچنے والے اس شعر کی حقیقت معنوی کو سمجھیں گے کہ واقعی ہر پست و بلند گزرنے۔ عالم عالم سیر کرنے کے لئے ہے ٹھہرنے کے لئے تو کوئی منزل ہی نہیں۔ عالم کا ذرہ ذرہ معرض انقلاب میں ہے۔ ایک آرٹسٹ کو اس طنز آمیز بلاغت (یہ پاؤں ہیں کیا زمیں پہ دھرنے کے لئے؟) پر وجد آئے گا مگر ایک منکر ناک بھوں... چڑھائے گا۔

(رباعی)

منزل کا پتا ہے نہ ٹھکانا معلوم ÷ جبتک نہ ہو گم۔ راہ پہ آنا معلوم
کھو لیتا انسان تو کچھ پاتا ہے ÷ کھویا ہی نہیں تو نے تو پانا معلوم!

کوئی پیچیدگی نہیں، کوئی خامی نہیں، کوئی جھول نہیں، نہ غالب کی دیوزاد زبان نہ اقبالی اردو۔ منکر کی نگاہ میں محض پیش پا افتادہ روزمرّہ اور محاورہ بازی کے سوا اور کیا رکھا ہے۔ مگر ایک فلاسفر ایک آرٹسٹ کی نگاہ میں فلسفیانہ آرٹ کا حیرت انگیز مرقع کمال ہے ناقابلِ تقلید۔ جس کی مثال اگلے اساتذہ کے ہاں سے بھی پیش کرنا ناممکن۔ ہاں معاصرین دیکھا دیکھی نقالی کی کوشش کریں تو ایک طرح کی خوشہ چینی ہوگی!

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا!

بلاشک مریخ تک پہنچنے والے اس حقیقت کبریٰ کو زیادہ واضح طور پر سمجھ سکیں گے۔ کیونکہ جو جتنا بلند ہوتا ہے اتنا ہی اس پر پستی کا زور چلتا ہے، کشش پستی کا اثر بلندی کے اعتبار سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ شعر کا یہ رُخ تو ایک سائنٹفک حقیقت کا مظہر ہے۔ مگر علم اخلاق کے تحت بھی اس شعر کی حقیقت کو جانچنا چاہیے۔ دنیائے دنی ان بزرگواروں کو زیادہ طاقت کے ساتھ اپنی طرف کھینچنا چاہتی ہے جو عام سطح سے زیادہ بلند ہوتے ہیں۔ شیطان اپنی طاقت انہیں لوگوں پر زیادہ صرف کرتا ہے جن میں اخلاقی قوت زیادہ ہوتی ہے جبھی تو بعض اوقات پیغمبروں کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں مگر اپنی قوت مدافعت کی بدولت سنبھل جاتے ہیں۔ چہ خوش ایسے مضامین عالیہ شعریت کے سانچے میں ڈھلنے کے بعد محدود ٹھہرائے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ میرزا یگانہ اردو کے شاعر ہیں، اردو زبان میں کہتے ہیں۔ غالب یا اقبال کی زبان میں نہیں کہتے۔ ٹھیٹھ زبان برتنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ آرٹ کا کمال بھی نقص نظر آنے لگا۔ یہ ہوئی اردو کی ترقی! کہا ہی مفہوم کسی اور نے اس سادگی و پرکاری سے بیان کیا ہے؟ مگر شرط یہی ہے کہ شعر کے جواب میں شعر پیش کیا جائے اسی مضمون پر لوٹے پھوٹے الفاظ میں کسی نے تک بندی کی ہے یا معاصرین میں سے کسی نے اس شعر سے مضمون اڑا کر دوسرے لفظوں میں کچھ کہہ لیا تو اس کی سند نہیں۔

گزر کے آپ سے ہم آپ تک پہنچ تو گئے
مگر خبر بھی ہے کچھ پھیر کھائے ہیں کیا کیا!

واقعی مریخ تک پہنچنے والے داد دیں گے کہ ان کے مراحل و منازل دشوار کی خبر ایک خاک نشین شاعر کو کیوں کر ہوگئی۔ پیش کیجئے متقدمین کے کلام سے اس کا جواب اگر ممکن ہو، مگر شرط یہی ہے کہ اتنا ہی مکمل، اتنا ہی سادہ و پُرکار ہو۔ نمائشی تکلفات قابلیت کی دلیل نہیں بلکہ فریب کاری ہے۔

دکھا دے خاک کے پتلوں میں زور کتنا ہے
ہوا پہ تیر چکا اب زمیں میں دھنستا جا

اس شعر کی لذت وہی لوگ جان سکتے ہیں کہ مریخ تک پہنچنے کو تو پہنچ گئے مگر ایسے لڑکھڑائے کہ زمین میں دھنستے چلے گئے۔ دیکھو طعن و طنز نے کلام میں کس غضب کا زور پیدا کر دیا ہے۔ خاک کے پتلوں سے خطاب ہے کہ ہوا پہ تیرتے تیرتے مریخ تک تو پہنچ گئے۔ اپنی عقل و حکمت اپنی مشین کا زور تو دکھا چکے اب ذرا زمین میں دھنس کر تو دکھاؤ کہاں تک جا سکتے ہو؟ آرٹ کا ایک نادر نمونہ ہے (قافیہ ردیف کی دشواریوں کے ساتھ) جس کی ہوا بھی اساتذہ کو نہیں لگی۔ پیش کریں کوئی صاحب اس کا جواب، مگر شرط یہی ہے کہ شعر کے جواب میں شعر پیش کیا جائے محض بامعنی تک بندی یا کلام موزوں کی سند نہیں۔

زمیں کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہو کر
عجب کیا سر پہ آ ئے پاؤں کی خاک آسماں ہو کر

اس شعر کی حقیقت اسی پر کھل سکتی ہے جو آفات ارضی کے ہاتھوں تحت الثریٰ کو پہنچ گیا ہو۔ ایک ماہر طبقات الارض بھی (اگر کچھ ذوق سخن رکھتا ہے) اتنا سمجھ سکتا ہے کہ غزل کی زبان میں شاعر نے سائنٹفک حقیقت کو کس حسن کس زور شور سے بیان کیا ہے۔ زمین کی ایک کروٹ (زلزلہ) نے کیا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ دنیا تلے اوپر ہوگئی ہے، وہی خاک کے پتلے جو زمین کو روندا کرتے تھے سفحۂ اندر سما گئے۔ وہی پاؤں کی خاک سر پہ آگئی (زبان کی سادگی و پرکاری کی تو اب قدر و قیمت ہی نہیں رہی اس کا تو ذکر ہی بیکار ہے۔) صوبہ بہار کے زلزلے کے متعلق ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ زمین شق ہوئی اور ایک شخص اندر سما گیا۔ مگر فوراً ہی پانی نے اسے اوپر پھینک دیا۔ نکل تو آیا زندہ مگر اتنی ہی دیر میں آدھ موا ہوگیا۔ اس سے کوئی پوچھتا۔ وہی بتا سکتا کہ زمین کا کروٹ بدلنا اور پاؤں کی خاک کا سر پہ آنا فی الحقیقت کیا ہے۔ اتنا مکمل اتنا حیرت انگیز آرٹ اتنا حسین، اتنا شگفتہ شعر (پھولوں کی شگفتگی اور ہے شعر کی شگفتگی

اور ہے) مگر ایک منکر کو اس میں سختی اور کرختگی نظر آتی ہے - وہ حُسن کے مفہوم کو شاید باغ و بہار تک محدود سمجھتا ہے - یہ نہیں جانتا کہ مور کا حُسن اور ہے اور سانپ کا حُسن اور ہے - یگانہ آرٹ کے حقیقی حُسن تک پہنچنا بہت مشکل ہے - ابھی پبلک کو یہی نہیں معلوم کہ یگانہ آرٹ کو سمجھنے کا طریقہ اور اصول کیا ہے ؟

دیکھا تو سہی تو نے مگر کیا دیکھا
جتنے نزدیک اتنے ہی دُور ہیں ہم

میرزا یگانہ لکھنوی

نوائے غم

دلِ درد آشنا ہے اور میں ہوں　　غم صبر آزما ہے اور میں ہوں

دلِ مضطر ہوا پامال لیکن　　وہی جوشِ وفا ہے اور میں ہوں

اُٹھا ہر پردۂ حائل نظر سے　　کوئی جلوہ نما ہے اور میں ہوں

کوئی دیکھے تو معراجِ محبت　　وہ خنجر آزما ہے اور میں ہوں

سکونِ دل کہاں راہِ وفا میں　　فریبِ مُدعا ہے اور میں ہوں

نظر آتی ہے لرزاں مجھ کو دُنیا　　نگاہِ فتنہ زا ہے اور میں ہوں

نظر کے سامنے وہ رہگذر ہے　　درِ فردوس وا ہے اور میں ہوں

سکونِ جاں ہے اِک آوازِ دلکش　　کوئی نغمہ سرا ہے اور میں ہوں

کہاں لایا ہے مجھ کو جوشِ وحشت　　نظر میں نقشِ پا ہے اور میں ہوں

اثر سے دُور ہے چاکِ گریباں　　جنونِ نارسا ہے اور میں ہوں

یہ عالم ہے رتن ناکامیوں کا
کہ آہِ نارسا ہے اور میں ہوں

رتن پنڈوروی

آمدِ بہار

بہار کی نمود سے حیاتِ تازہ آگئی ‌ ‌ ‌ سرور و کیف کی گھٹا دماغ و دل پہ چھا گئی

روش روش سے باغ کی ابل پڑیں لطافتیں ‌ ‌ ‌ قطار در قطار ہیں ہری ہری جماعتیں

چمن نہیں ہے بلکہ ایک شعلہ زارِ حسن ہے ‌ ‌ ‌ حریفِ عقل و ہوش آج اعتبارِ حسن ہے

ہے رقص کار بیخودی خودی کی بزمِ ناز میں ‌ ‌ ‌ تمیز کچھ نہیں رہی حقیقت و مجاز میں

ہوا کی سرد گود میں ہیں زمزمے ہی زمزمے ‌ ‌ ‌ یہاں اُٹھے وہاں تھمے وہاں اُٹھے یہاں تھمے

ترنمِ آبشار کا امینِ نغمہ زار ہے ‌ ‌ ‌ شباب در شباب ہے بہار در بہار ہے

ہے سرد سرد جوئبار - زرد زرد پھول ہیں ‌ ‌ ‌ لطافتیں جوان، پائمالیاں ملول ہیں

بہارِ نو سے عرش پر دماغِ گل فروش ہے ‌ ‌ ‌ طراوتوں کا حشر ہے تجلّیوں میں جوش ہے

جدھر نظر اُٹھائیے جہاں غریقِ رنگ ہے ‌ ‌ ‌ یہ وقت وہ ہے زُہد اور معصیت میں جنگ ہے

سُبک خرام نکہتیں فضا میں ہیں رواں دواں ‌ ‌ ‌ نگاہِ شوق کی طرح کبھی یہاں کبھی وہاں

نشاطِ وجد آفریں ہوا کا اعتدال ہے ‌ ‌ ‌ زبانِ برگ و بار پر ہجومِ قیل و قال ہے

دلوں میں کیفِ بیخودی، نظر میں نورِ زندگی
بنا ہوا ہے ہر بشر کلیمِ طورِ زندگی

پرشوتم لال ضیا

پندِ پیرِ دانا

حضرت خواجہ حافظ شیرازیؒ کا ناصحانہ کلام

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند

جوانانِ سعادت مند پندِ پیرِ دانا را

حضرت خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام حقیقت التیام صوفیانہ حقائق و رموز کی تشریح و وجدانی کیفیات کا ترجمان خیال کیا جاتا ہے۔ نشہ و سرور میں ڈوبے ہوئے الفاظ، صوفیانہ حسنِ اسلوب، وجد انگیز بندش، دل نشین تاثرات کی خوش نما تنظیم نے ان کے کلام میں ایک معجز نما تاثیر پیدا کر دی ہے کہ ہر مصرعہ ذہن میں آتے ہی دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے ہیں جب کلام حافظ کا مطالعہ کرتا ہوں تو . . . . محسوس ہوتا ہے کہ کوئی پُر اثر جذبہ دل سے اُبھرا اُبھر کر ان کیفیات کو اپنے دامن میں سمیٹ رہا ہے جو تاثیرِ شعر سے ذہن کو مسرور کرتی ہوئی دل میں سما جانا چاہتی ہیں۔

حافظ کا کلام روح و وجدان کا مجموعۂ گفت و شنید ہے۔ اس کے مصرعہ مصرعہ سے عرفان و حقیقت کی تجلّیاں چھن رہی ہیں وہ عشق و محبّت کے دریا میں غوطہ لگا کر زبانِ شعر کو حرکت میں لاتا ہے اس کا کلام ان ہی لوگوں کے ضمیر پر دامنِ اثر پھیلاتا ہے جو توحید و معرفت کے رموز و اسرار بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ بایں ہمہ اس دریائے کیفیات کے سینہ میں حکمت و بصیرت کے بھی ہزاروں موتی چمک رہے ہیں لیکن ان کی لمعانی سے اس لئے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ ناقدینِ فن نے آج تک حافظ کو صرف ترجمانِ عشقِ الٰہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے عام فہم شعر کو بھی فلسفیانہ کھینچ تان سے تصوّف کے کسی نہ کسی مسئلہ پر لا کر چھوڑا ہے۔ ورنہ حافظ ایک قادر الکلام اور جامع الشروط شاعر کی حیثیت سے جہاں نکاتِ تصوّف کی تشریح کا حق ادا کرتا ہے وہاں انسانی زندگی کے نفسیاتی پہلوؤں پر بھی ہلکی سی روشنی ڈال رہا ہے۔

اس حقیقت سے تو کسی شخص کو انکار نہیں کہ حافظ اس عشق کے حقائق و معارف کا بوجوہ تمام شارح ہے۔ جس کی پرورش آغوشِ روحانیت میں ہوتی ہے، لیکن یہ نظریہ حافظ کو شاعرِ کامل کی خلعت عطا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شاعرِ کامل ان تمام انسانی حقیقتوں سے واقف ہوتا ہے جو کفِ پا رستے لے کر موئے سر تک حاوی ہیں۔ اسی طرح اس کی نگاہ احساسات و کیفیات کی دنیا کا نظارہ کئے بغیر نہیں رہتی۔ وہ علم و بصیرت کی بنا پر انسانی فطرت کے تمام اندرونی و بیرونی واقعات پر فیصلہ کن بحث کر سکتا ہے۔ وہ اس کیفیت کے اسرار سے واقف ہوتا ہے جو ذی روح اور آمر روح کے درمیان ذریعہ گفتگو ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں ان نگاہوں سے بھی بے خبر نہیں ہوتیں جو نفسانی خواہشوں کی تحریک پر قابلِ احترام ہستیوں کو دعوتِ سیہ کاری دیتی رہتی ہیں۔ وہ نظروں کو آئینہ بنا کر اس میں خلوت کی چھپی ہوئی عیش اندوزیوں کا عکس دیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح جب انسانی زندگی کے نقائص کی طرف اس کو متوجہ کیا جاتا ہے تو وہ عقل و فکر کے پر تول تول کر ایسے حکیمانہ نظریات پیش کرتا ہے۔ جن میں اصلاح و تہذیب کی روح پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ تمام خوبیاں حافظ کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اس کو صرف تصوّف و الٰہیات کا شارح

قرار دینا بدترین بے انصافی ہے۔ میں دعوے کی تائید میں اپنی طرف سے کوئی عقلی یا نقلی دلیل پیش کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا، کیونکہ

"آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"

حافظ کا کلام ہی حافظ کو شاعر کامل ثابت کر رہا ہے۔ ذیل میں دیوان حافظ سے وہ اشعار پیش کرتا ہوں جن کا ہر مصرعہ زندگی کی خطرناک راہ میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ جو حضرات سعدیؒ و صائبؒ کے ناصحانہ اقوال کو دلیلِ راہ بنا چکے ہیں وہ حافظ کے حکیمانہ اور بصیرت افروز اشعار سے بھی اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرنے کی کوشش کریں۔ خواجہ مرحوم فرماتے ہیں:-

(۱) آسائشِ دو گیتی تفسیر این دو حرف است
با دوستاں مروت با دشمناں مدارا

فلسفۂ جدید کے نزدیک بہشت، مطمئن زندگی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اطمینان کی نوعیت اور اس کے ذریعہ حصول کے متعلق زبان فلسفہ سے جو کچھ کہا گیا ہے اس کے افہام و تفہیم کے لئے ہزاروں حلقہ ہائے فکر سے دلائل مانگنے پڑتے ہیں۔ یہ خواجہ مرحوم کی عقل و فکر کا معجزہ ہے کہ انہوں نے نہایت سادہ اور عام فہم الفاظ میں ایک ایسی حقیقت پیش کر دی جس کی وسعت ہزاروں صفحات پر حاوی ہے۔

اگر انسان مروت و مدارا سے دوست، و دشمن کے دل مٹھی میں لے لینے کی صلاحیت پیدا کر لے۔ تو اس کی توقعات میں خطرہ کی سیاہی کے بجائے اطمینان کی تجلیاں چمکنے لگیں۔ یہ وہ نعمت ہے جس کو "آسائشِ دو گیتی" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایک اور غزل میں خواجہ صاحب فرماتے ہیں ؎

(۲) اے دل بشباب رفتہ نچیدی گلے ز عمر
پیرانہ سر مکن ہوسِ ننگ و نام را

زمانہ شباب میں آفتابِ زندگی نصف النہار پر ہوتا ہے اس عمر میں جوانی قوائے کو قابو میں رکھنا خوش سیرتی کے لئے ضروری ہے۔ لیکن آتش افشاں ولولے ضبط و تحمل کا پردہ پھونکے بغیر نہیں رہتے۔ جوش آلودہ امنگیں ہزار مجبوریوں کے باوجود تصورِ نوجوانی میں شمع ہوس جلا ہی دیتی ہیں۔ اس زمانہ میں جو شخص حقوق اللہ و حقوق العباد کی دیوار نہیں پھاندتا اس پر نفسِ زہد کو بھی ناز ہے۔ ورنہ بڑھاپے میں تو قوا کی افسردگی ہر انسان کو جبری زہد کی طرف راغب کر لیتی ہے۔ چنانچہ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبریست
وقتِ پیری گرگ ظالم میشود پرہیزگار

خواجہ صاحب بھی اس شعر میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب جوانی کو جو عمر کا بہترین عملی حصہ ہے لہو و لعب میں برباد کر دیا گیا تو بڑھاپے میں مجبورانہ زہد و ورع کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ خواجہ صاحب قناعت کا سبق دیتے ہیں کہ

(۳) ملکِ آزادگی و کنجِ قناعت گنجیست
کہ بشمشیر میسر نشود سلطاں را

دامنِ امارت جسقدر وسیع ہوتا ہے، اسیقدر ہوس استعمار دل میں پریشانیوں کو بھی لا داخل کرتی ہے اس لحاظ سے طماع امیر پر وہ صابر و شاکر مفلس فوقیت رکھتا ہے جو تھوڑی سے تھوڑی آمدنی پر قناعت کر کے دل کو سکون و اطمینان کا درس دیتا ہے۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ دنیا میں وہی انسان آزادانہ سکون سے زندگی بسر کر سکتا ہے۔ جس کی ضروریات محدود ہیں اور خواہشوں میں حرص کی بجائے قناعت کی روشنی ہے۔ لیکن یہ روشنی عام طور پر غریبوں کے جھونپڑوں میں ہوتی ہے۔ امیروں کے محل اس سے محروم ہیں جب تک امراء میں دولت و پیداوار کی صحیح تقسیم کا احساس پیدا نہیں ہوتا جب تک بادشاہ ہونے کی حرص ملک گیری آتش و خوں سے چمکتی ہوئی فضا کی تلاش ترک نہیں کرتی وہ گنجِ قناعت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ دولت مفلسوں کے پاؤں پر سجدے کرتی رہتی ہے۔ کیونکہ ان کی ضروریات اور خواہشیں اسقدر وسیع نہیں جن کے پورا کرنے میں قناعت سوز مشکلات حائل ہوں ان کو جو کچھ میسر آجائے وہی ان کی ضروریات کا مرکزِ تکمیل ہے۔

(۴) حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش ولے
دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را

اس شعر میں مے نوشی اور رندی کو اس زہد سے بہتر قرار دیا گیا ہے جس کی بنا عوام فریبی اور ذاتی اغراض کے ذریعۂ تکمیل پر ہے۔ شراب نوشی بدترین جرائم میں سے ہے۔

رندی وشاہد بازی کرنا حدود اللہ سے متجاوز ہونے کی دلیل ہے۔لیکن یہ سیاہ کاری جو نفسانیت کے مقتضا پر کی جاتی ہے۔اس میں انسان کا ذاتی نقصان مضمر ہے جس کی تلافی اس کو جسمانی یا روحانی صورت میں ایک دن کرنا پڑے گی۔شخصی گناہ عقوبت ونتائج کے اعتبار سے کتنا ہی خطرناک ہو لیکن اس فریب کاری کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔جو سوسائٹی کے مفاد کو انفرادی اغراض کے ماتحت لانے کے لئے کی جاتی ہے۔ اور وہ بھی خدا کے نام پر، مذہب کے تقدس پر اور قرآنی نصوص کی امداد سے اس قسم کا گناہ جس کی وجہ جواز آیاتِ قرآنی کی غلط تاویلات پر مبنی ہو، اللہ اور کلام اللہ ہی سے روگردانی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس سوسائٹی کے لئے بھی پیغام ہلاکت ہے جو حقیقت قرآن پر ایمان رکھتی ہے۔

خواجہ صاحب کی اس شعر سے یہ مراد ہے کہ شراب نوشی و رندی انفرادی گناہ ہے۔جس کا خمیازہ بھی ایک ہی شخص کو بھگتنا ہوگا۔لیکن قرآن کو "دام تزویر" بنانے سے ساری سوسائٹی گمراہ ہوکر عذاب میں مبتلا ہوجاتی ہے۔اس لئے اول الذکر گناہ ثانی الذکر جرم پر بلحاظ نتائج قابل ترجیح ہے۔اسی قبیل کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

(۵) فقیہ مدرسہ دی مست بود و فتوے داد
که مے حرام ولے بہ ز مالِ اوقاف است

اس شعر کے معانی ومطالب میں فلسفیانہ حُسنِ کلام کی جھلک پائی جاتی ہے۔فقیہہ کا ذریعہ معاش مالِ اوقاف تک محدود تھا، اسی مال سے وہ شکم پُری کرنے کے بعد ہجو کرتا تھا۔اس کو مالِ اوقاف کی تحریم کا خیال تو تھا۔لیکن ذاتی فائدہ کے پیشِ نظر اظہار صداقت سے گریز کرتا رہا۔کل کسی طریقہ سے اس نے شراب پی لی، اور عالم مستی میں اس کو اپنے مفاد کا خیال نہ رہا۔مال اوقاف تو اس کا ذریعہ معاش تھا ہی شراب بھی اس نے پی لی۔اب دونوں چیزوں کی عقوبت کے تصورات پر عقل دوڑانے کے بعد اس نے فتوے دے دیا کہ شراب حرام تو ہے، لیکن اوقاف کے مال سے اچھی ہے۔"

فقیہہ مدرسہ نے مستی سے پہلے اس لئے فتویٰ نہ دیا کہ کوئی دنیاپرست احترام شریعت کے لئے ذاتی اغراض کو نظرانداز نہیں کرسکتا، اس تشریح سے شعر کا تعلیمی پہلو خود بخود سامنے آجاتا ہے ؎

(۶) عیب رنداں مکن اے زاہدِ پاکیزہ سرشت
کہ گناہِ دگرے بر تو نہ خواہند نوشت

جہاں تک لفظی معنی کا تعلق ہے۔اس شعر میں کوئی خوبی نہیں جو "حافظیت" کی آئینہ دار ہو۔لیکن تعلیمی اعتبار سے شعر کا ہر لفظ اپنے اندر شمع بصیرت روشن رکھتا ہے۔بر ظاہر ہے کہ زید کے گناہ کا خمیازہ کسی قانون کے مطابق عمرو نہیں بھگت سکتا، لیکن عمرو اگر زید کے گناہوں پر تبصرہ کرتا ہے تو بجائے اصلاح اعمال کے غیبت کا مرتکب ہوتا ہے۔شعر کا تعلیمی پہلو یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی گناہگار کے ساتھ عقوبت گناہ میں شامل نہیں ہوسکتا تو اس کو لازم ہے کہ گناہگاری پر تنقید کرکے اپنے تکبر کا ثبوت نہ دے۔اس مسئلہ پر استاد ذوق کا کتنا اچھا شعر ہے۔

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تُو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تُو

خواجہ صاحب ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ ؎

(۷) زاہد غرور داشت سلامت نہ برد راہ
رند از رہ نیاز بدار السلام رفت

زاہد کو اپنی پارسائی اور زہد و تقوے پر غرور تھا اور درگاہِ الٰہی میں غرور پسند لوگوں کی رسائی نہیں۔رند گنہگار تھا لیکن وہ اپنی سیہ کاریوں پر نادم ہوکر عفو و لطف کا طالب تھا۔درگاہِ الٰہی میں ندامت ہی سے بدکاریوں کی تلافی ہوسکتی ہے۔شعر کا تعلیمی پہلو یہ ہے کہ انسان کو غرورِ عمل کامیاب نہیں ہونے دیتا۔

(۸) چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر محبانِ بادہ پیما را

کتنا دلپذیر شعر ہے۔"یاد رفتگاں" کا درس اس سے زیادہ مؤثر انداز میں نہیں کہا جاسکتا۔

ٹیگور اپنے فلسفیانہ جادو کے بیاں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرچکا ہے کہ دنیا کسی کا ساتھ نہیں دیتی، لیکن خواجہ مرحوم اس مسئلہ کو جس سادہ اور مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ؎

(۹) بجو درستیٔ عہد از جہانِ سست نہاد
کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است

ایک اور جگہ اسی مسئلہ کو دوسرے انداز میں پیش کرتے ہیں

(۱۰) بردر از خانۂ گردوں بدر و ناں مطلب
کایں سیہ کاسہ در آخر بکشد مہماں را

ایک اور غزل میں اربابِ دہر کی بے مروتی کے پیشِ نظر خود اعتمادی کا درس دیتے ہیں ؎

(۱۱) مرو بخانۂ اربابِ بے مروتِ دہر
کہ کنجِ عافیتت در سرائے خویشتن است

اس مفہوم کو دوسرے رنگ میں یوں پیش کیا گیا ہے۔

(۱۲) حافظا آبِ رخت بر درِ ہر سفلہ مریز
حاجت آں بہ کہ بر قاضیٔ حاجات بریم

خود اعتمادی، خود داری اور قناعت کا اس درجہ روشن اور واضح الفاظ میں شاید ہی کسی نے سبق دیا ہو، بلکہ اس مسئلہ کی تمام جزئیات بھی مکمل صورت میں پیش کر دی گئی ہیں۔ یہ ہے کمالِ فن ؎

(۱۳) مباش در پئے آزار ہرچہ خواہی کن
کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہی نیست

مذاہبِ عالم اور اہل اللہ نے گناہ کا جو تخیل مناسب اصلاح کے بعد پیش کیا ہے۔ اس کی روح یہی ہے کہ خدا کے نزدیک وہ سب سے بڑا گناہ ہے جس کی بنا خلقِ خدا کی دل آزاری پر ہو اسی طرح وہ نیکی بلحاظ جزا تمام نیکیوں سے بڑھ کر ہے جس کے نتائج سوسائٹی کے لئے انفرادی یا اجتماعی طور پر سودمند ہوں، شب زندہ داری، نماز روزہ، تقوے و پارسائی، زہد و عبادت یہ سب افعال انسان کے آئینۂ اخلاق کو منور کرنے اور انسانی زندگی کو سودمند بنانے کا موجب ہیں۔ لیکن اصولی طور پر یہ صرف انسانی سیرت کو روشن کرتے ہیں۔ ان سے خدا کی ذات کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ لیکن جو شخص غربا کی پرورش اور یتیم کی امداد کرتا ہے ننگے کو کپڑا دیتا ہے بھوکے کو روٹی کھلاتا ہے۔ مظلوم کو پنجۂ ظالم سے چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ نادانستہ طور پر قدرت کو اس کے فرائض کی ادائیگی میں مدد دے رہا ہے۔ کیونکہ حاجت روائی کی ذمہ داری قدرت پر عائد ہوتی ہے گویا خدمتِ عامہ کرنا خدا کی مدد کرنا ہے۔ اگرچہ اس کی قادریت کسی امداد کی محتاج نہیں، لیکن وہ ان اعمالِ حسنہ کو بھی مسترد نہیں کرتا جو خلوصِ دل اور حسنِ نیت کی تحریک پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ پیغمبرِ اسلام کا ارشاد ہے کہ "خلقِ خدا کی خدمت کرنے والا ہی سردارِ قوم ہے۔"

اسی طرح جو لوگ اپنی زندگی کو خلقِ خدا کے لئے شرِ محض بنا لیتے ہیں وہ صرف سوسائٹی کے لئے ہی وجہ ننگ نہیں بلکہ قدرت کے فرائض میں بھی ناجائز اضافہ کرنے کا موجب ہوتے ہیں۔ اس لئے دل آزاری سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

مے خور و مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن
ہرچہ خواہی کن ولیکن مردم آزاری مکن

غرضیکہ خواجہ مرحوم نے چند دلپذیر اور مؤثر الفاظ میں گناہِ اکبر کی جو تفصیلی تصویر پیش کی ہے اس کا دامنِ معنی انسان کے تمام تصوراتِ حسنہ پر حاوی ہے۔ فلسفیانہ حقائق کی اس درجہ سادہ اور مختصر توضیع "شاعری جزویست از پیغمبری" کا روشن ثبوت ہے۔

(۱۴) نزاع بر سرِ دنیائے دوں کسے نہ کند
بآشتی ببرا ے نور دیدہ گوئے فلاح

جو لوگ پیغمبرِ اسلام کی مکمل مکی زندگی سے قطع نظر کرنے کے بعد "آہنسا اور شانتی" کے فلسفہ کی باریکیاں مہاتما گاندھی کے آئینۂ افکار میں دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان کے لئے خواجہ صاحب کا یہ شعر سرمایۂ استدلال ہے جس کے پہلے مصرعہ میں تو یہ بتایا گیا ہے کہ دنیائے دوں میں کوئی طالبِ فلاح جھگڑا نہیں چھیڑتا۔ دوسرا مصرعہ شعر کا تعلیمی پہلو ہے۔ جس میں آشتی سے گوئے فلاح لے جانے کی تلقین کی گئی ہے۔ اگرچہ شعر دعوے بے دلیل کا آئینہ ہے۔ لیکن تعلیمی لحاظ سے ذہنیت افروز ہے تاہم میں ایک دنیا دار کی حیثیت سے اس تعلیم کی تائید نہیں کر سکتا۔ کیونکہ فلاح کے ذرائع پر عام طور پر ان ظالمانہ قوتوں کا قبضہ ہوتا ہے جو تمام دینی و دنیوی ترقیوں کو اپنے اغراض کے ماتحت چلانا چاہتی ہیں۔ اور ظالم جنونِ قوت میں صلح و آشتی سے ان چیزوں سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ جن پر وہ غاصبانہ قبضہ جما چکا ہے۔ اس حالت میں طالبانِ فلاح کے لئے دو ہی راستے ہیں یا اپنی خواہشوں کو

نذرِ نامرادی کردیں یا ظالمانہ طاقتوں کو فنا کردیں۔ جو ان کی رفتارِ ترقی میں رکاوٹ ڈال رہی ہیں۔ لیکن تعمیرِ عالم صلح و آشتی سے نہیں ہوسکتی۔ یہ مقصد آگ اور خون کی بارش ہی سے پورا ہوسکتا ہے۔
ان حقائق کے پیشِ نظر خواجہ صاحب کا نظریہ مخصوص حالات میں قابلِ قبول ہو تو ہو لیکن استمراری تعلیم کا درجہ حاصل نہیں کرسکتا۔

اب میں طوالت کے خوف سے خواجہ صاحب کے ناصحانہ اشعار صرف تشریحی عنوانات کے تحت پیش کرتا ہوں۔ اگرچہ اس طرح تنقید و تبصرہ کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اربابِ بصیرت کے سامنے صرف فانوس پیش کرنے کی ضرورت ہے شمع کی لمعانیوں پر وہ خود بخود نگاہ ڈال لیتے ہیں۔

اعمالِ صالح پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ منشائے خداوندی کا خیال رکھنا چاہیئے۔

(۱۵) بر عمل تکیہ مکن خواجہ کہ در روزِ ازل
تو چہ دانی قلمِ صنع بنامت چہ نوشت

ہر چیز کی بنا خلل پسند ہے۔ لیکن بنائے محبت بے خلل ہے۔

(۱۶) خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

دنیا کی مخالفت کی پروا نہ کر اور رضائے خداوندی کا خیال رکھ اگر تو دنیا سے لڑے گا تو دنیا بھی ترے ساتھ جنگ کریگی۔

(۱۷) بر آستانہ تسلیم سر بنہ حافظ ٭ اگر ستیزہ کنی روزگار بستیزد

اسی نظریہ کو میں نے دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے۔ جو خواجہ صاحب کے مصرعہ ثانی کی شرح کی حیثیت رکھتا ہے ؎
زمانہ میرے موافق نہیں تو کس کا قصور؟ ٭ کہ میں نے بھی تو زمانے کی زمانہ سازی نہ کی

تنگ دستی میں بھی خدا کا شکر کر کہیں یہ حالت بد سے بدتر نہ ہو جائے ؎

(۱۸) روزے اگر غمے رسدت تنگدل مباش
رو شکر کن مبادا کہ از بد بتر شود

ایامِ مصیبت میں صبر کر کیونکہ برے دن ہمیشہ نہیں رہتے۔

(۱۹) اے دل صبور باش مخور غم کہ عاقبت ٭ ایں شام صبح گردد و ایں شب سحر شود

برے لوگوں کی صحبت انسان کو خراب کرتی ہے ؎

(۲۰) زاہدانہ کوچہ رنداں بسلامت بگذر ٭ کہ خرابت نہ کند صحبتِ بدنامے چند

عقل و دانش کی بات جاہلوں کو نہیں بتانا چاہیئے ؎

(۲۱) پیرِ میخانہ چہ خوش گفت بدردی کشِ خویش ٭ کہ مگو حالِ دل سوختہ با خامے چند

تکلیف اٹھائے بغیر راحت نہیں ملتی ؎

(۲۲) مکن ز غصہ شکایت کہ در طریقِ ادب ٭ براحتے نہ رسید آنکہ زحمتے نہ کشید

ناجنس کی صحبت سے پرہیز لازم ہے ؎

(۲۳) نخست موعظۂ پیرِ مے فروش ایں است ٭ کہ از مصاحبِ ناجنس احتراز کنید

قابلیت اوصافِ ذاتی پر مبنی ہے کوئی شخص قابل لوگوں کا بہروپ بھر لینے سے قابل نہیں ہوسکتا ؎

(۲۴) نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

(۲۵) نہ ہر کہ طرفِ کلہ کج نہاد و تند نشست
کلاہ داری و آئینِ سروری داند

(۲۶) ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجا ست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

ریاکاری شریفانہ شیوہ نہیں "سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا"

(۲۷) در سماع آ، ز سرت خرقہ برانداز و برقص
ورنہ در گوشہ نشیں، و لقِ ریا در سر گیر

کینہ ور لوگوں کو رازِ دل نہیں بتانا چاہیئے ؎

(۲۸) حکایتِ شبِ ہجراں بدشمناں مکنید
کہ نیست سینۂ اربابِ کینہ محرمِ راز

گرفتارِ مصیبت ہو کر صبر و تحمل کا رشتہ چھوڑنا نہ چاہیئے۔ کیونکہ یہ عقلمندی کے خلاف ہے ؎

(۲۹) اے دل اندر بندِ زلفش در پریشانی منال
مرغِ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

واقفِ راز ہونے کے بعد کسی شخص کے عیوب منظرِ عام پر نہ لانے چاہئیں ؎

(۳۰) احوالِ شیخ و قاضی و شربِ الیہود شاں
کردم سوال صبح دم از پیرِ مے فروش

(۳۱) گفتا نہ گفتنی ست سخن گرچہ محرمی
درکش زباں و پردہ نگہدار و مے بنوش

تجھے پرائی پیٹر میں پڑنے سے کچھ نہیں مل سکتا۔ ہر شخص اپنے مقاصد کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

(۳۲) رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند ؛ گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
دنیا کے غم کھانا فضول ہے ؎

(۳۳) گوش کن پند اے پسر از بہر دنیا غم مخور
گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش

یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ دُنیا اور کارِ دُنیا فانی ہے

(۳۴) جہان و کارِ جہاں جملہ ہیچ در ہیچ است
ہزار بار من این نکتہ کردہ ام تحقیق

دوست کیمیائے سعادت ہے ؎

(۳۵) دریغ و درد کہ تا این زماں نہ دانستم
کہ کیمیائے سعادت رفیق بود رفیق

غم و شادی اگر گذشتنی ہیں تو بہتر یہی ہے کہ ہر وقت دل کو خوش رکھا جائے ؎

(۳۶) حافظا چوں غم و شادیٔ جہاں در گذر است
بہتر آنست کہ من خاطرِ خود خوش دارم

میں اپنے کمزور بازوؤں کی وجہ سے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ان میں مردم آزاری کے لئے زور نہیں ؎

(۳۷) من از بازوئے خود دارم بسے شکر
کہ زورِ مردم آزاری نہ دارم

دوستوں کے ظلم کا شکوہ دشمنوں سے نہیں کرنا چاہیئے۔

(۳۸) آشنایانِ رہِ عشق گرم خوں بخورند
کافرم گر بشکایت برِ بیگانہ روم

اِس مضمون کو اساتذۂ اردو نے بھی غلو آمیز رنگینی کے ساتھ پیش کیا ہے چنانچہ ؎

(ناسخ) شکوہ اک بُت کا ہے محشر میں خدا کے سامنے
آشنا کا ہے گلہ نا آشنا کے سامنے

(ذوق) ہم نہیں وہ کہ کریں خون کا دعوےٰ تجھ پر
بلکہ پوچھے گا خدا بھی تو مکر جائیں گے

ذوق کے شعر کی امتیازی خوبیاں حافظ و ناسخ کے شعروں پر غیر جانبدارانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتی ہیں۔

جان سے ہاتھ دھو ڈالنا آسان ہے لیکن دلی دوستوں سے قطع تعلق مشکل ہے۔

(۳۹) از جاں طمع بریدن آساں بود ولیکن ؛ از دوستانِ جانی مشکل تواں بریدن

راز پوشی ذریعۂ نجات ہے۔

(۴۰) بہ پیرِ میکدہ گفتم کہ چیست راہِ نجات
بخواست جامِ مے و گفت راز پوشیدن

جن لوگوں کے اقوال میں اعمال کی روشنی نہیں ان کی باتوں سے پرہیز لازم ہے ؎

(۴۱) عناں بمیکدہ خواہیم تاخت زیں مجلس
کہ وعظِ بے عملاں واجب است نشنیدن

بوڑھوں کی نصیحت بختِ جواں سے بھی اچھی ہے۔

(۴۲) جوانا سر متاب از پندِ پیراں
کہ رائے پیر از بختِ جواں بہ

زمانے کی آنکھیں نہیں کہ وہ علم و جہل کے حسن و قبح پر نظر ڈال سکے ؎

(۴۳) جہلِ من و علمِ تو فلک را چہ تفاوت
آنجا کہ بصر نیست چہ خوبی و چہ زشتی

انسان کا رشتۂ اختیار دستِ قدرت میں ہے ؎

(۴۴) در دائرہ قسمت ما نقطۂ پرکاریم
لطف آنچہ تو اندیشی حکم آنچہ تو فرمائی

طریقِ عشق میں خود بینی و خود آرائی کفر ہے ؎

(۴۵) فکرِ خود و رائے خود در عالمِ رندی نیست
کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

یہ ہیں وہ جواہر ریزے جن کی لمعانیاں محفلِ فکر و عقل میں شمعِ بصیرت روشن کر رہی ہیں۔ لیکن دلدادگانِ تصوف ان نصیحت آمیز شعروں میں دستِ فکر ڈال الٰہیات کے رموز و اسرار نکالنے کی فکر میں تھے اگر مصروفیات نے فرصت دی تو میں خواجہ صاحب کے وہ اشعار بھی پیش کرنے کی کوشش کروں گا، جو نفسیاتِ محبت کو صحیح صورت میں تو پیش کرتے ہیں، لیکن ان کی اپنی نفسیات پر یار لوگوں نے پردہ ڈال رکھا ہے۔

و باللہِ التوفیق۔

اظہر امرتسری

بزمِ انتخاب

دُولہا کی واپسی

"خیر، مجھ ماں کو بُھلا بیٹھا تو کچھ بیجا نہیں" — "تجھ دُلہن کو بُھول بیٹھا، آئے یہ کیونکر یقیں؟"

"لیکن اے بیٹی، مرا بیٹا سعادتمند ہے" — "سچ مچ اُپنے مرنے والے باپ کا فرزند ہے"

"بیٹی، اِن بجھتی ہوئی آنکھوں میں نور آجائے گا" — "لال میرا، آج، یا کل تک ضرور آجائے گا"

"دل مرا بے چین ہے اُس دلربا کے واسطے" — "جا ذرا تصویر تو لے آ، خدا کے واسطے"

"ہاں یہی، کیوں سر جُھکاتی ہے؟ اِدھر آ تو سہی"

"اس پہ میں قربان، میرے دل کا ٹکڑا ہے یہی"

"بچپنا چہرے پہ ہے، بالوں میں ہلکے جال سے" — "چودھویں کا چاند شرماتا ہے میرے لال سے"

"منہ سے کہہ "آمین" یہ کیسا حیا کا جوش ہے؟" — "میں دعائیں دے رہی ہوں، اور تُو خاموش ہے"

"ہائیں یہ آواز؟ لاری! اور یہ کیا اے خدا؟" — "لاش! یہ کیا، ہائے اے اللہ یہ کیا ہو گیا!"

"کیا ہے یہ اماں؟ ہوا جاتا ہے کیوں دل پاش پاش؟"

"میرے بچے کا جنازہ، اور ترے دولہا کی لاش!"

جوش ملیح آبادی

(کلیم)

آغا حشر کی یادگار اور ڈرامے

آغا حشر کو وفات پائے تیسرا سال گزر رہا ہے اور ابھی تک مرحوم و مغفور کے عقیدت مندوں کی "ہنگامہ خیزیوں" "ہمہمہ زائیوں" اور "اعلان فرمائیوں" کے باوجود آغا حشر کی کوئی یادگار قائم نہ ہو سکی! ہر روز سنتے ہیں کہ فلاں مقام پر آغا مرحوم کی یادگار قائم کرنے کے واسطے ملک کے بہترین دماغوں نے مختلف تجاویز پر غور فرمایا اور عنقریب ایک ایسی یادگار قائم ہو جائے گی جسے آغا حشر کی یادگار کہا جائے۔ مگر یہ دیکھ کر ہماری مایوسی کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ اس سلسلے میں ابھی تک کسی تجویز کو بھی عملی جامہ نہیں پہنایا گیا اور اس پر ستم یہ کہ ان حالات میں اس قسم کی توقع کے پورا ہونے کا ہلکا سا بھی گمان نہیں ہو سکتا!

یورپ میں ایک معمولی سا مصنف فوت ہو جاتا ہے اور فوراً اس کی ایک نہیں بیسیوں یادگاریں قائم کر دی جاتی ہیں اور ہر سال ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ آپ نے حال ہی میں اخبارات کے ذریعے معلوم کیا ہوگا کہ روس کے شعلہ طراز مصنف "میکسم گورکی" کی یادگار ملک نے کس طرح قائم کی؟ ایسی متعدد مثالیں ہر روز آپ کی نگاہوں کے سامنے پیش ہوتی رہتی ہیں! مگر یہاں اپنے مصنف کی یادگار کون قائم کرے؟ —— وہ ملک جس کی آبادی کے معتد بہ حصے کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ آغا حشر کون تھا؛ وہ ملک جو اپنے کسی زندہ مصنف کو قوتِ لایموت بہم پہنچانا بھی بہت بڑا جرم سمجھتا ہے، اس سے اس قسم کی توقع رکھنی، فطرتِ آتش سے خاصیتِ آب کی توقع رکھنی نہیں تو اور کیا ہے!؟ اب رہ گئی قوم —— وہ قوم جو اپنے اہلِ قلم کی دماغی کاوشوں کو حقارت کی ٹھوکریں لگانے میں مسرت محسوس کرے اور اپنے اس فعل کو ان بیچاروں کی قدر افزائی پر محمول کرے وہ قوم جس کے افراد کتاب کو خریدنا انتہائی فضول خرچی سمجھتے ہوں، وہ قوم اپنے اہلِ قلم کے ساتھ انتہائی بیرحمانہ سلوک بھی روا رکھے تو بجا ہے۔ ملک اپنے بیہودہ، لغو اور مضحکہ خیز رسومات پر روپیہ پانی کی طرح بہا دینا اپنا فرض سمجھتا ہے، مگر اپنے جلیل القدر صاحبِ قلم کی یادگار قائم کرنے کے واسطے حقیر سے حقیر رقم بھی صرف نہیں کر سکتا۔ قوم مختلف تقاریب پر شرمناک اسراف و تبذیر کا مظاہرہ کرنے پر تو تیار رہے، مگر اپنے کسی مصنف کے سرمایۂ حیات کو محفوظ و مصئون رکھنے کے واسطے اس کے پاس کچھ نہیں —— !! اسے غلامانہ ذہنیت کی "کرشمہ طرازی" سمجھا جائے، یا کچھ اور ——؟؟؟

یادگار کے سوال کو چھوڑ دیجئے یہ بہت دور کا معاملہ ہے۔ ماتم طلب امر تو یہ ہے کہ قوم و ملک کے سامنے مرحوم کی تمام عمر کی کمائی برباد کی جا رہی ہے، مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ آغا مرحوم کے ڈراموں کو کتابی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا جائے، تاکہ یہ دستبرد روزگار سے محفوظ رہ سکیں —— آغا مرحوم نے اپنی تمام زندگی فنِ ڈرامہ نگاری کی خدمت میں صرف کی اور دمِ واپسیں تک اس فرض سے بے توجہی نہیں برتی، مگر آج ہماری نگاہیں مرحوم کی ذہنی کاوشوں سے محروم ہیں۔ کیا ملک میں کوئی ایسی جماعت نہیں جو ان کے ڈراموں کو اکٹھا کر کے اور کتابی صورت میں انہیں ملک کے سامنے پیش کرے، کیا آغا حشر کے بے شمار عقیدتمندوں میں کوئی بھی ایسا "سچا" عقیدتمند نہیں جو اس طرف توجہ کرے؟؟؟

آغا مرحوم کے چند ڈرامے مل تو جاتے ہیں مگر نہایت ذلیل حالت میں۔ اغلاط سے معمور! باقی تمام ڈرامے، سنا جاتا ہے کہ ان کے عزیزوں کے پاس ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا ہم نے ایک ڈراما دیکھا تھا جس میں فقرات کے فقرات آغا مرحوم کے ایک ڈرامے میں سے لئے گئے ہیں —— اس کے بعد اس قسم کی اور مثالیں نظروں سے گزریں، اگر یہی حال رہا تو آغا مرحوم کے تمام ڈرامے صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے مصنف اپنی تصنیف سے زندہ ہوتا ہے۔ جب تصنیف مٹا دی گئی تو مصنف کہاں زندہ رہا؟ آغا مرحوم و مغفور کے ساتھ اسی قسم کا سلوک کیا جا رہا ہے، آغا حشر کے ڈرامے ان کے خاندان کی وراثت نہیں، بلکہ یہ وراثت ہیں ملک اور قوم کے، اور کسی کو حق نہیں کہ وہ ہمیں اس وراثت سے محروم کرنے کی کوشش کرے!!

ہم ہندوستانیوں کو یہ عادت سی ہو گئی ہے کہ وقتی جوش کے اظہار میں تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے، مگر جب عمل کا سوال آتا ہے، تو ہم پر سکوت و جمود طاری ہو جاتا ہے، آغا حشر ملک کا مایۂ ناز ڈراما نویس تھا، اس کی دماغی کاوشوں نے اردو ڈراما نگاری کو جس بلند سطح پر پہنچا دیا، وہ ہم سے پوشیدہ نہیں۔ آغا حشر کی مسلسل و متواتر

کوششوں نے اردو ڈراما کو اس وقت ترقی و فروغ دیا، جب وہ انتہائی پستی کے عالم میں دم توڑ رہا تھا۔ یہ آغا مرحوم کی مساعی جمیلہ ہی کا نتیجہ تھا کہ اردو ڈراما، تحیّر انگیز رفتار سے منازل ترقی طے کرتا ہوا معراجِ کمال تک پہنچ گیا، کیا یہ صریحاً ناانصافی نہیں کہ جس شخص نے اپنی تمام عمر ڈراما نگاری کی خدمت میں گزار دی، اس کے احسانات کو یکسر فراموش کر دیا جائے؟ کیا یہ احسان فراموشی نہیں کہ جس مصنف نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ محض "فنِ تمثیل" کو فروغ دینے میں صرف کر دیا، اس کی ایک ادنیٰ سی یادگار قائم نہ کی جائے؟؟ اور پھر کیا یہ تکلیف دہ امر نہیں کہ اردو کے سب سے بڑے ڈراما نویس کی عمر بھر کی کمائی ضائع جا رہی ہو، اور ہم پر بدستور سکوت و جمود طاری رہے؟؟؟ اگر یہ ناانصافی نہیں تو پھر کس چیز کا نام ناانصافی ہے، اگر اسے احسان فراموشی نہیں کہہ سکتے تو پھر احسان فروشی کیا چیز ہے؟؟ اور اگر یہ تکلیف دہ امر نہیں تو پھر کون سا تکلیف دہ امر ہو سکتا ہے؟؟؟

یہ سب کچھ ہوا اور یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ قوم اپنے محبوب ڈراما نویس کی دماغی کاوشوں سے لاپروایانہ سلوک کر رہی ہے۔ شاید وہ سمجھتی ہے کہ اپنے ایک جلیل القدر فرزند کا رشتۂ عظمت رشتۂ زندگی کے انقطاع کے بعد ٹوٹ جاتا ہے، اگر یہ حقیقت نہیں تو پھر اس لاپروائی سے کیا مراد ہے؟ ملک اپنے گرانمایہ "تمثیل نگار" کو فراموش کرنا چاہتا ہے۔ ممکن ہے اس سے یہ مراد ہو کہ چونکہ اب آغا حشر زندہ نہیں اور ڈرامے کی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ اس لئے اسے بھلا دینا ہی بہتر ہے، اگر ملک کی یہ خواہش نہیں تو پھر مرحوم کے ادبی کارناموں سے غفلت برتنا کیا مطلب اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے؟؟ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ یادگار قائم کرنا دُور کا سوال ہے، اس لئے فی الحال ہمیں اپنی تمام کوششوں کو صرف ایک چیز پر مرتکز کر دینا چاہیئے اور وہ ہے آغا مرحوم کے ڈراموں کی فراہمی ان کی ترتیب و تہذیب اور پھر ان کی اشاعت! اور یہی سب سے ضروری چیز ہے، اگر ہماری غفلت جاری رہی، تو ہمیں ڈر ہے کہ آغا مرحوم کے ڈرامے تلف ہو جائیں گے یا دوسرے الفاظ میں "ذاتی منفعت" کے حصول کی خاطر تلف کر دئے جائیں گے! اور یہ افسوسناک واقعہ کوئی ہندوستانی دیکھنے کے واسطے تیار نہیں!

جو حضرات اس فرض کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں، وہ... خاموش ہیں اور شاید خاموش ہی رہنا بہتر سمجھتے ہیں، ہم جہاں مرحوم کے اعزا کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ اس سلسلے میں کام کرنے والوں کی طرف دستِ تعاون بڑھائیں، وہیں مدیرانِ رسائل و جرائد اور ملک کے مراکزِ ادبیہ سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس سوال پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے!!

جو حضرات اس سلسلے میں کچھ لکھنا چاہیں، ان کے لئے "ادبِ لطیف" کے صفحات حاضر ہیں۔

سرِدست ہم ملک کی مقتدر و موقر انجمن، انجمن اردو پنجاب کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں، اگر اس نے اس کام کا بیڑا اٹھایا تو ہمیں یقین کامل ہے کہ آغا حشر کے ڈرامے ضائع نہیں کئے جائیں گے۔

کیا ہم امید رکھیں کہ عقیدتمندانِ حشر بالخصوص ارکانِ انجمن اردو اس طرف بہت جلد توجہ دیں گے؟۔

(ادبِ لطیف) مبرزا ادیب بی۔ اے

ذرائع ترقیٔ اردو

اس زبان کے استعمال کرنے والوں کے دو بڑے گروہ ہیں۔ ایک گروہ ایسا ہے جو اردو بولتا ہے اور یہ اس کی مادری زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ اس گروہ کے بعض افراد اسے دیوناگری رسم خط میں لکھتے ہیں اور بعض اردو رسم خط میں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن وہ اسے سمجھتا ہے، یا تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ سمجھ سکتا ہے۔ ان دونوں گروہوں میں ترقیٔ اردو کے ذرائع بالکل مختلف اور طریقۂ کار قطعاً جداگانہ ہوگا جو میں بالتفصیل عرض کرتا ہوں:۔

(۱) جس گروہ کی مادری زبان اردو ہے اس میں عام اور جبریہ تعلیم کو جاری کرنا سلطنت کا فرض ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ اردو زبان میں ابتدائی تعلیم عام طور پر رائج ہو اور اس کا نصاب ایک ایسی جماعت سے متعلق ہو جو عوام کی ضروریات اور تعلیمی تجربے کے ساتھ ساتھ آسان اردو زبان کی کامل مہارت رکھتی ہو۔ یعنی انجمن ترقی اردو کا منظور کردہ نصاب عام طور پر جاری کیا جائے اور جو صورت انتخاب نصاب تعلیم کے مقرر کرنے کی آج کل جاری ہے وہ قطعاً بند کر دی جائے۔ یعنی کبھی کبھی کورس نہ منظور کئے جائیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف صوبوں کے سرمایہ دار تجارتی فوائد کے اصولوں کو زیادہ پیشِ نظر رکھتے

ہیں اور مختلف مدارس کے ہیڈ ماسٹروں پر اس کا دار و مدار ہوتا ہے کہ وہ کون سا کورس اپنے مدرسے کے لئے پسند کریں ۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک ہیڈ ماسٹر یا ڈپٹی انسپکٹر لسانیات کا ماہر نہیں ہوتا اور مدارس میں محض پبلشر کی مروت یا ہیڈ ماسٹر کی عدم توجہی کی وجہ سے ناقص کتابیں رائج ہو جاتی ہیں ۔

(۲) اس گروہ کے اکثر افراد متوسط الحال طبقے کی اس جماعت پر مشتمل ہوتے ہیں جو ادنیٰ طبقے سے قریب تر ہیں یعنی ان میں تعلیم بہت کم ہوتی اور وہ صرف ایسی کتابوں کو پسند کرتے ہیں جنہیں اعلیٰ طبقے کے لوگ سوقیانہ اور عامیانہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں ۔ ان کے لئے ہم ان کی پسند کا، لیکن بہتر لٹریچر مہیا کر سکتے ہیں اور اگر ہم ٹالسٹائے ، ہامسن ، ٹیگور ، گورکی ، ماشر اور پریم چند کے افسانوں اور عام پسند لٹریچر کو دیکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کا لٹریچر ابھی اردو میں بہت کم ہے ۔ اور ضرورت ہے کہ ہم اردو کو عام پسند بنانے کے لئے ایسے لٹریچر کو کثرت سے شائع کریں جو صرف خشک اور علمی مسائل ہی پر مشتمل نہ ہو ۔

اسی سلسلے میں نامناسب نہ ہوگا اگر میں فلمی کہانی لکھنے والوں کی اردو کشی کی طرف آپ کو متوجہ کروں ، ہمیں ایک ایسے ماہرین زبان کے بورڈ کی سخت ضرورت ہے جو مختلف فلمی کہانیوں پر لسانی اور فلمی نقطۂ نظر سے ایسی تنقید کریں جو عوام کی سمجھ سے باہر نہ ہو اور افسانہ نویسوں کو مجبور کریں کہ وہ رائے عامہ کا لحاظ کر کے بہتر زبان میں اپنے افسانے تیار کریں ، اور اگر ممکن ہو تو ہماری انجمن کے منظور شدہ افسانوں کی تصویریں دکھائیں ۔ غالباً یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ لاکھوں اردو بولنے یا سمجھنے والوں کی زبانیں موجودہ صنعت افسانہ سازی کی بدولت تباہ ہو رہی ہیں ۔

(سہ ماہی "اردو")　　　　محمد اجمل خاں ایم ۔ اے

مولانا نذیر احمد اور حقیقت نگاری

اب ہم ان چند خصوصیات پر بھی نظر ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں جن کی وجہ سے بعض ناقدین مغالطہ میں پڑ کر مولانا نذیر احمد کو باقاعدہ ناول نویسوں میں شمار کرنے لگے ہیں ، ان میں سب سے پہلی چیز حقیقت نگاری ہے ۔

مولانا نے جہاں تک عورتوں کی خانگی زندگی کا تعلق ہے بہت حد تک حقیقت نگاری کی ہے ۔ ان کی آپس کی رنجشیں ، چشمکیں ، لین دین ، رشک و حسد و غیظ بہت ہی عمدہ طرز پر پیش کیا ہے ۔ کہیں کہیں دوسرے جذبات سے بھی بحث کی ہے مثلاً اولاد سے محبت ، بھائی سے محبت ، باپ سے محبت ، مگر اس کے ساتھ ان کی متشرع طبیعت رنگین محبت ہی سے نہیں ، بلکہ زن و شوہر کی محبت کے نام سے بھی "لجاتی" ہے ۔ ان کی معرکۃ الآرا کتاب مراۃ العروس نام ہی نام کی رنگین ہے ۔ اس کی ہیروئن اصغری اس طرح کی قدسی صفات ہے کہ اس کا شوہر غالباً اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے پہلے وضو کرنا ضروری سمجھتا ہوگا ۔ بنات النعش کی جھلک بھی صرف نام ہی تک محدود ہے ، ورنہ جن مستورات کا اس میں ذکر ہے وہ دن ہو یا رات کسی وقت بھی "عریاں" ہونے والی نہیں ۔ توبۃ النصوح میں توبہ و استغفار ہی ہے ، بھلا اس کی "فہمیدہ" میں قیامت کی متانت نہ ہوگی تو کس میں ہوگی ؟ رہیں مبتلا اور ابن الوقت سی تصنیفیں تو آخر الذکر کے ہیرو نے ساری عمر انگریز بننے میں صرف کر دی ، اسے صنفِ نازک کو جنسِ لطیف سمجھنے کا وقت ہی نہ ملا اور اول الذکر نے گو ایک کی جگہ دو دو بیویوں کا بیک وقت تجربہ حاصل کیا ، مگر نہ اس کے ہاں ان دکھیاریوں کے لئے کوئی خاص کشش پیدا ہوئی اور نہ ان بے چاریوں کے ہاں اس مایہ النزاع سرتاج کے لئے ، ہمارے نزدیک اس لطیف ترین جذبے کے ذکر سے اغماض کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں ، یا تو مولانا ان کا ذکر ہی بے حیائی سمجھتے تھے یا انہیں اس دنیا سے کلیتہً ناواقفیت تھی ان میں سے جو بھی سبب ہو ، مگر اس عنصر کے عدم نے مولانا کی کتابوں سے ناول کہلانے کا حق سلب کر لیا اور خود انہیں حقیقت نگار کے خطاب سے محروم کر دیا ۔

مکالمہ و زبان

اب رہا مکالمہ تو بے شک و شبہ مولانا عورتوں کے مکالمے کے بادشاہ ہیں ۔ صنفِ نازک کا تکلم ، طرزِ گفتگو ، نشستِ الفاظ اور روزمرہ و محاورہ پر جیسا انہیں عبور ہے سوائے سرشار اور مرزا رسوا کے کسی کو نصیب نہیں ، ان مقامات پر مولانا نے سلاست ، روانی اور آمد کے دریا بہا دیئے ہیں اور اتنی ٹکسالی زبان لکھی ہے کہ ہر فقرے پر جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے ۔ مگر جس جگہ پر خود اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں یا مردوں کی گفتگو لکھی ہے وہاں روانی کا دریا عربی کے ثقیل الفاظ کی چٹانوں سے بار بار ٹکرایا ہے

نہ وہ وہاں بھی بلا کا ہے۔ ہواؤں میں کمی نہیں، مگر ہاں یہ سبزہ زاروں سے گزرتا ہوا دریا نہیں، بلکہ کوہساروں سے الجھتی ہوئی ندی ہے۔ پھر ان مقامات کی زبان بھی دلی اور لکھنؤ کی ٹکسال کی پابند نہیں، اس میں جگہ جگہ پر اس کے بین ثبوت ملتے ہیں کہ مولانا نے مدت العمر ایک دورہ کرنے والے ڈپٹی کی زندگی بسر کی ہے اور ان کا اصلی وطن دلی کا شہر نہ تھا بلکہ یوپی کا بجنور!

(جامعہ) علی عباس حسینی

سیاسی انقلابات اور شاعری

ہم اردو شاعری کو ادب اور زبان کے ارتقا کے لحاظ سے مختلف دوروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ زبان کا ارتقا تو خیر ایسی چیز ہے کہ وہ سیاسی انقلابات کے بغیر بھی ہوتا رہتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی ایسے انقلابات آتے ہیں کہ وہ زبان کے انداز میں بھی یکبارگی ایک نمایاں تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔ مثال کے لئے موجودہ دور کو لیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی مثال میں ہم خاص طور پر اکبر کے کلام کو پیش کر سکتے ہیں، لیکن جہاں تک خیالات اور شاعری کے مختلف دوروں کا تعلق ہے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہر زمانہ کی... تبدیلیاں شاعری پر بھی برابر اپنا اثر کرتی رہتی ہیں اور ان چیزوں کو چھوڑ کر جو شاعری میں محض مادی تشکل میں داخل ہو جاتی ہیں شاعروں کے سطحِ نظر اور اندازِ تخیل میں بھی نمایاں فرق نظر آنے لگتا ہے۔ ہم اردو شاعری کے سب دوروں کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد مختلف شاعروں کے ذہنی رجحانات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ عموماً یہ ذہنی رجحانات سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ میر کی شاعری کے انداز میں سیاسی انقلابات کا اثر ہے۔ اس کے بعد کے دور کی شاعری جس میں انشا، رنگین اور جرأت کی شاعری خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے۔ اسی سیاسی انقلاب کا اثر ہے کہ شاعر لکھنؤ کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور اس دربار کے شاعروں کے رجحانات اور ان کے میلانِ طبع سے متاثر ہو کر ایسی شاعری کی جس کا انداز دہلی کی شاعری سے الگ ہے۔ ریختی کو بھی اس خاص سیاسی تبدیلی کا مرہونِ منت سمجھنا چاہئے۔ غدر کے بعد کی شاعری پرانے شاعرانہ رنگ سے بالکل الگ ہے —

غزلوں تک نے اس سیاسی تبدیلی کا اثر محسوس کیا اور شاعروں نے غزلوں کے علاوہ مستقل نظموں میں اپنے ان خیالات کا اظہار نئے نئے طریقوں سے کیا۔ حالی، اکبر، چکبست اور اقبال کی شاعرانہ کوششیں ایسی ہیں جن میں قدم قدم پر ان تبدیلیوں کا نمایاں اثر ہے۔

شاعروں نے قوم کی گرتی ہوئی حالت کو دیکھ کر اسے ابھارنے کی کوشش کی۔ وطن کی محبت کا جوش ان کے دلوں میں طرح طرح سے پیدا ہوا۔ شعروں میں انہوں نے اس محبت کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا، کہیں قدیم سورماؤں کے جذبۂ وطن پرستی کا بیان کیا، کہیں قوم کی قدیم عظمتوں کا ذکر کیا، کہیں ایثار و قربانی کا سبق دیا اور کہیں وطن پر فدا ہونے کی تعلیم۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کے اس دور میں وطنی شاعری کے گہرے نقوش نظر آتے ہیں اور اردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں جس کے کلام میں اس جذبہ کا نمایاں اثر ہو۔ اس جذبہ کی مثالیں ہمیں سرور، محروم، مہر، نظر، حفیظ، جوش اختر اور اس کے علاوہ اکثر شاعروں کے یہاں ملتی ہیں۔ اقبال کا کلام اس رنگِ تخیل سے بھرا ہوا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک دور ایسا ہے جس میں ہندوستان کی حبِ وطن کا جذبہ موجود ہے۔ ایسی نظموں میں "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ان کی شاعری کے متوسط اور آخری دور کا انداز بالکل ہی جداگانہ ہے۔ متوسط دور میں ان کی سیاسیات پر پیغامِ عمل کا غلبہ ہے اور اسے بھی کسی حد تک ہندوستان کی سیاسی فضا کا اثر سمجھنا چاہئے

موجودہ دورِ شاعری پر اس حیثیت سے سیاسیات نے جو گہرا اثر کیا ہے اس کی اگر صرف مثالیں ہی جمع کی جائیں تو دفتر کے دفتر جمع ہو جائیں۔ اس لئے اس دور کی شاعری کے ان اثرات کو نمایاں کرنے کے لئے اور مثالوں کا لکھنا فضول سا ہے۔

اب تک ہم نے سیاسی انقلابات کے تحت میں شاعری کے جن جن پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے انہیں دیکھ کر اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیاسی تبدیلیاں کن کن مختلف طریقوں سے شاعری پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔

(ادبی دنیا) سید وقار عظیم

تبصرات

تنویر کراچی (مصحفی نمبر):-

ایڈیٹر عبدالحمید جیسلمیری۔ ضخامت ۲۰×۳۰/۸ سائز کے ۵۶ صفحے۔ قیمت مصحفی نمبر چار آنے چندہ سالانہ عما (مدرو پلے)

رسالہ تنویر کراچی تین سال سے سندھ میں علم و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ حال ہی میں اس کا "مصحفی نمبر" شائع ہوا ہے جسے یادگارِ مصحفی حضرت علامہ افسر صدیقی امروہی نے مرتب کیا ہے۔ علامہ موصوف ہی نے سب سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کی غلط تنقید کے خلاف آواز بلند کی تھی اور "نگار لکھنو" میں ۱۰۰ صفحے کا بلند پایہ مضمون لکھ کر مصحفی مرحوم کو صحیح معنوں میں ملک سے روشناس کرایا تھا۔ اب آپ "استاد کامل" کی ترتیب و تدوین میں مصروف ہیں اور "مصحفی نمبر در اصل" "استاد کامل" کی مختصر تلخیص کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس نمبر میں علامہ صاحب نے "مصحفی اہلِ تحقیق کی نظر میں" "حالات مصحفی"، "تلامذۂ مصحفی"، "تصدیقات تلمذ"، "مصحفی کے اصلاحی کارنامے"، "مصحفی کے خاص اشعار"، "شانِ تغزل" اور انتخاب کلام وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔

مصحفی مرحوم کے متعلق چند نظمیں بھی زینتِ محلہ ہیں۔ اہلِ ذوق و ادب کو ضرور اس نمبر کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

ماہانہ "حشر" جالندھر:-

ایڈیٹرز:- ودیا پرکاش سرور کیفوریہ و ضیا حشری۔

چندہ سالانہ دو روپے۔

اردو تمثیل نگاری کے شہنشاہ آغا حشر مرحوم کی یادگار ایک اہم سوال ہے۔ میرزا ادیب بی۔اے کے دو شذرے شاہکار کے اسی نمبر میں بزم انتخاب کے زیر عنوان دئے جا رہے ہیں جن میں آغا حشر کی یادگار اور ان کے ڈراموں کی اشاعت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔

اسی دوران میں ماہانہ حشر جالندھر کے تین نمبر ریویو کے لئے موصول ہوئے، معلوم ہوتا ہے کہ حشر کے عقیدتمندوں میں زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں۔

حضرت جوش ملیح آبادی، جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی جناب عیش فیروز پوری اور حضرتِ الطاف مشہدی کا قلمی معاونین میں شامل ہونا رسالہ کے شاندار مستقبل کا آئینہ دار ہے۔

اپریل نمبر سے آغا حشر مرحوم کے شاہکار "رستم و سہراب" کی بالاقساط اشاعت بھی شروع کر دی گئی ہے۔

امید ہے کہ شائقین فراخ دلی سے اس کا خیر مقدم کریں گے

صنفِ نازک (جہاں آرا نمبر):-

"صنفِ نازک" مدت سے خواتین میں علم و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ حال ہی میں محترمہ جہاں آرا بیگم شاہنواز کے نام سے اس کا "جہاں آرا نمبر" شائع ہوا ہے۔ جس میں متذکرہ موضوع کے علاوہ اور بھی مفید و پُر معلومات مضامینِ نظم و نثر شائع ہوئے ہیں۔ قیمت فی پرچہ درج نہیں۔ سالانہ چندہ تین روپے۔

پتہ:- مینجر صاحب رسالہ صنفِ نازک، سادات سٹریٹ میکلوڈ روڈ لاہور۔

نافہ تاتار:-

یہ حضرت خواجہ شیخ فریدالدین عطار کے مشہور و معروف پندنامہ کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ جسے شریف الاسلام سید فرزند علی شاہ (مرحوم) سابق مدرس اعلیٰ اردو فارسی بہاول پور نے اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کتاب کے سادہ مگر دلفریب الفاظ میں جملہ ضروریاتِ دینی کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے جولانگاہِ دنیا کے تمام نشیب و فراز کا نقشہ کھینچ کر راست روی کی ہدایت کی گئی ہے۔ ہر مذہب و ملت کے افراد اور خصوصاً نوجوانوں کے لئے شمعِ ہدایت ہے۔ سوا چھ آنے کے ٹکٹ بھیج کر "مہتمم اردو محل منٹگمری" سے طلب کریں۔

طبیبِ نسواں دہلی:-

ایڈیٹر:- ڈاکٹر سعید احمد بریلوی سالانہ چندہ عہ فی پرچہ ۳ر

ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کا اسم گرامی ادبی و طبی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ کامیاب ڈاکٹر ہونے کے علاوہ نغز گو شاعر اور افسانہ نگار بھی ہیں۔ مارچ ۱۹۳۷ء سے آپ کی ادارت میں ماہنامہ "طبیبِ نسواں" شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ تاحال دو نمبر شائع ہوئے ہیں۔ جنہیں دیکھنے کے بعد اس کے مستقبل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تندرستی ہزار نعمت ہے، بیمار کے سرہانے، کہانیاں (نصیحت آمیز معاشرتی افسانے)، تعمیر آشیانہ، بی ہمسائی، ننھے میاں، چہار دیواری کے باہر، مفرحات، آسان اور مجرب نسخے، بیماریاں اور ان کے علاج مستقل عنوان ہیں، جن سے رسالہ کی فنی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حفظانِ صحت کے شائقین خصوصاً مستورات کے لئے نہایت مفید ہے۔ ٹائیٹل پیج رنگین و دیدہ زیب۔ کتابت و طباعت زیبا، کاغذ عمدہ۔ چندہ سالانہ ۱؎

منیجر صاحب طبیبِ نسواں دہلی کے پتے سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

یزدانی

تمدّنِ عتیق

قاعدے کی بات ہے کہ جب کوئی نئی تصنیف یا تالیف پہلے پہل منظرِ عام پر لائی جاتی ہے تو اسے اپنی بقا کی خاطر انسانوں کی طرح کتابوں کو بھی جہد للبقا کا مرحلہ طے کرنا پڑتا ہے، ان مشاہیر اور اہل الرائے صحافیوں کی قدرتی طور پر تلاش دامن گیر ہوتی ہے جن کی قوتِ فیصلہ والہانہ جوش و عقیدت اور مروت و محبت کا شکار نہیں ہوتی۔ اگرچہ کسی کتاب کی افادیت اور معنوی حیثیت کے تخمینہ کرنے کا یہ اصول عمومی مستحسن نہیں ہے اور نہ اس کو کلیتاً تسلی ہونا چاہیئے۔ تاہم یہ ایک سنتِ دیرینہ ہے کہ جب کسی نئی کتاب کے درخورِ ستائش ہونے کی صدائیں گوش گزار ہوتی ہیں تو ذوقِ مطالعہ تغافل پیشہ قارئین کو اکساتا ہے اور دستِ طلب جیب کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔

بعض علمی رسائل کی سہانی تنقیدوں نے مجھے بھی تمدنِ عتیق کے مطالعے کا شوق دلایا کیونکہ متعلمین تاریخ کے لئے تمدنی ارتقاء کی سرگزشت نہایت پُر لطف اور خاصے کی چیز ہے۔ بشرطیکہ مؤلف نے تمدنوں کے پراگندہ تار و پود کی شیرازہ بندی میں جانفشانی اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہو۔ اس خصوص میں ماہرینِ علم الآثار کی بے لوث مساعی کا اعتراف نہ کرنا بطلانِ بدیہیات کے مترادف ہوگا، اس لئے کہ انہوں نے اسلاف کی ناقابلِ فراموش یادگاروں کو، جو گردشِ لیل و نہار کے باعث تقریباً نقشِ و نگارِ طاقِ نسیاں ہو چکی تھیں خاک کے تودوں سے باہر نکالا اور نہ صرف نام نیک رفتگاں کو قعرِ گمنامی اور کنجِ خمول سے نکال کر حیاتِ جاودانی بخش بلکہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے وافر مواد فراہم کر دیا۔

زیر نظر کتاب سٹی کالج حیدرآباد دکن کے دو فاضل اساتذہ مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم۔ اے، اور مولوی محمد عطاء الرحمٰن صاحب بی۔ اے کی متفقہ تحقیق اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہے، جس کی ترتیب و تدوین میں فاضل مؤلفین نے اس موضوع کے مستند ماخذوں سے کماحقہٗ استفادہ کیا ہے اور ایجاز و اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ضروری امور قلم انداز نہ ہوں۔ اس کتاب کو بائیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تخلیق کائنات پر جدید زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالتے ہوئے قدیم تمدنوں سے متعلق عصری معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ نیز سنین اور تاریخ کی اعانت کے بغیر آغاز گیتی، کرشمہ حیات، نیانڈرتھالی انسان، قدیم عصر الحجر، جدید عصر الحجر، ابتدائی تخیلات، تحریر کی ابتداء، تمدن کے اولین نقوش، سامرستان و مصر، مذہبی اور ادبی رجحان، اولین فرمانروا اور طبقاتی نظام، علوم و فنون، اور کاروباری زندگی، قوانین اور اقتدارِ شاہی، قدیم آوارہ گرد، اولین بحر پیما، اولین قومی مملکت، قدیم ترین سلطنتیں، مصر کے عروج کا پہلا اور دوسرا دور، اشوریہ کا عروج اور عبرانیوں کی قلمرو سے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے جس سے واضح ہوگا کہ تمدنی زندگی کے احیاء کا سہرا اہل مشرق ہی کے سر ہے کیونکہ دریائے سندھ، دجلہ، فرات اور نیل کی وادیاں قدیم

تمدنوں کا گہوارہ تھیں۔
اولین تمدنوں کے بانیوں کے متعلق فاضل مؤلفین کا یہ نظریہ نہ صرف جاذب توجہ بلکہ قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ قدیم الایام باشندے بلشمار سہولتوں اور خاص کر اسباب خورد و نوشش کی فراوانی کے باعث بالعموم دریاؤں کی سرسبز اور حاصل خیز وادیوں ہی میں اقامت گزیں ہوتے تھے۔ اسی طرح ایک عرصے کی بود و باش اور باہمی میل جول سے تمدنی زندگی کے آثار شروع ہوئے جس کا بین ثبوت وہ اولین نقوش ہیں جو ماہرین علم الآثار کی عرق ریز کاوشوں کے منت گزار ہیں لیکن تعجب ہے کہ بعض افراد اس باب میں بلاوجہ غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ "عور" بابل اور موہنجدارو کے پرانے کھنڈر کھودنے سے بعض چیزیں یکساں برآمد ہوئی ہیں جس سے ثابت ہے کہ کسی زمانے میں ہندوستان اور عراق ایک ہی بادشاہ کے زیر نگیں تھے۔ "یہ نظریہ" اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا" کی عملی تفسیر ہے۔ اس لئے کہ عہد بربریت میں ایک منظم اور باضابطہ حکومت کا تصور مجذوب کی بڑ سے زیادہ نہیں، خلط اشیاء کے اسباب سمجھنے کے لئے علمائے انسیات اور نسلیات سے رجوع کرنا از بس ضروری ہے۔ نیز اس گتھی کو سلجھانے کے لئے ماہرین آثار قدیمہ کی رہنمائی بھی ناگزیر ہے۔ یہ دور ازمنہ ماضیہ کے تاریک ترین دور میں شمار ہوتا ہے کیونکہ اس زمانے میں انسانوں نے علوم و فنون اور دیگر کاروبار زندگی میں نہ تو کافی دستگاہ حاصل کی تھی اور نہ اُن میں اتنا شعور پیدا ہوا تھا کہ ایک ایسی منضبط داستان اپنے کارناموں کی چھوڑ جاتے جو عہد حاضر کے مورخین کی خاطر خواہ رہنمائی کرتی۔ البتہ "خشت و گل" کی بربادشدہ نشانیوں سے یہ مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ جتھابندی دنیا کی نئی رسم نہیں ہے
چنانچہ اب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ دریائے دجلہ کے وہ باشندے جو سامریوں کے بعد اس علاقے پر متصرف ہوئے سامی النسل تھے، عکادی، عامری اور اشوری وغیرہ اسی نسل کی یادگار ہیں اور کنارہ فرات کے وہ باشندے جن کو ان لوگوں نے مغلوب کیا، دراوڑی نسل سے علاقہ رکھتے تھے یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہوس رانیاں اور رزم آرائیاں بنی نوع انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں۔ جب ایک فریق کمزور ہو جاتا ہے تو دوسرا اقتدار حاصل کرنے اور اپنی عظمت و برتری کا سکہ بٹھانے کے لئے ممکنہ جدوجہد کرتا ہے۔ اطالیہ و حبشہ کی حالیہ معرکہ آرائیاں اس کی تازہ ترین مثال ہے۔ عہد عتیق میں بھی اسی کلیہ کے ماتحت لاغول زغشی کے خلاف عکادیوں کے قائد اعظم سارگن نے یلغار کی اور اُس کو ہزیمت دے کر سامرستان پر عکادیوں کا پرچم لہرایا اور عامریوں کے بے جگر سردار حمرانی نے نہایت جرأت و پامردی سے شمشیر آزمائی کی اور "ہر کہ تلوار زند سکہ بنامش خوانند" کا درس دیا۔ وقس علیٰ ہذا۔
ہو سکتا ہے کہ وادئ فرات کے باشندوں نے اپنے ہمسایوں کے پے در پے حملوں کی تاب مقاومت نہ پا کر شمال مغربی راستوں سے ہندوستان کو ہجرت کی ہو یا تلاش معیشت اُن کے وہاں نزول گیر ہونے کا باعث ہوئی مگر یہ خیال بہر نوع قابل تسلیم نہیں کہ اس زمانے میں ہندوستان اور عراق کی سی وسیع الشان مملکتوں پر کسی فرد واحد کا "لوائے شاہی" لہرا رہا تھا۔
اس سے قطع نظر ایک گروہ اس بات کا مدعی ہے کہ کسی زمانے میں بنگال سے قرطاجنہ "شمالی افریقہ" تک ایک ہی قوم آباد تھی۔ اُن کا بیان ہے کہ "بنگال میں عرصے تک پال خاندان کے راجاؤں کی حکومت رہی، وہاں اب تک اُن کے نام لیوا موجود ہیں، اسی طرح عراق میں سمرلوں (سامریوں) کا راجہ آشور بانی پال گزرا ہے۔ قرطاجنہ کا بہادر جرنل ہنی بال بھی پال خاندان کا رکن تھا کیونکہ بال و پال ایک ہی چیز ہیں، اسی طرح اجودھیا میں دشرت راجہ کا راج تھا۔ عراق میں بھی اسی نام کا ایک بادشاہ ہوا۔" لسانی وحدت کی یہ دو چار مثالیں ڈاکٹر پران ناتھ پروفیسر بنارس ہندو یونیورسٹی کی نیم منطقی توجہات یا لسانی، لسانی سے خوشہ چینی کی آئینہ دار ہیں، جو ہزار دلچسپ اور پر لطف بھی، لیکن محض تخیلی موشگافیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ تاریخ عبارت ہے حقیقی اور عملی واقعات سے، محض ایک زبان میں، دوسری زبان کے چند لفظوں کی ہم آہنگی اور خلط ملط کی بنا پر یہ یقین ماننا کہ ان وسیع ترممالک کے باشندے ایک ہی نسل اور خاندان سے ہیں۔ غیر منطقی اور لاطائل نظریہ ہے۔
پیش نظر کتاب پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ "اس میں غیر مانوس اصطلاحات اور بے تکی ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں۔"

اس اعتراض کی کاواکی کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو جامعہ عثمانیہ جیسے مہتم بالشان ادارۂ علمی کی وضع کردہ اصطلاحات سے کما حقہ واقف ہیں۔ زبان اردو کے مخلص خدمت گزاروں کا اولین فرض ہے کہ ملکی تعصبات سے قطع نظر، اس سرچشمۂ علوم و فنون کے فیوض و برکات سے متمتع ہوں کیونکہ زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کا دارو مدار الفاظ کی بہتات اور بولنے والوں کی روز افزوں تعداد پر ہے اگر الفاظ صرف وضع کئے جائیں اور اُن کو استعمال نہ کیا جائے تو پھر اُن کا بنانا بیکار ہے۔ یورپ میں اگر کوئی نیا لفظ قواعد زبان کے مطابق بنایا جاتا ہے اور اس سے کوئی مفہوم نسبتاً اختصار کے ساتھ ادا ہوتا ہے تو پھر فقید المثال انشا پرداز اور ادیب اُس کو بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ ایسی علمی اصطلاحات سے ملک کے انشا پردازوں اور بالخصوص مدیران رسائل کو کامل طور پر بہرہ مند ہونا چاہیئے تاکہ کم مائگی کے الزامات سے ہماری زبان مبرّیٰ ہو سکے۔ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ بعض کہنہ مشق صحافی حضرات اپنی نری ناواقفیت یا تعصب کی بنا پر اچھی خاصی اور سریع الفہم اصطلاحوں کو ثقیل اور بھونڈی قرار دیتے ہیں مثلاً مصر جدید کے علما نے (Reptiles.) کا ترجمہ "زحافہ" کیا ہے جو عام طور پر چالو ہے اور سمندر کی راہ دُور دراز سفر کرتا ہوا ہمارے کانوں تک پہنچا ہے۔ علیٰ ہذا ارباب جامعۂ عثمانیہ نے (Mammals) کا ترجمہ "پستانیاں" کیا ہے جو... (Mamma. پستان) کا لفظی ترجمہ ہے اور قواعد زبان کی رُو سے نہایت معنی خیز اور سانچے میں ڈھلا ہوا لفظ ہے ایسے الفاظ کو ثقیل اور نامانوس ٹھہرا کر ایک مشہور رسالے کے مدیر نے عرشِ ادارت سے اُن کی جگہ جو زود ہضم اصطلاحیں تجویز فرمائی ہیں، وکہ ان بھاری بھرکم اصطلاحوں کی بجائے علی الترتیب "پیٹ کے بل رینگنے والے جانور" اور "دودھ پلانے والے جانور" زیادہ بہتر ہیں۔) کم از کم اردو زبان کے حق میں کچھ آشنائی کا حق ادا نہ کیا۔ فاضل نقاد کو معلوم ہونا چاہیئے کہ زبان کی عظمت اور شان ادبیت کا مدار کم سے کم لفظوں میں وسیع تر مفہوم کی ترجمانی پر ہے۔ مجوزہ ترجمہ وسطانی اور فوقانی جماعتوں کے طلبا کی تفہیم کر سکتا ہے لیکن علمی مقالات کے شایاں نہیں ہو سکتا۔ آگے چل کر فاضل نقاد کا ارشاد ہوتا ہے کہ لفظ (Skelton) کا ترجمہ "استخوانی باقیات" کی بجائے "ڈھانچہ یا پنجر ہونا چاہیئے یا... (Curvature.) کا ترجمہ "خمائو" کی جگہ صرف "خم" مناسب تھا۔ یہ اعتراضات بھی محض غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے کہ "ڈھانچہ یا پنجر" کے لئے جس انگریزی لفظ کا حوالہ دیا گیا ہے بالکل درست ہے، لیکن "استخوانی باقیات" کے لئے "غالباً (Remains of bones.) استعمال کرنا مناسب ہوگا۔ نیز "خم اور خمائو" کی معنوی نزاکت کا اندازہ کچھ وہی لوگ پورے طور پر کر سکیں گے جو (Curve) اور (Curvature) میں امتیاز کرتے ہوں اس لطیف فرق کو محسوس کرنے کے لئے وسعت نظر اور نگاہ باریک بیں کی ضرورت ہے۔

اسی فاضل تبصرہ نگار نے اپنی عالمانہ تنقید میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ "عقیرہ، طبرہ، صیدان ان ناموں کو معرّب کرنے کی فضول کوششیں کی گئی ہیں، کیونکہ عربی میں ان شہروں کے نام پہلے ہی سے عکہ، طیرا، اور صیدا موجود ہیں۔" ہمارے دوست نے یہاں بھی اپنی ہمہ دانی کے پندار میں فضول اعتراض کیا ہے، اس لئے کہ عکہ، عیقرہ، صیدا اور صیدان یا طیرہ اور طیرا میں کوئی ایسا خاص فرق نہیں جس کی بنا پر اتنی عالمانہ موشگافی کی جاتی۔ پھر یہ کہ علامہ نذیر احمد خاں مرحوم کے مترجمہ انجیل مقدس کے اوراق میں کم از کم صیدان اور صیدانیوں کا لفظ بار بار آیا ہے، ممکن ہے کہ مؤلفین نے انگریزی نام (Siddan) سے قریب تر ہونے کی خاطر "صیدان" کو "صیدا" پر ترجیح دی ہو۔

بسا اوقات جوشِ تنقید میں تبصرہ نگار جملوں کو "غلط ربود" کر کے طرز نگارش کا سقم قرار دیتے ہیں مثلاً "بے سروسرمایہ زندگی پر اُن کی گزران تھی۔" زندگی پر کسی کی گزران نہیں ہوتی، یہ بالکل صحیح ہے لیکن زیر بحث کتاب میں جملہ اس طرح سے ہے "محض تنکار اور بے سروسرمایہ زندگی پر اُن کی گزران تھی۔" اب جملہ صاف ہے "گزران" بمعنی "بسر اوقات" غلط نہیں ہے۔ مولینا حالی فرماتے ہیں ؎

اے غم دوست نہیں تجھ پہ ہی اپنی گزران
کچھ فتوح اس کے سوا اور ہے بالائی بھی

اس سے قطع نظر جن دوسرے جملوں میں گنجلک اور تعقید دکھائی گئی وہ چنداں لائق التفات نہیں ہے کیونکہ یہ ذوق پر منحصر ہے۔

یہ ہیں وہ سطحی اور بے مایہ اعتراضات جو فاضل نقادوں کی علمیت اور ہمہ دانی کے آئینہ دار ہیں جو بے محل اعتراضات سے قارئین کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ ہرگز غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ میرے مخاطب وہ نقاد بھی ہیں جو کھرے اور کھوٹے کو تنقید کی کسوٹی پر آزمانے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

الحاصل تمدن ہائے عتیق کی غیر مربوط اور بکھری ہوئی نشانیوں سے جو کچھ بھی ان برباد شدہ قوموں کے متعلق معلومات فراہم کی جاسکتی تھیں زیر بحث کتاب کے صفحات میں جابجا محفوظ ہیں جن کے مطالعے سے قارئین کی معلومات میں کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ کہنا زیادتی نہ ہوگی کہ بعض واقعات کو اگر کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔ اس لئے کہ مؤرخ کا کام محض واقعات کو جمع کرنا ہی نہیں بلکہ ماحول کی روشنی میں کافی وضاحت و تشریح کرنا بھی ہے۔

اب رہی طرز نگارش تو مثل مشہور ہے کہ "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔" فاضل مؤلفین کی تحریر میں نام نہاد ادب لطیف کی کتابوں کا سا سوقیانہ پن، ہندی اور عربی کے اکھڑ محاورے اور بے جوڑ الفاظ کی پیوند کاریاں نہیں پائی جاتیں۔ زبان نہایت شستہ و رفتہ ہے۔ نیز طرز نگارش نہایت سلجھی ہوئی ہے جس سے آثار پختگی نمایاں ہیں اور انداز بیان حد درجہ دلچسپ ہے۔ عام طور پر تاریخی کتابوں میں جو خشکی اور بنجر پن نظر آتا ہے۔ اس سے یہ کتاب یکسر پاک ہے، ارباب ذوق کو مؤلفین کی سرپرستی کرنی چاہیئے تاکہ وہ اس سے زیادہ مفید اور بیش بہا موضوعات پر خامہ آزمائی کرکے ادب اردو کو مالا مال کریں۔

ابتدا میں مولوی سید محمد اعظم صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ایس سی (کینٹب) پرنسپل سٹی کالج کا پُر از معلومات "پیش لفظ" بھی شامل ہے جس میں تمدن کی ابتدا اور حیات ترقی پر عالمانہ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے جو باوصف ایجاز نہایت معنی خیز ہے صاحب موصوف نے مؤلفین سے بجا خواہش کی ہے کہ وہ تاریخ عالم کے وسیع تر موضوع پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔

بہرحال ادبی کتابوں اور نایاب معلومات سے حقیقی دلچسپی رکھنے والے قارئین سے میری درخواست ہے کہ وہ گمراہ کن اور سطحی تنقیدوں سے احتراز کرکے اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔ بہ لحاظ لطف زبان اور معلومات رنگا رنگ، یہ کتاب اردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہے۔

سید مہدی حسین (عثمانیہ)

(حیدرآباد دکن)



(بقیہ صفحۂ اطفال)

تک تمہارے تجربات کی زبان اس کی دوستی کی گواہ نہ بن جائے۔

سُن لو! کہ زود اعتمادی[1] ہی نے تمہارے باپ کو زندگی بھر ناکام بنائے رکھا۔ دشمن اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ مگر دوستوں کی خود غرضیوں، بد دیانتیوں اور عیاریوں[2] نے اس کا نقشۂ زندگی بگاڑ کر رکھ دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم سب کو دشمن نہ بنانا۔ بلکہ دشمنوں کے ساتھ مدارات[3] کا سلوک کرنا۔ اس طرح تم انہیں دوست تو نہ بنا سکو گے۔ لیکن ان کی شر[4] سے ضرور بچ جاؤ گے۔

آؤ تمہیں بچے، وفادار اور بے غرض دوستوں کا پتہ بتاؤں۔ دیکھو بیٹے! اصلی اور قابل اعتماد دوست تمہیں انسانی آبادیوں، جماعتوں اور محفلوں میں نہیں ملیں گے۔ انہیں حاصل کرنے کے لئے تمہیں لائبریریوں اور کتب خانوں میں جانا پڑے گا۔

کتاب ـــــ خدا شاہد[5] ہے کہ اس سے بڑھ کر وفادار۔ راہبر راہ زندگی۔ غم خوار و غم گسار دوست تمہیں کہیں نہیں ملے گا۔

شاہد! خدارا کتاب کو اپنی زندگی بنا لینا۔ اگرچہ یہ نعمت زندگی سے بھی عزیز تر ہے۔ باقی اگلے خط میں۔

(منقول از پریم لاہور) **تاجور**

---

۱ جلدی بھروسہ کرلینا ۲ مکاریوں ۳ آؤ بھگت ۴ شرارت۔ بدی ۵ گواہ

صفحۂ اطفال

مدیر "پریم" کا خط ——— شاہد جاوید درانی کے نام

(۱)

میرے سب سے چھوٹے اور سب سے پیارے بیٹے شاہد! خدا کرے تم اپنی زندگی کو ملک و ملت اور بنی نوع انسان کے لئے مفید بنا سکو۔ آمین۔

اس وقت تمہاری عمر آٹھ ماہ کی ہے۔ تمہاری معصومانہ شوخیاں تمہارے غم زدہ ماں باپ کی زندگی کا سہارا بن رہی ہیں۔ میں تمہیں ہنستا کھیلتا دیکھ کر تمہارے جواں مرگ بھائیوں کا صدمہ بھول جاتا ہوں۔

ممکن ہے تمہارے ہوش سنبھالنے سے پہلے میں ہوش و حواس کو خیرباد کہہ دوں اور تمہیں زمانے کی ٹھوکروں کے حوالے کر جاؤں۔

ذہین و حسین بچے! خدا نہ کرے۔ ایسا وقت تم پر آپڑے۔ تو ہمت نہ ہار بیٹھنا۔ یاد رکھو! کہ دنیا میں یتیموں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ انسانیت کی تاریخ یتیموں کے کارناموں سے جگمگا رہی ہے

آج بھی جب یہ خط میں تمہیں لکھ رہا ہوں اور اس وقت بھی جب تم اس خط کو پڑھنے کے قابل ہو گے...... تو تم دیکھو گے کہ دنیا کے سب سے بڑے زندہ آدمیوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو یتیمی کی گرد اور بیکسی کی خاک سے اُٹھ کر آسمانِ عزت پر چاند سورج کی طرح چمک رہے ہیں۔

شاہد! میں تو اس یقین میں مبتلا ہوں کہ بچے کے بڑا آدمی بننے کے لئے اس کا یتیم ہونا ضروری ہے۔

میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے نہیں کہ میں مرنے سے ڈرتا ہوں۔ یا زندگی میں مجھے کچھ لطف حاصل ہے۔ بلکہ تم ننھے ننھے بھائی بہنوں کے لئے زندہ رہنے کا خواہش مند ہوں، لیکن جانتا ہوں کہ موت کسی کی خواہش کی پابند نہیں اور دیکھ رہا ہوں کہ میری نت نئی بیماریاں مجھے کشاں کشاں ساحلِ فنا کی جانب لئے جا رہی ہیں۔ میری عمرِ رواں تمہاری نشو و نما سے تیز رو ہے۔ تم جب تک منزلِ شباب تک پہنچو گے۔ غالباً میری قبر کا بھی نشان مٹ چکا ہوگا۔

تمہاری بصارت مجھے دیکھ رہی ہے۔ مگر تمہاری بصیرت جب اپنے پرائے میں امتیاز کرنے کے قابل ہوگی، تو مجھے نہ پائے گی۔

عزیز واقارب جب میری زندگی ہی میں میرے تمہارے پرسانِ حال نہیں۔ تو میرے بعد تم ان سے نگاہِ التفات کی توقع کیسے رکھ سکتے ہو؟ اس لئے جب تم ہوش سنبھالوگے تو اپنے پاس کسی کو نہ پاؤگے۔

جانِ پدر! اس بیکسی کے ماحول سے تم گھبرا نہ جانا۔ اوسان قائم رکھنا اور خدا کے بعد اپنی خداداد قوتِ بازو پر بھروسہ کرنا۔ زندگی کی کشاکش انسان کا امتحان لیا کرتی ہے۔ تمہیں بھی اپنے وقت پر یہ امتحان دینا پڑے گا۔ خدا تمہیں اس آزمائش میں ثابت قدم رکھے۔ آمین۔

شاہد! نیک روشی! نیک نیتی اور ان صفات کے ساتھ عمل کوشی پر مضبوطی سے قائم رہے۔ تو خدا تمہارا حامی و ناصر بن جائے گا۔ اور خدا کو تم نے اپنا بنا لیا، تو پھر کسی کو اپنا بنانے کی ضرورت نہ رہے گی۔ بیگانے، یگانے اور پرائے خود بخود تمہارے اپنے بن جائیں گے۔ دنیا تمہارے آگے بڑھنے کے لئے راستہ چھوڑ دے گی۔ منزل مقصود کی جانب تم جتنے بڑھوگے۔ منزل مقصود اتنی ہی تیز روی کے ساتھ تمہاری طرف بڑھے گی اور ایک دن عزت و عظمت کی ان بلندیوں پر پہنچ جاؤگے۔ جہاں تمہارے حاسدوں کی نگاہ بھی نہ پہنچ سکے گی۔ مگر دیکھنا بیٹے! زندگی کو کامران دیکھ کر زندگی کے غرور میں مبتلا نہ ہو جانا کہ غرور اپنے متعلق فریب کھانے کا نام ہے اور کبریائی تو صرف خدا کے لئے ہے۔ جاہ و جلال کی انتہا کو پہنچ کر اپنی ابتدا کو کبھی نہ بھولنا اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس زریں ارشاد کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ

"تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی۔"

بڑے ہو کر اور بڑے آدمی بن کر خدا کی عبادت اور خلق خدا کی خدمت سے بے پرواہ ہو جانا۔

اپنے خدا، مذہب، وطن، ملت، برادری اور اپنے خاندان کے حقوق کی ادائیگی کو زندگی کی سب سے ضروری چیز سمجھتے رہنا۔

دوستوں کی امداد، عزیزوں کی خبرگیری، پڑوسیوں سے ہمدردی اور اہلِ کمال کی قدر کرتے رہنا۔

پیارے شاہد! بے غرض دوستوں کی تلاش میں وقت نہ کھونا۔ بے غرض دوستی کو اب دنیا بے وقوفی اور مخلص دوست کو مجنوں کا خطاب دیتی ہے۔

کسی کو دوست بنانے میں جلدی نہ کرنا۔ جب

(باقی بر صفحہ ۱۳۰ دیکھیں)

[1] بینائی [2] رشتہ دار [3] خبرگیر [4] مہربانی [5] مددگار [6] اپنے [7] حسد کرنے والوں [8] کامیاب [9] بزرگی

مختصرات

سر سکندر حیات خاں کی حکومت کا مبارک اقدام

پنجاب کی آزاد حکومت نے مارشل لا کے اسیروں کو رہائی بخش کر قابل صد تحسین و آفریں کام انجام دیا ہے۔ اس مبارک اقدام پر وزیر اعظم اور اُن کی کابینۂ حکومت کو ملک کے ہر طبقے سے تبریک و تہنیت کے پیغام بھیجے جا رہے ہیں۔ کانگریس پارٹی نے بھی سر سکندر کی رحمدلی انصاف اور مصلحت بینی کا شکریہ ادا کیا ہے اور یقیناً وہ تمام اہل ملک کی شکر گزاری کے مستحق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ملک ہر ملت کے رہنما اور ملکی پریس متفقہ طور پر ان کے اس مبارک اقدام کی تعریف و تحسین میں رطب اللسان ہے۔

اسیران مارشل لا ۱۸ سال سے ملک کے مختلف جیلوں میں قید و بند کے مصائب جھیل رہے تھے اس طویل مدت میں کسی حکومت کو اُن کے حال زار پر توجہ کی فرصت نہ ملی۔ ملکی پریس اور رہنما ۱۸ سال سے ان مصیبت زدوں کی رہائی کے لئے حکومت پر زور دے رہے تھے۔ لیکن قدرت نے یہ درخشاں سعادت سر سکندر کی حکومت کے لئے محفوظ کر رکھی تھی۔

سر سکندر نے جس شہامت و لبالت سے کام لے کر اسیران مارشل لا کو رہائی بخشی ہے اُسے دیکھتے ہوئے کوئی دیانتدار آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ پنجاب کا کابینۂ وزارت گورنر کے اشاروں پر رقص کر رہا ہے کیونکہ ہز ایکسیلنسی گورنر پنجاب اسیران مارشل کی رہائی کو مناسب خیال فرماتے تو اپنے عہد حکومت کے آغاز ہی میں آزاد کر دیتے، لیکن اُنہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت صوبۂ پنجاب کے نظام سیاسی کی باگ ڈور سر ہربرٹ ایمرسن کی بجائے سر سکندر کے ہاتھ میں ہے۔

اب پنجاب اسمبلی کا کانگریسی گروپ انگلی پکڑتے پہونچا پکڑنے کی فکر میں ہے۔ چنانچہ اُس نے اب حکومت سے یہ مطالبہ کرنا شروع کر دیا ہے کہ تمام سیاسی نظر بندوں کو بھی رہا کیا جائے۔ حالانکہ اُن نظر بندوں میں زیادہ تعداد انارکسٹوں کی ہے جن کی رہائی امن عامہ کے لئے تباہ کن ہو سکتی ہے۔ کوئی حکومت خواہ وہ کانگریسی حکومت ہی کیوں نہ ہو۔ یہ گرانبار ذمہ داری اپنے سر لینے کو تیار نہ ہوگی کہ ایسے نازک وقت میں ان تمام لوگوں کو رہا کر دے جن کی رہائی صوبے کے امن کو زیر و زبر کر سکتی ہے۔ کانگریسی ممبر بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں، مگر وہ حکومت کو بدنام کرنے کے مواقع پیدا کرنے کی سعی میں لگے رہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ دیکھ کر کہ اسیران مارشل لا کی رہائی سے حکومت کو اہل ملک کے روبرو سرخرو ہونے کا موقعہ ملا ہے۔ حکومت کے اس کارنامے کو جدید مطالبے سے چھپانے اور دبا دینے کی مہم کا آغاز کر دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سر سکندر کی بجائے اگر فرشتوں اور دیوتاؤں کی بھی حکومت ہو تو کانگریس پارٹی اس آسمانی حکومت سے بھی مطمئن نہ ہو سکے گی۔ وہ تو صرف اپنی حکومت کے خواب دیکھ رہی ہے، لیکن اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ پنجاب میں اُس کا یہ خواب تشنۂ تعبیر ہی رہے گا۔ اس کی یہ دوگونہ اور متضاد پالیسی پنجاب میں کبھی سرسبز نہ ہوگی کہ جدید دستور حکومت کو تباہ کیا جائے اور اگر وزارت اس کے ہاتھ میں دیدی جائے تو اسی دستور حکومت کے ساتھ تعاون کر کے اُسے کامیاب بنایا جائے۔

سر سکندر کی حکومت صوبے کے حالات اور ضروریات کے مطابق ایک تعمیری پروگرام لے کر اُٹھی تھی۔ اس پروگرام کے پیش نظر پنجاب کے رائے دہندوں نے اُسے ووٹ دے کر کامیاب بنایا ہے۔ اب جب تک وہ پروگرام تکمیل پذیر نہ ہو جائے۔ یہ پارٹی کانگریس کے علی الرغم صوبے پر حکومت کرے گی۔ جدید دستور حکومت سے تعاون کر کے صوبے کے لئے زیادہ سے زیادہ حقوق حاصل کر کے رائے دہندوں سے اپنے مواعید کو ایفا کرنا اُس کا فرض ہے اور اس فرض کی ادائگی ہی پر اتحاد پارٹی کی بقا کا انحصار ہے۔

سارے صوبے کو کانگریس کی تخریبی مساعی کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ پنجاب زراعتی صوبہ ہے۔ پنجاب کے زراعت پیشہ لوگ تباہی کے کنارے آ لگے ہیں۔ خوش قسمتی سے یہ پہلا موقعہ ہے کہ زمیندار رہنما اپنی آزاد حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس موقعے سے فائدہ اُٹھانے کی بجائے اسے تخریبی ہنگامے برپا کر کے ضائع کر دینا زراعت پیشہ پنجابیوں کے حقوق کو تباہ کر دینے کے مرادف

ہوگا۔ کوئی ذمہ دار رہنما غریب کسانوں کے جائز مطالبات مشکلات اور ضروریات کو خطرے میں ڈالنے کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔

وزیرِ تعلیم پنجاب کی تعلیمی پالیسی

پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں آنریبل وزیر تعلیم پنجاب نے اعلان کیا ہے کہ "وہ موجودہ تعلیمی سسٹم کو یکسر بدل دینا چاہتے ہیں"۔

آنریبل وزیر کے اس مبارک اعلان کا ہر حصۂ ملک میں خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ موجودہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم اس قدر فرسودہ ہو چکا ہے کہ اسے جتنی جلدی بھی تبدیل کر دیا جائے صوبے کے تعلیمی مفاد کے مناسب ہوگا۔

موجودہ تعلیمی سسٹم کے متعلق مدت سے ملک میں ایک ہی رائے قائم چلی جا رہی ہے اور وہ یہ کہ یہ تعلیم بے کار، بلکہ ملک کی موجودہ ضروریات کے پیشِ نظر ضرر رساں بھی ہے۔

خود اراکین حکومت بھی اس بارے میں ماہرین تعلیم کے ہم نوا ہیں۔

مختصر یہ کہ تمام طبقات کے اہل الرائے اس نفس الامر پر متحد اللسان ہیں کہ موجودہ تعلیم غیر ضروری اور طریقۂ تعلیم قابلِ اصلاح ہے۔

اسی تعلیم کی یہ برکتیں ہیں کہ تعلیم یافتہ ہندوستان سارے ہندوستان کے لئے وبال دوش بن رہا ہے۔ لاکھوں تعلیم یافتہ اپنے قومی پیشوں سے دست بردار بلکہ اُن کے لئے ناکارہ ہو کر ملازمت کی کیمیا کے واسطے دربدر کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ اُن کے لئے رزق ہے نہ موت۔ بیکاری و بے روزگاری کے ہاتھوں تنگ آ کر ڈگری والے نوجوان رہزنی، خود فروشی اور ہر جانب سے مایوس ہو کر خود کشی کی نذر ہو رہے ہیں۔

آنریبل وزیر تعلیم نے جس مہم کو سر کرنے کا اعلان کیا ہے وہ دشوار بھی ہے اور گراں تکمیل بھی۔ لیکن الوالعزمی کے سامنے ہر دشواری آسان ہو جاتی ہے۔ ہمیں توقع رکھنی چاہیئے کہ یہ "ہفت خوانِ رستم" ہمارے قابل اور اولوالعزم وزیر تعلیم کی گراں قدر مساعی سے طے ہو سکے گی۔

پنجاب میں اگر تعلیمی اصلاحات کامیاب ہو سکیں تو یہ روز سعید اس کے لئے بہت مبارک ثابت ہوگا۔

حکومت پنجاب اور کانگریس

مہاتما گاندھی اور وائسرائے کے تازہ بیانات کی موجودگی میں کانگریس اور حکومت میں اب صرف نزاع لفظی باقی رہ گئی ہے۔

دونوں پارٹیاں اپنی بلندیوں سے اُتر آئی ہیں۔ موجودہ صورت حالات میں کانگریسی رہنما اپنی ضد کا کوئی جواز اب پیش نہیں کر سکتے۔ اسی لئے غالباً مہاتما جی بھی جدید دستور سے تعاون کے لئے آمادہ ہی نہیں، بلکہ اپنے لفظوں میں بیقرار بھی ہیں۔ اِدھر مسٹر برلا فریقین کے درمیان سے اس لفظی نزاع کو بھی دُور کرنے کے لئے ثالث بالخیر بن کر وزیر ہند سے مصروف گفتگو ہیں۔ کوئی دن جاتی ہے کہ کانگریس اور حکومت کے مابین یہ جنگ زرگری ختم ہو کر چھ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہو جائیں گی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جدید دستور حکومت اچھا ہے یا بُرا جیسا کچھ بھی ہے اُس سے تعاون ہی کرنے میں ملک کی بھلائی ہے۔ ہمیں صوبوں میں وسعت زنجیر تک آزادی حاصل ہو چکی ہے۔ اس دستور نے ہمیں غلامی کے گلوگیر طوق سے بہت کچھ آزاد کر دیا ہے۔ یہ آزادی مکمل نہ سہی، بہر حال ایک وجود ضرور رکھتی ہے۔ آخر یہ انقلاب نہیں تو کیا ہے کہ اب مطلق العنان گورنروں کی جگہ مشیر گورنروں نے لے لی ہے۔ اور جدید دستور میں بساطِ حکومت کے کار فرما وزیر شطرنج کے مہرے نہیں، بلکہ ذمہ دارانہ اقتدار اور کار فرمایانہ تسلّط کے مالک بھی ہیں۔ مہاتما گاندھی خود بھی اِس انقلاب کی اہمیت کو محسوس کر رہے ہیں۔ وہ اس درخشاں موقع کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے۔ ان کے تدبّر سے توقع بھی یہی کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی مشہور عاقبت اندیشی سے کام لے کر کانگریسی صوبوں میں کانگریسی وزارتیں منظور کر لیں گے اور کانگریس کی "اگر، مگر" کا جلد ہی خاتمہ ہو جائے گا۔

اتحاد پارٹی کے رہنماؤں نے اس مستقبل کو ماضی ہی آئینے میں روشن پایا اور شروع ہی سے جدید دستور سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی پالیسی اختیار کر لی۔ کانگریس اتنا وقت "اگر، مگر" میں ضائع کرنے کے بعد جس پالیسی پر گامزن ہونے کی تمنا رکھتی ہے، اتحاد پارٹی اسے آغاز ہی میں کسی قسم کے سیاسی غمزے دکھائے بغیر اپنا نظام عمل بنا چکی ہے۔

لیکن مہاتما جی کو خوش نصیبی سے ایسا زود نگر پریس اور

نیاز پرست حلقۂ ارادت میسّر ہے کہ وہ سر سکندر کو دستورِ حکومت کی پزیرائی کے جس گناہ پر طعن و تشنیع کئے جا رہا ہے اسی جرم پر مہاتما کو خراجِ عقیدت پیش کر رہا ہے۔

آخر سر سکندر کا گناہ ہی کیا تھا؟ کہ انہوں نے اس "غلامی کے دائمی پٹے" (جدید دستور حکومت) کو ناکافی سمجھتے ہوئے بھی اس سے فائدہ اُٹھانا منظور کیا، اور کانگریس کے ہمنوا ہو کر اس دستور کا لفظی بائیکاٹ نہیں کیا۔ یہ اگر جرم ہے تو اس میں کانگریس سر سکندر کی برابر کی شریک ہے۔ فرق اگر کچھ ہے تو اتنا ہی کہ سر سکندر اس دستورِ حکومت کو مسترد کر دینے کی پالیسی کے ابتدا ہی سے مخالف تھے۔ وہ اپنے دل و زبان میں ہم رنگی قائم رکھتے ہوئے اوّل وقت اِسے کامیاب بنانے کا عزم لے کر اُٹھے اور ایک ہی جست میں گورنر کو گراں بار ذمہ داریوں سے سبکدوش کر کے "پنجاب پنجابیوں کے لئے" کو نصب العین بناتے ہوئے انہوں نے پنجابیوں کی ایک نمائندہ حکومت قائم کر لی۔

کانگریسی رہنماؤں نے دس ماہ تو اپنے غرورِ کبریائی میں یہ کہتے گزارے کہ جو کانگریس کا دشمن وہ ملک و قوم کا دشمن۔ کانگریس اس غلامی کے پٹے کی دھجیاں اُڑائے گی۔ سر سکندر ٹوڈی، نواب دولتانہ ٹوڈی، اتحاد پارٹی سرکار پرست ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور دس ماہ کے بعد جب آنکھ کھلی تو اپنے خوابہائے شیریں کو شرمندۂ تعبیر نہ پا کر اور یہ دیکھتے ہوئے کہ

"یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے"

عہد شکنی اور شکستِ غرور کی ندامت سے بے نیاز ہو کر اب تعاونی گیت الاپ رہے ہیں۔

اس پر بھی کانگریسی پریس اتحاد پارٹی کے خلاف ہر چار سطر کے بعد ٹیپ کا یہی مصرعہ لگا دیتا ہے کہ

"سر سکندر سرکار پرست اور اتحاد پارٹی چند کاسہ لیسوں کی ایک ٹولی ہے۔ اصل طاقت تو کانگریس کے ہاتھ میں ہے۔"

اور کسی صوبے میں شاید یہ پھبتی موزوں ہو سکتی ہو پنجاب کی برسرِ اقتدار جماعت کو ٹوڈی بنانا تو اس کا منہ چڑانا ہے۔

سر سکندر بار بار یہ اعلان کر چکے ہیں کہ میری حکومت گورنر کی مداخلت بے جا کو گوارا نہ کرے گی اور جب ایسا ہوا ہم مستعفی ہونے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کریں گے۔"

کانگریس بھی اگر ان کی پیروی کر کے اپنی وزارتیں قائم کر لیتی تو اب تک مختلف صوبوں میں بہت سا مفید کام انجام دے سکتی۔ اور اب بھی وہ چھ صوبوں کے موجودہ تعطل کو خیرباد کہہ کے اسی مشروط پالیسی کے مطابق اپنی حکومت قائم کر سکے تو اس کے خیالی شبہات دُور ہو جائیں گے اور آئینی حدود میں رہتے ہوئے وہ پبلک کی اقتصادی تعمیر میں حصّہ لے سکے گی۔

فرقہ پرست اخبارات اور حکومت پنجاب

فرقہ پرست اخبارات کی زہرناک تحریروں سے متاثر ہو کر پنجاب کے تین مقامات میں فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے ہیں۔

اب یہ اخبارات فسادات کی خبروں کو رنگ و روغن دے کر چار کالمی سرخیوں میں انہیں شائع کر رہے ہیں۔ بہت خطرہ ہے کہ فساد کی آگ بڑھتے بڑھتے پنجاب گیر بلکہ ہندوستان گیر ہو جائے۔ یونینسٹ پارٹی کے مقتدر رہنما خان بہادر نواب احمد یار خاں صاحب دولتانہ ایم ایل اے چیف سیکرٹری پنجاب یونینسٹ پارٹی نے عین وقت پر اخبارات کے متعلق انتباہی اعلان کیا ہے [illegible] اس اعلان کے مندرجہ ذیل فقرے فرقہ پرست اخبارات کے لئے تازیانۂ عبرت ہو سکتے ہیں:

"یہ دیکھ کر نہایت افسوس ہوتا ہے کہ اخباروں کے بعض طبقوں کی طرف سے صوبے میں فرقہ وارانہ جوش و عداوت کی آگ کو ہوا دینے کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

فرقہ وارانہ جھگڑوں کا مقابلہ کرنے کے لئے یونینسٹ پارٹی اور موجودہ وزارت صرف ایک پالیسی پر عمل پیرا رہے گی۔ وہ یہ کہ ملک کے مروجہ قانون کو غیر جانبدارانہ طور پر استعمال میں لائے اور قانون توڑنے والے ہر شخص کے خلاف بلا تمیز مذہب و ملت اس کی حد جاری کرے!"

اصل یہ ہے کہ اخبارات خصوصاً پنجاب کے ورنیکولر اخبارات ملک کی فرقہ وارانہ خوں ریزیوں کے براہ راست ذمہ دار گردانے جا سکتے ہیں۔ فرقہ وار لیڈر اسی کثیف سرزمین سے نشوونما پا رہے ہیں جو فرقہ پرست اخبارات تیار کرتے ہیں۔ اب تک تو حکومت کا رویہ یہ رہا ہے کہ وہ اس حد تک فرقہ وارانہ بدامنی کو نظر انداز کیا کرتی ہے جس حد تک

ٹیکس کی وصولی خطرے میں نہ پڑے۔ ورنہ اخبارات کی آتشی فضاؤں کی تعمیر میں وہ ایک تماشائی کی حیثیت میں رہتی چلی آئی ہے۔ اگر وہ اقوام ہند کی باہمی آشتی و صلح کی صحیح معنی میں حامی رہتی تو بدامنی پھیلانے والے اخبارات کو شرانگیزی پر آمادہ دیکھ کر ہی اُن کا گلا گھونٹ دیا کرتی اور ایسا کر سکتی تو آئے دن کی خانہ جنگیوں کے تباہ کن اثرات ملک میں پھیلنے نہ پاتے اور بے شمار جانیں ضائع ہونے سے بچ جاتیں لیکن اسے غفلت سمجھو یا اور کچھ، حکومت نے اپنی قانونی مشینری کو اس سے پہلے کبھی حرکت دینی ضروری نہ سمجھی کہ آتش فساد کے شعلوں کی لپٹ نظام حکومت کے دامن تک نہ پہنچ چکی ہو۔ امن عامہ کو زیر و زبر کئے جانے کے بعد اُس کی تعمیر پر کسی حکومت کو مبارک باد نہیں دی جا سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ پریس ایکٹ زیادہ تر آزادی کی تبلیغ کرنے والے اخبارات کے خلاف استعمال کیا جاتا رہا ہے اور فرقہ پرست اخبار اُس کی زد سے عموماً محفوظ رہتے ہیں۔

اب کہ پنجاب پر پنجابی رہنماؤں کی حکومت ہے۔ ضرورت تھی کہ ہماری اپنی حکومت امن عامہ کو تباہ کرنے والے پریس سے واضح الفاظ میں کہہ دیتی کہ اپنے حدود میں رہو۔ تمہیں شرانگیزی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ نواب دولتانہ کا انتباہی اعلان اسی ضرورت کے اقتضا کی تعمیل کر رہا ہے۔

سب کو معلوم ہے کہ پنجاب کے فرقہ پرست اخبارات نے سارے ملک کی فضا کو مکدر کر رکھا ہے۔ ہمارے اخبار معمولی معمولی مقامی جھگڑوں کو عالمگیر بنا کر ہندوستان کو دو معاند حریفوں میں تقسیم کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پنجاب کی سب سے بڑی لعنت اُس کا ورنیکولر پریس ہے۔ اردو زبان ہندوستانی اقوام کے باہمی ارتباط و اتحاد کی یادگار ہے۔ لیکن پنجاب میں اردو صحافت ظالمانہ طور پر اقوام ہند میں باہمی عناد پیدا کرنے کی ملعون سعی میں مصروف چلی آتی ہے۔

آج ہمارا ورنیکولر پریس اپنی زہر نگاری سے دست بردار ہو جائے تو یہ غیر انسانی خانہ جنگی ملک سے ہمیشہ کے لئے مٹ سکتی ہے۔

کیسا غضب ہے کہ فرقہ پرست اخبارات کی دشنام طرازیوں نے ملک میں ذوقِ اخبار بینی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ آج کسی متین اور تعمیری کام کرنیوالے اخبار کے لئے زندہ رہنے کے تمام مواقع مفقود ہو چکے ہیں۔ اخبار بین طبقہ تلخ نگاریوں کا عادی ہو چکا ہے اور اسی اخبار کو پسند کرتا ہے جس کی تحریر فحاشی کی حد تک تلخ و ترش ہو۔

ہم اپنی جدید حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ اسے تصور کریں گے اگر وہ بے اصولے اور بلیک میلر اخبار نویسوں اور شرانگیز اخباروں کو کچھ مدت سے روک سکی۔ اس بارے میں سر سکندر کو جمہوریت کے تمام آئین سے چشم پوشی کرتے ہوئے ہٹلر کے جاہ و جلال کے ساتھ اخباری بدقماشی کو کچل دینا چاہیئے۔ وہ ایسا کر سکے تو اہلِ ملک پر بڑا احسان کریں گے اور سارا ملک ان کے اس مبارک اقدام پر اپنی متفقہ ممنونیت کا اظہار کرے گا۔

ہندوستانی دواخانہ دہلی

طبیہ کالج ہمارے ملکی طب کا سب سے بڑا مرکز اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے ایثار و فنی خدمات کی ایک شاندار یادگار ہے بہت دنوں سے یہ کالج منتظمین کی بے اعتنائی اور ارباب حل و عقد کی باہمی آویزش کی وجہ سے اپنی امتیازی خصوصیات مٹا رہا تھا۔ طبیہ کالج کے بعض قابل اساتذہ کا اخراج طلباء میں خلفشار، ہندوستانی دواخانے کے متعلق بری افواہوں کے سبب اہل ملک طبیہ کالج کی ترقی کی جانب سے توجہ پھیر چکے تھے۔

شکر ہے کہ درد آشنا اور مردم شناس ٹرسٹیوں نے کالج اور دواخانے کی حالت کی اصلاح کی جانب توجہ مبذول کر کے اپنے ذاتی جھگڑے چکا ئے اور جدید انتخاب میں نظامت کے اصل مستحق اور اہل کو کالج کی نظامت سپرد کی یعنی مسیح الملک ثانی حکیم محمد جمیل خاں صاحب دوبارہ کالج کے سیکرٹری منتخب کئے گئے۔ ہم اس موزوں انتخاب پر کالج کمیٹی کے ٹرسٹیوں کو مبارک باد دیتے ہیں۔

مسیح الملک ثانی کو سب سے پہلے اپنی توجہ ہندوستانی دواخانے کی جانب مبذول کرنی چاہئے۔ ہندوستانی دواخانہ طبیہ کالج کی ریڑھ کی ہڈی ہے کہ اس کی آمدنی سے کالج کے اخراجات نکلتے ہیں۔

ہندوستانی دواخانے کی طرف حکیم محمد احمد خاں صاحب کو ذاتی مصروفیتوں کے سبب نگرانی کا موقعہ نہیں ملا۔ اس کی ابتری کے متعلق مقامی اخباروں نے توجہ بھی دلائی، مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے مرکبات جو اس کے امتیازات سمجھے جاتے ہیں مقامی با خبر اخبار نویسوں نے ان مرکبات سے بری بری افواہیں منسوب کیں۔ مگر حکیم صاحب کو مصروفیتوں نے اصلاح حال کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت نہ دی

دواخانے میں دواسازی کا انتظام کسی ایسے مستند طبیب کے حوالے کرنے کی ضرورت ہے، جو طبی مہارت کے ساتھ دواسازی کے فن کا بھی ماہر ہو۔ عبداللہ چوڑی والا ایک اچھا کنولیسر تو بن سکتا ہے، ہندوستانی دواخانے کا نظام اس کے سپرد کر دینا پبلک اعتماد کا صحیح استعمال نہ تھا۔ اُسے اس خدمتِ ناموزوں سے سبکدوش کرنا چاہیئے تھا۔ شکر ہے کہ اس کے تسلط سے دواخانہ آزاد ہوا۔

طبیہ کالج کے کسی معتمد لائق، ماہر فن دواسازی تعلیم یافتہ کو یہ خدمت سپرد کرنی چاہیئے۔ مولینا حکیم رضوان صاحب پروفیسر طبیہ کالج یا ڈاکٹر حکیم فضل الرحمن خاں صاحب اس خدمت کے لئے بہت زیادہ موزوں ہیں۔

عبداللہ چوڑی والا نہ حکیم، نہ کسی طبیب خاندان کا ممبر نہ اس نے زندگی بھر کبھی دواسازی کا کام کیا، وہ ایک اچھا مصاحب، ایک موزوں تر کنولیسر تو ہو سکتا ہے۔ ہندوستانی دواخانے کا انتظام کرنے کا ہرگز اہل نہ تھا۔

اس کی امداد کرنی ضروری ہی تھی تو کسی اور شعبے میں اس کا تقرر کر دینا چاہیئے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اپنے حسن انتظام، حسن دیانت اور احتیاط و مہارت دواسازی میں پٹنہ کا نورانی دواخانہ تمام ہندوستان میں منفرد اور ممتاز ہے۔ حالانکہ وہ کوئی قومی دواخانہ نہیں لیکن شخص واحد کی ملکیت ہے۔ لیکن معقول مشاہرے پر دو حاذق اور ماہرِ فن طبیب اس کی نگرانی پر متعین ہیں اور نیک منش ناظم حد درجہ دیانتدار اور محتاط واقع ہوا ہے۔ اس دواخانے کو راقم الحروف نے کئی بار دیکھا اور اس کے متعلق اہلِ بہار کے اہل الرائے کی رائیں معلوم کی ہیں۔

طبیہ کالج ہمارا ایک قومی ادارہ ہے۔ ہندوستانی دواخانہ ملک کے معالجوں اور مریضوں کا مرجع امید ہے۔ اس کا نظام بہت کچھ قابل اصلاح ہے۔ قیمتی مرکبات کی نگرانی کے لئے کسی ماہر دواساز اور دیانتدار نگراں کا تقرر اس کے لئے ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ خارج کردہ اساتذہ کی بحالی کالج کی تعلیمی ترقیوں کے لئے از بس ضروری ہے۔

مولینا ڈاکٹر فضل الرحمن خاں صاحب کی علیحدگی کالج کے لئے افسوسناک ہے۔ ایسا قابل اور جامع حیثیات کا عالم کالج کو بہت دشواری سے ملے گا۔ ہمیں امید ہے کہ مسیح الملک ثانی اپنے عہد نظامت میں کالج اور دواخانے کی اصلاح حالات کی جانب سب سے پہلے توجہ فرمائیں گے۔ ڈاکٹر الیف ڈی محمود جیسا ذہین، منتظم اور کارآگاہ، نائب معتمد بھی اس قابل ہے کہ اُس کی مخلصانہ [illegible] کی داد دی جائے۔ مگر یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ حالات نے انہیں مستعفی ہونے پر مجبور کیا اور وہ جائینٹ سیکریٹری شپ سے الگ ہو گئے۔

سب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر محمود کی شبانہ روز مساعی ہی سے یہاں نظام چل رہا تھا ورنہ حکیم محمد احمد خاں اپنی ذاتی مصروفیتوں کی وجہ سے اپنے عہدے کی ذمہ داریوں سے مطلق ربط قائم نہ رکھ سکے۔ ڈاکٹر محمود نے مقدمات کے سلسلے میں جو کار ہائے نمایاں انجام دئیے اُن کا حال ہر کسی کو معلوم نہیں، جو لوگ جانتے ہیں اور ان میں سے راقم الحروف بھی ہے۔ وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر محمود نے کس ہمدردی، جفاکشی اور خلوص سے اپنی منصبی ذمہ داریوں کے ساتھ سیکریٹری شپ کی خدمات بھی انجام دیں۔ مسیح الملک ثانی نے دوبارہ منصب نظامت پر فائز ہونے کے بعد اعلان کیا تھا کہ سابقہ ملازموں کو علیحدہ نہیں کیا جائے گا۔ ہم اُن کی خدمت میں اس عہد کے ایفاء پر اصرار کرنے میں حق بجانب ہیں ممکن ہے ڈاکٹر صاحب کی بعض مساعی مسیح الملک ثانی کے لئے خوشگوار نہ رہی ہوں، لیکن وہ سابقہ نظام کا ایک عنصر رہتے ہوئے فریقین کو خوش کرنے کی منافقانہ پالیسی برتنے سے پہلوتہی کرتے رہے تو انہیں دیانتداری کا کریڈٹ ملنا چاہیئے، نہ کہ ساری خدمات کا صلہ انہیں یہ دیا جائے کہ وہ پنج سالہ ملازمت سے بھی سبکدوش ہونے پر مجبور ہو جائیں۔

تاجور

آل انڈیا براڈ کاسٹنگ دہلی

نئی تہذیب کے برکات میں سے ریڈیو بھی ایک قابل قدر اور کارآمد ایجاد ہے۔ اس کے ذریعہ ساری متمدن دنیا ایک بستی کی حیثیت میں آجاتی ہے۔ باہم افادہ و استفادہ اور تبادلہ خیالات کے مواقع دنیا کے ہر ترقی یافتہ گوشے کے باشندوں کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے ہندوستان کو بھی اس برکت سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا ہے۔

چنانچہ دہلی میں آل انڈیا براڈکاسٹنگ کا محکمہ گورنمنٹ کے ہوم ممبر کی نگرانی میں قائم ہوا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں اس محکمے کی شاخیں قائم کی جا رہی ہیں۔

آل انڈیا براڈکاسٹنگ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر مشہور ادیب

و مزاح نگار مسٹر احمد شاہ بخاری مقرر ہوئے ہیں۔ مسٹر بخاری اپنی گونا گوں قابلیتوں کی بنا پر اس منصب کے اہل بھی ہیں۔ مگر انہوں نے ۳۵ کروڑ آبادی کے ایک برّاعظم پر حاوی محکمے کے کار پرداز ہونے کی حیثیت میں اپنی جماعت کے چند افراد کو سارا ہندوستان تصور کر لیا ہے۔ اس محکمے کا ڈائرکٹر ایک یوروپین ہے ۔ جسے اردو زبان سے واقفیت نہیں اور اس لئے قدرتاً اردو زبان کے مستند اہل قلم، شاعروں، نقادوں وغیرہ سے وہ مسٹر بخاری ہی کے ذریعہ واقف ہو سکتا ہے۔ آل انڈیا براڈ کاسٹنگ کی شاخوں کے لئے کارکنوں کا تقرر بھی بخاری صاحب ہی کے توسط سے ہو رہا ہے۔

بخاری صاحب اس سلسلے میں بھی اپنی چودھراہت کو آل انڈیا بنانے کی خاطر اپنے ہی محدود دائرہ تعارف میں سے کارکنوں کا انتخاب کر رہے ہیں۔

دہلی براڈ کاسٹنگ کا انچارج انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی ذوالفقار علی بخاری کو بنوا دیا ہے۔ حالانکہ اس کی تعلیم میٹرک تک ہے۔ شملے کی شاخ کا انچارج اپنے برادر نسبتی کو بنا دیا ہے۔ یہ بزرگ بھی میٹرک سے آگے نہیں پڑھے اور اردو میں تو صفر کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح براڈ کاسٹنگ پر تقریر کرنے والوں کا انتخاب بھی عموماً حلقۂ احباب سے ہو رہا ہے۔

مسٹر بخاری نے پیش بینی کے طور پر اخبارات میں یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ اس محکمے کے لئے سب سے موزوں کارکن لاہور کے تعلیم یافتہ ثابت ہو رہے ہیں۔ اس طرح انہوں نے گویا علی گڑھ، لکھنؤ، آگرہ، کلکتہ، بمبئی، پشاور اور پنجاب کے دوسرے تمام مرکزی شہروں کے تعلیم یافتہ طبقے کے حقوق بہ یک گردش قلم نظر انداز کر دئے ہیں۔

لیکن لاہور میں بھی ایسے قابل، ذہین اور اس کام کے لئے موزوں نوجوان اتنی تعداد میں مل سکتے ہیں جنہیں ہندوستان بھر کی شاخوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایسے تمام لاہوری تعلیم یافتہ نوجوان بھی آپ کے دائرہ انتخاب میں شامل ہونے سے محروم ہیں۔ لاہوری نوجوانوں کی جماعت جس کا کوئی ممبر بخاری صاحب کی قابلیت سے کم استعداد کا مالک نہیں، اس محکمے کے لئے اچھوت بنا دی گئی ہے۔

چھوٹے بخاری جو اپنی محدود تعلیم اور بوقلموں خصائل کے لئے مشہور عوام ہیں، اِس محکمے کی کسی ذمہ دارانہ ملازمت کے کسی طرح بھی اہل نہیں۔ اس کے سوا کہ وہ بڑے بخاری کے بھائی ہیں ان میں اور کوئی قابلیت نظر نہیں آتی۔

اگر دہلی براڈ کاسٹنگ کے انچارج منیجر کے لئے صرف میٹرک ہونا شرط ہے۔ تو اس فخر میں چھوٹے بخاری کے حریفوں کی تعداد تیس لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ ہمارے پاس اس اجارہ داری کے خلاف بہت سی شکایات پہنچ چکی ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ بڑے بخاری اپنے متعصبانہ اور احباب نوازی کے حقوق کُش رویے میں تبدیلی کریں، مبادا وہ برہمی جو تعلیم یافتہ نوجوانوں میں براڈ کاسٹنگ کے خلاف پھیل رہی ہے۔ عام مظاہرے کی صورت اختیار کر لے۔ دہلی اور پنجاب کے مقتدر اخبارات بخاری برادران کی اس اجارہ داری اور اس سلسلے میں غیر محدود کج روی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر چکے ہیں۔ اور کرتے رہتے ہیں۔

آل انڈیا براڈ کاسٹنگ کے ڈائرکٹر کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے اسسٹنٹ کی احباب پروری سے صرف یہی نہیں کہ ملک کے قابل نوجوانوں کے حقوق پامال ہو رہے ہیں، بلکہ یہ بھی کہ آل انڈیا براڈ کاسٹنگ کا محکمہ قائم کرنے کا مقصد بھی فوت ہو رہا ہے کہ عام طور پر ایک محدود در محدود اور مخصوص حلقے ہی کے چند افراد کی تقریریں براڈ کاسٹ کی جاتی ہیں اور ملک کے سینکڑوں قابل اہل قلم کے نئے خیالات سننے سے پبلک محروم کی جا رہی ہے۔

لاہور کے تمام مقتدر اردو رسائل اس سلسلے میں احتجاجی تحریریں شائع کر رہے ہیں۔

اردو ہندی جھگڑا اور مہاتما گاندھی

اسے ملک و قوم کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہاں جو تحریک شروع ہوتی ہے وہ فرقہ وارانہ تنازع کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی مصیبت "قومی زبان" کے مسئلہ پر پیش آئی۔ اس معمولی اختلاف نے بڑھ کر مستقل اردو ہندی نزاع کی صورت اختیار کر لی اور اسقدر ملک گیر اضطراب پیدا کر دیا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی اسکے متعلق زبان کشائی کرنا پڑی، اسی سلسلے میں شاہکار بابت اپریل ۱۹۳۷ء میں سید ابو القاسم صاحب کا طویل مقالہ "مہاتما گاندھی سے بات چیت ٹھیٹ اردو میں" شائع ہوا ہے اور مئی نمبر میں اس مقالہ کے متعلق سید صاحب کی مہاتما جی سے خط و کتابت بھی شائع ہو چکی ہے۔ سید صاحب نے ہمیں بھی اس موضوع پر قلم

اٹھانے کا حکم دیا ہے۔

جہاں تک بول چال کا تعلق ہے، میں اردو ہندی کو دو زبانیں خیال نہیں کرتا۔ البتہ دونو کا رسم الخط جُدا ہے۔ اگرچہ مہاتما جی نے دو ایک تقریروں میں اردو کو صوبجاتی زبانوں میں داخل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن یہ ان کی بے خبری تھی۔ اس کے بعد اکثر مواقع پر وہ اردو کو ہندوستان کی مشترکہ زبان تسلیم کر چکے ہیں، چنانچہ ڈاکٹر اشرف صاحب نے اس امر کی وضاحت کے لئے کہ مہاتما جی کی مراد ہندی زبان سے کیا تھی" اخبار "ہریجن" سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش کیا ہے:۔

"صرف ہندی زبان میں جس کا بعد میں جاکر دوسرا نام ہندوستانی اور اردو بھی پڑ گیا اور جو دیوناگری اور اردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اس کی صلاحیت تھی اور ہے کہ وہ ہمارے ملک کی مشترکہ زبان قرار دی جائے۔"

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مہاتما جی ہندی، ہندوستانی اور اردو کو ایک ہی زبان سمجھتے ہیں۔

"ہندی ہندوستانی" کی نئی اصطلاح کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے مہاتما جی فرماتے ہیں:۔

"میں نے آج نہیں بلکہ ۱۹۱۸ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر کی حیثیت سے ہندی بولنے والی دنیا کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ ہم لوگ ہندی کے مفہوم کو اتنا وسیع کر دیں کہ اس کی تعریف میں اردو آجائے۔ جب ۱۹۳۵ء میں میں نے دوسری بار ہندی ساہتیہ سمیلن کی صدارت کی تو میں نے ہندی اصطلاح کی باضابطہ طور پر اس طرح تعریف کی کہ ہندی اس زبان کا نام ہے جسے ہندو اور مسلمان دونو بولتے ہیں اور جو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اس تعریف سے میرا منشا یہ تھا کہ ہندی زبان بیک وقت مولانا شبلی کی فصیح و بلیغ اردو اور پنڈت شیام سندر داس کی فصیح و بلیغ ہندی پر مشتمل ہو۔"

ان اقتباس کو دیکھنے کے بعد کوئی منصف مزاج انسان مہاتما گاندھی کی نیت پر حملہ کرے تو سمجھا نہیں۔ بالفرض محال اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ مہاتما جی اردو کے خلاف سرگرم عمل ہیں تو ان پر کوئی الزام نہیں آتا۔ انہوں نے ہندی کی آغوش میں پرورش پائی ہے، ان کا ماحول سراسر ہندیانہ ہے جس کے کسی گوشے سے اردو کی حمایت میں کوئی آواز نہیں اُٹھی وہ خود اردو نہیں جانتے جس کا ثبوت مہبت (محبت)۔ ذاہر (ظاہر) اور نہ کی (رذ کر) وغیرہ الفاظ ہیں۔ اس لئے ان کا اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت کرنا قابل اعتراض نہیں۔

میں ذاتی طور پر ہندوستان کی مشترکہ زبان کے لئے اردو کا لفظ پسند کرتا ہوں۔ اگرچہ ہندی اور ہندوستانی بھی اردو ہی کے پُرانے نام ہیں اور ان میں یکسر کوئی فرق نہیں لیکن لفظ "اردو" میں کون سی بُرائی ہے کہ اسے ترک کر کے ہندی، ہندوستانی یا ہندی ہندوستانی.... وغیرہ نام رکھے جائیں۔

اب رہا رسم الخط کا معاملہ۔ مہاتما جی اور برادران وطن نے کبھی اس حقیقت کی جانب توجہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ اردو رسم الخط، دیوناگری رسم الخط سے زیادہ دلکش، آسان اور مختصر ہے۔ جیسا کہ سید ابوالقاسم نے تحریر فرمایا ہے جو مقالہ "اردو ٹائپ" نے پینتیس ۳۵ صفحوں میں لکھا، اسے دیوناگری ٹائپ نے سو سے زائد صفحات میں پورا کیا۔ اس طوالت اختصار کے علاوہ اردو رسم ہمارے ہمسایہ ملکوں کے رسم الخط سے ملتا ہے۔ آزاد ہندوستان کو یہ رسم الخط ان ممالک سے روابط قائم رکھنے میں بہت مدد دے گا۔ اس لئے یہ...... ہندوستان کی مشترکہ زبان کے لئے یقیناً زیادہ مفید ہوگا۔

آخر میں میں مسلمانوں سے یہ اپیل کروں گا کہ وہ خواہ مخواہ اردو کو ہندی کے مقابلہ میں لاکر ملک میں تشتت و افتراق پیدا نہ کریں، بلکہ اردو کی ترویج کے لئے نہایت خاموشی سے عملی کام کریں۔ صرف گفتار سے کبھی مقصد حاصل نہیں ہوا کرتا، اور اس کے ساتھ ہی انہیں ہندی بھی ضرور سیکھنی چاہیئے، اس سے نہ صرف وہ اردو کی اہم خدمت بجا لائینگے بلکہ ملک میں اتحاد و اتفاق کی تخلیق کا موجب ہوں گے۔

آغا حشر کی یادگار اور ڈرامے

آغا حشر مرحوم کے متعلق ملک و قوم نے جس فراموش گارانہ سرد مہری کا ثبوت دیا ہے وہ انتہائی ماتم طلب ہے۔ رسالہ ادب لطیف، شاہکار اور نیرنگ خیال میں متواتر پانچ ماہ سے آغا حشر مرحوم کی یادگار اور ان کے ڈراموں کے متعلق لکھا جا رہا ہے، لیکن ہنوز یہ آواز شرف سماعت حاصل نہیں کر سکی۔

آج سے تین سال پیشتر جب آغا حشر ہم میں موجود تھے تو اُن کے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک فقرے بلکہ ایک ایک لفظ کو

سلک مروارید سے بہتر قرار دیا جاتا تھا، اُن کی شاعرانہ عظمت اور تمثیل نگارانہ رفعت کے آگے بڑے سے بڑے صاحبِ فکر کا سر نیاز خم ہو جاتا تھا، انھیں شیکسپیر ہند اور نہ جانے ایسے کون کون سے خطابات سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی

آنکھ سے دور دل سے دور

کے مصداق ہم اس قابلِ احترام ہستی کو قطعاً بھول گئے اور اب اس کی ہستی کے ساتھ ساتھ اس کی یادگار، اس کی معنوی اولاد کو بھی فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ اگرچہ یہ لفظ بار بار دہرائے جا چکے ہیں، لیکن میرا دل انہیں پھر لکھنے پر مجبور ہے، کہ اگر حشر کسی زندہ قوم کا ڈراما نویس ہوتا تو اس کے مرتے ہی مختلف صورتوں میں جگہ جگہ اس کی شاندار یادگاریں قائم کی جاتیں، اس کے ڈراموں کو جو یقیناً ادبیاتِ اردو کی متاعِ گراں ارز ہیں، بہترین صوری خوبیوں سے آراستہ کر کے نہایت ادب و احترام کے ساتھ شائع کیا جاتا اور ملک انہیں دل و چشم میں جگہ دیتا۔ لیکن آہ! غلام آبادِ ہند میں زندہ اہلِ کمال تک کو کوئی نہیں پوچھتا۔ مرنے کے بعد بھلا کون یاد کرنے کی زحمت گوارا کر سکتا ہے؟

یادگار کا مسئلہ تو دُور کی بات ہے، اس کے لئے منظم جد و جہد اور بے حد سرمایہ کی ضرورت ہے۔ ماتم طلب امر یہ ہے کہ مرحوم کی عمر بھر کی کمائی ضائع کی جاتی ہے۔ ان کی معنوی اولاد پر چھری چلائی جا رہی ہے۔ تاکہ "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری"۔

"بقول مولانا تاجور (مدظلہٗ) آغا حشر کے ڈرامے یقیناً نثری شاعری کے غیر فانی نمونے ہیں۔ یہ ڈرامے ان بڈھے ایکٹروں کی ہنگامہ پروری کے طفیل اسقدر مسخ ہو چکے ہیں کہ انہیں اصلی صورت میں لانا ایک مبصر نقاد کی شبانہ روز محنت کے بغیر مشکل ہے۔ آغا حشر کے بے بہا ادبی فتوحات، وقت، ذوق، سرمایہ اور دماغ چاہتے ہیں اور ہمارے بازارِ ادب میں ان چیزوں کا قحط ہے۔"

بازاری ڈراموں کو تو جانے دیجئے۔ سب سے افسوسناک امر یہ ہے کہ بہت سے ڈرامے جو اُن کے عزیزوں کے پاس ہیں وہ انہیں اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر دبائے بیٹھے ہیں، بلکہ انہیں اپنی وراثت سمجھ کر ان سے اپنی تکمیلِ شہرت کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا برادرم میرزا ادیب بی۔ اے نے ایک ڈراما دیکھا تھا جس میں فقرات کے فقرات آغا مرحوم کے ایک ڈرامے سے لئے گئے تھے اور اب یہ دیا اتنی بڑھ گئی ہے کہ دیدہ دلیری سے آغا مرحوم کے پورے ڈراموں کو اپنے نام سے فلم کیا جا رہا ہے۔

"پریم کی آگ" آغا حشر کا مشہور ڈراما ہے اور مختار فلم کمپنی کی جانب سے متواتر و مسلسل کئی ماہ تک آغا حشر کاشمیری کے جادو ریز قلم کی حسین مصوری" کے عنوان سے اس کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا رہا لیکن پچھلے ہی دنوں منٹگمری میں مجھے اس ڈراما کو دیکھنے کا موقع ملا تو میں حیران رہ گیا کہ آغا مرحوم کی بجائے خواہر زادہ آغا حشر کاشمیری کا نام بطور مصنف و مکالمہ نویس وغیرہ لکھا ہوا تھا۔ حالانکہ ڈراما کے مکالمے صاف بتا رہے تھے کہ ہمارا خالق حشر کا جادو ریز قلم ہے۔ اس امر کا بلاشک مجھے اقرار ہے کہ سعادت مند بھانجے نے اکثر جگہ اپنی مکالمہ نویسی و تمثیل نگاری کا ثبوت دینے کے لئے قطع و برید ضرور کی ہے۔ بلکہ ڈرامے کا خون کر کے رکھ دیا ہے۔ لیکن اس بات سے کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ یہ ڈراما آغا مرحوم کے تخیل کا رہینِ منت ہے۔

کیا قوم اسی طرح خوابِ غفلت میں مدہوش رہے گی اور ادبِ اردو کے محسنِ اعظم کے خون سے سینچے ہوئے شاہپاروں کو اس طرح ضائع ہوتا دیکھتی رہے گی؟

صحافت ملک و قوم کی زبان ہوتی ہے، اس معاملہ میں مجھے اردو رسائل و جرائد سے بھی شکوہ ہے اور سچا شکوہ کہ "ادبِ لطیف" اور "شاہکار" کی تحریک و تائید کے باوجود انہوں نے اس ضروری امر کی جانب توجہ مبذول کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ حکیم یوسف حسن صاحب نیرنگ خیال میں اس کے متعلق شذرہ لکھ کر فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ اور باقی سب خاموش ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلے کو قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔

مقتدر معاصرین کی خدمت میں مؤدبانہ درخواست ہے کہ وہ فوراً اس اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول فرمائیں کیونکہ ڈر ہے مبادا ان کی غفلت مرحوم کی دماغی کاوشوں کو ملیامیٹ کر دے۔

میں یہ سطور لکھ ہی رہا تھا کہ ہفتہ وار "مصور" بمبئی کے تازہ نمبر میں اسی موضوع پر لکھے ہوئے شذرہ پر نظر پڑی۔ قابل مدیر نے ملک اور خصوصاً آغا مرحوم کے چھوٹے بھائی آغا محمود اور اُن کے بھانجے آغا جبار کو اس اہم مسئلے کی جانب توجہ دلائی ہے اور اپیل کی ہے کہ وہ باہمی اختلافات مٹا کر ایک ایسا ادارہ قائم کریں جو "حشریات" کی اشاعت کا انتظام کرے۔

کاش یہ اپیل کارگر ہو سکے۔

یزدانی

سوال و جواب

سوالات

(۱) مولانا سیماب اکبرآبادی لکھتے ہیں کہ اگرچہ مُعَنوَن (بضمۂ میم اوّل، وفتحۂ عین، بسکون نون، بفتحۂ واوٌ وسکونِ نون) عربی میں صحیح ہے۔ اور جو حضرات اس لفظ کو اس طرح بولتے اور لکھتے ہیں وہ حق بجانب ہیں، لیکن یہ لفظ اپنے عربی تلفظ کے ساتھ اردو زبان میں بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے مفعول کے وزن پر مَعنُون (لعنون کا مفعولِ قیاسی) بھی صحیح ہے۔

براہِ کرم معنون کے صحیح اردو تلفظ سے آگاہ فرما کر ممنون فرمائیں۔

(رشید صدیقی) گورنمنٹ کالج لاہور

(۲) اکثر ادبار و شعراء عرصہ بمعنی مدّت استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے مؤقت الشیوع رسائل میں یہ لفظ میں نے اسی معنے میں لکھا دیکھا ہے۔ لیکن میرے ایک دوست اسے غلط سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عرصہ کے معنے میدان کے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

حسن محمد احسن

وٹرنیری ہسپتال منٹگمری

(۳) دوپہر میدان، گرمی، حبس، ابر بے متاع
سرنگوں ہے خار و خس پر اک گلِ فیروزہ فام

(درد زندگی صفحہ ۲۸۶ از احسان ابن دانش)

گرمیاں، حبس، رات، تاریکی
اک دیا دُور ٹمٹماتا ہے

(درد زندگی صفحہ ۳۱۲)

ان دو شعروں میں حبس کا کونسا تلفظ صحیح ہے؟

(۴) احسان ابن دانش کا ایک شعر ہے؎

تیرے قانونِ وفاسوزی میں فرق آتا نہیں
کیوں زمیں ملتی نہیں کیوں چرخ تھراتا نہیں

فرق کی "ر" تقطیع میں گر جاتی ہے اور "فق" پڑھا جاتا ہے۔ کیا یہ احسان دانش کے اس شعر میں ایک دھبہ نہیں۔

شیخ محمد طفیل شملہ

(۵) ا۔ میرزا یاس یگانہ لکھنوی نے غالب شکن میں Optimism اور Passimism کا استعمال بہت کیا ہے۔ کیا اردو میں ان کے مرادف الفاظ موجود نہیں۔ اگر ہوں تو شاہکار میں درج فرما کر شکر گزار فرمائیں۔

(ب) ماہتاب بمعنی چاند اور نکہت بکاف فارسی درست ہے یا نہیں؟

پیرزادہ منظور عالم منظور (جالندھر)

جوابات

(۱) علامہ سیماب مدظلہ کی یہ ذاتی رائے ہے۔ مَعنُون بر وزن مفعول فصحائے اردو استعمال نہیں کرتے۔ اردو میں مُعَنوَن (اصلی عربی تلفظ میں) صحیح ہے۔

(۲) آپ کے دوست درست فرماتے ہیں کہ عرصہ کے معنی میدان کے ہیں۔ لیکن اردو میں مدّت کے معنوں میں بھی مستعمل ہے اور فصحائے اردو ان معنوں میں بالعموم استعمال کرتے ہیں۔ عربی، فارسی کے ایسے بہت سے لفظ ہیں جن کے معنے اردو میں کچھ اور ہو گئے ہیں، لیکن چونکہ وہ جزوِ زبان بن چکے ہیں اس لئے اب انہیں غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ از اں جملہ "عرصہ" بھی ہے جس کے معنے اردو میں مدت کے ہو گئے ہیں، لیکن اصلی معنے بھی غلط نہیں۔

(۳) دونوں شعروں میں حَبس کا تلفظ ایک ہی ہے اور وہی صحیح بھی یعنی بہ فتحۂ حاء حطی وسکون بار۔

(۴) فرق کی "ر" تقطیع میں نہیں گرتی۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی لفظ کا پہلا حرف الف ہو تو اس سے ماقبل لفظ کا آخری لفظ الف میں مدغم کر دیا جاتا ہے۔ اس مصرعہ کی تقطیع اس طرح کی جائے گی:-

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
تیرے قانو نِ وفاسو زی میں فرقا تا نہیں

(۵) ا۔ اردو میں Optimism کے لئے رجائیت اور Passimism کے لئے قنوطیت (یاسیت) مستعمل ہیں۔ میرزا یگانہ رجائیت اور قنوطیت کو مذکورہ انگلش الفاظ کا مرادف نہ سمجھتے ہوں گے یا شاید انہوں نے عام ادبار کی تقلید

گوارا نہ کرتے ہوئے انگریزی الفاظ کا استعمال ہی ضروری سمجھا ہو آخر ٹھہرے نا چنگیزی!

ب - دراصل تابِ ماہ تھا جو مقلوب ہو کر ماہ تاب (ماہتاب) بن گیا - اس لئے ماہ (چاند) کے معنے میں اس کا استعمال لغوی طور پر درست نہیں - لیکن چونکہ قدماء نے بکثرت استعمال کیا ہے اس لئے اب محل اعتراض نہیں -

نکہت عربی لفظ ہے اور عربی میں کافِ فارسی کبھی نہیں آتا۔ اس لئے نگہت لکھنا یا بولنا صحیح نہیں۔

یزدانی

کیفیات

ہر سر ہے تیری زُلف کا سودا لئے ہوئے
صبحِ حرم ہے شامِ کلیسا لئے ہوئے

میری نگاہ، عجزِ تماشا لئے ہوئے
وہ ہر نظر میں طُور کا جلوا لئے ہوئے

بیمارِ ہجر نیند قیامت کی سو گیا
آنکھوں میں انتظار کی دُنیا لئے ہوئے

او صاحبِ نظر! نگہِ یک نگر سے دیکھ
قطرہ بھی ہے حقیقتِ دریا لئے ہوئے

آیا ہوں آج میں بھی تری جلوہ گاہ میں
دُھندلا سا ایک نقشِ تمنّا لئے ہوئے

او بیوفا فریب اور ایسا کُھلا فریب
وعدے ہیں اعتبار کی دُنیا لئے ہوئے

بیمارِ غم کو آخری ہچکی بھی آ گئی
ناکام زندگی کا فسانا لئے ہوئے

اے دوست! چاکِ دامنِ یوسفؑ کا واسطہ
آ جا کبھی تو دستِ زلیخا لئے ہوئے

ساقی کی چشمِ مست نے پھر لڑکھڑا دیا
اُٹھا تھا لغزشوں کا سہارا لئے ہوئے

ماہرؔ ہے اُس کے سامنے کعبہ بھی سجدہ ریز
جو دل ہے عکسِ گنبدِ خضرا لئے ہوئے

ماہر القادری

گل ریزیٔ خیال

(۲)

نواب خیالؔ مرحوم کا ایک "خط" جون نمبر میں ہدیۂ ناظرین ہو چکا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس خط میں ترتیب ملحوظ نظر نہ رکھ سکا۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے ممدوح کے تمام مکتوب دستیاب نہ ہو سکے تھے۔

نواب صاحب کے خطوط میں ایک بات مجھے بےحد پسند ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے چھوٹے فقرے۔ مؤثر، آسان اور سمجھ میں آنے والے الفاظ۔ اس لئے اگر نواب خیالؔ مرحوم کے مکتوب کا مجموعہ شائع ہو جائے تو ادبِ اردو میں ایک "گرانقدر" اضافہ ہوگا۔

کسقدر افسوس کی بات ہے کہ "ادبِ غلیظ" پر ٹن کے ٹن کاغذ خراب کر دئے جاتے ہیں، جو سراسر ادب کے لئے بوجھ ہیں اور "ادبِ عالیہ" کے نمونے بستوں میں دبے پڑے ہیں۔ ہماری قوم جب تک زندہ لٹریچر کی قدر نہ کرے گی "زبانِ اردو" خاطرخواہ ترقی نہیں کر سکتی!

لہٰذا میں اپنے اس مقالہ کے ذریعہ تحریک کرتا ہوں کہ نواب خیالؔ مرحوم کے خطوط کا مجموعہ شائع کیا جائے ورنہ یہ جواہر پارے بھی خذف ریزوں میں مل کر اردو ادب کی قسمت کے نہ رہیں گے!

اتنا کچھ کہہ لینے کے بعد میں۔۔۔۔ نواب خیالؔ مرحوم کا ایک اور خط بنام سید واسطی مرحوم نقل کرتا ہوں۔

(افضال شاہ آبادی)

نقل خط:-

پرنسپل سٹریٹ کلکتہ
۱۹ / مئی ۱۹۱۵ء

جناب مکرم۔ سلام علیکم و قلبی لدیکم۔ مجھے علم ہے کہ آپ عرصہ سے میر انیسؔ کے کلام کی تصحیح اور اس کی اشاعت کے متمنی ہیں۔ میں بھی اس کا آرزومند تھا اور اب ایک موقعہ ایسا مل گیا ہے کہ امید ہے کہ یہ آرزو پوری ہو جائے۔ اس کام کی تکمیل کے لئے میں نے قصد کر لیا ہے کہ اب کی برسات بعد لکھنؤ جاؤں اور وہاں چند ے قیام کر کے اس کام کو پورا کر دوں۔

اس بیچ میں اس کے متعلق اور ضروری امور کو ختم کر لینا چاہتا تھا۔ سب میں بڑی ضرورت یہ ہے کہ جہاں تک دستیاب ہو سکیں انیسؔ کے مراثی جمع کر لئے جائیں تاکہ تصحیح کے وقت وہ سب پیشِ نظر رہیں اور کام میں فراغت و آسانی ہو۔ مہربانی کر کے مجھے مطلع کیجئے کہ اس امر میں آپ کہاں تک میری مدد کر سکتے ہیں؟

دوسرا ضروری امر یہ ہے کہ میں تاریخ مرثیہ گوئی پر ایک بسیط مضمون لکھنا چاہتا ہوں۔ اور اردو میں کیونکر اس صنف کی ابتدا ہوئی اور عہد بہ عہد کس طرح اس نے ترقی کر کے وہ کامل صورت اختیار کی جو آج میر انیسؔ کے یہاں نظر آتی ہے۔

اس ارتقا کے دکھائے اور سمجھائے بغیر انیسؔ کی تکمیل پر وہ نظر نہیں پڑ سکتی۔ جس کا وہ کلام مستحق ہے۔ اس کے لئے ضرور ہے کہ آج تک جتنے مرثیہ گو ہوئے ہیں اُن کا بیان کر کے ان کے کلام کا نمونہ پیش کر دیا جائے۔ عربی و فارسی میں اس کا مسالہ موجود ہے اور وہ میرے پیشِ نظر ہے۔ اردو کے لئے البتہ دقتیں واقع ہو رہی ہیں۔ بعض پرانے مرثیے سے بھی تو اُن کے مصنفین کا نام و نشان اور ان کے حالات ابتک معلوم نہ ہو سکے اور بعضوں کے ناموں سے آگاہ ہوا تو ان کا کلام نہ مل سکا!

میں خاص طور پر آپ سے ملتجی ہوں کہ اگر اس مادے میں بھی آپ میری کوئی مدد فرما سکیں تو دریغ نہ فرمائیں۔ پرانے مرثیہ گویوں کی ایک فہرست حاضر کرتا ہوں۔ ان میں سے جس کا کلام آپ کے پاس ہو یا میرے لئے فراہم کر سکتے ہوں مجھے مطلع کریں اور ان حضرات میں سے جن کے حالات سے آپ باخبر ہوں مجھ بےخبر کو بھی خبر کر دیں۔

پرانی ہندی یعنی بھاشا میں بھی مرثیئے موجود ہیں، جو اب تک سوز میں پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں سے جو کچھ آپ کے ذریعہ سے نصیب ہوگا بصد فخر کے ساتھ اس کے لئے ہاتھ بڑھاؤں گا اور سرِ نیاز و تسلیم خم کر کے بعد شوق و منت اسے قبول کر لوں گا۔

پرانے مرثیہ گو:۔

میاں سکندر، قاسم، افسردہ، گدا، مسکین، حیدری، مرزا ظہور علی خلیق، عزا، تپاں، فرح اور ترقی۔

اب تک اتنوں کو جانتا ہوں۔ اور ان میں سے اکثر کا کلام ہمارے پاس موجود بھی ہے۔ آپ ان کے علاوہ اگر کسی مرثیہ گو کے نام جانتے ہوں تو مطلع کریں اور ان کے نام و نشان اور حالات سے بھی واقف ہوں تو فقیر کو خبر دیں۔ جواب کا منتظر رہوں گا۔ زیادہ تسلیم

نیاز مند

خیالؔ

(مرسلہ) افضال شاہ آبادی

نوائے جنوں

رسم و رہِ دنیا سے بیگانہ بنانا تھا　　ایوانِ محبت کا پروانہ بنانا تھا

اللہ سے شکوہ ہے خاکم بدہن مجھکو　　فرزانہ بنایا کیوں دیوانہ بنانا تھا

اے عشقِ جنوں پیشہ یہ آبلہ پائی کیوں　　سنگِ درِ جاناں پر بتخانہ بنانا تھا

تہذیب کے یہ پردے کیوں راہ میں حائل ہوں　　آئینِ محبت کو رندانہ بنانا تھا

حیرت کی تمنا تھی اور عقل سے بیزاری　　مدہوشی کے عالم میں بتخانہ بنانا تھا

ہوش و خرد و دانش سب عشق شراب اولیٰ　　مجھ کو تو مرے اللہ مستانہ بنانا تھا

وہ موجِ شراب اٹھی وہ "نورِ سحر" چمکا
کیا اپنے ضیا کو یوں دیوانہ بنانا تھا

محمد ضیاء الاسلام ضیا

۲ — ہزہائینس کے خط ع۱/۵ مورخہ ۱۰ اگست ۱۸۶۸ء سے اس بات کا پتہ چلے گا کہ شہزادہ عظیم جاہ بہادر نے اپنی یہ دلی خواہش ظاہر کی ہے کہ اس حکومت کی سفارش کے مطابق جو انتظامات عمل میں لائے گئے ہیں اس سلسلہ میں ہزہائینس کی لڑکیوں کے وظائف کی حد تک نظرثانی ہونی چاہیئے۔ ہزہائینس کی یہ درخواست ہے کہ ان کی لڑکیوں کے نام جو وظائف جاری کئے گئے ہیں ان کی مقدار اُن وظائف سے کسی طرح کم نہ ہو جو اُن کے لڑکوں کے نام اجراء ہوئے ہیں۔

۳ — اس کام کے کرنے کے لئے اور حکومتِ ہند کے اعتراض کی صفائی کی خاطر جس کو میں نے اپنے خط بنام حکومتِ ہند مورخہ ۲۷ اپریل کے فقرات ۸، ۹ اور ۱۰ میں واضح کر دیا ہے اور اسی کے ساتھ ہزہائینس کے اصل خط کو بھی منسلک کر دیا گیا تھا۔ اب شہزادہ عظیم جاہ کی یہ تحریک ہے کہ ان کی اولاد کے موجودہ وظائف میں دس فیصدی اور ان کی آمدنی میں دس فیصدی سے کچھ زیادہ کی کمی کر دی جائے۔

۴ — مجوزہ انتظامات کے تحت ہزہائینس کی شادی کی اولاد میں سے ہر ایک لڑکا اور ہر ایک لڑکی سالانہ دس ہزار روپے حاصل کرے گی۔ ہماری حکومت کی پہلی سفارش کے مطابق جو انتظامات عمل میں لائے گئے تھے اس کی نقل ہزہائینس کی مجوزہ اسکیم کے ساتھ منسلک کی جاتی ہے تاکہ دونوں تجاویز کا تطابق ظاہر ہو جائے۔"

۵ — اب میرے پیشِ نظر یہ چیز ہے کہ اگرچہ ہماری حکومت یہ تصور کرتی ہے کہ اس نے اس معاملہ میں جو بھی انتظامات کئے ہیں وہ ہر حیثیت سے مناسب اور بجا ہیں تاہم میں یہ سمجھتا ہوں کہ نواب نے جو موجودہ اسکیم پیش کی ہے وہ بھی کسی طرح نامناسب نہیں ہزہائینس کی یہ تجویز کہ ان کی نکاح کی بیوی سے جو لڑکے ہیں ان کے وظائف کی مقدار بھی وہی ہو جو ان کی شادی کی بیگم سے لڑکیوں کے وظائف کی ہے کسی حد تک نامناسب تو ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہزہائینس کے خاندان میں یہی طریقہ چلا آرہا ہے کہ وہ نکاح اور شادی کی اولاد میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتے ہیں تاکہ مساوات کے بارے میں ولی عہد تک کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ خود ہزہائینس کی ایک سب سے پہلی تجویز جس میں یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ ولی عہد خطابات مناسب اور سالانہ پچاس ہزار کے علاوہ اپنے تمام بھائی اور بہنوں کے ساتھ رشتہ مساوات کو قائم رکھنے کی خاطر ان کا برابر حصہ دار رہے گا۔ جس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس اسکیم کو حکومت نے ہزایکسیلنسی گورنر جنرل ان کونسل کی منظوری کے لئے پیش کر دیا تھا، لیکن ہزہائینس کی اب نئی تجویز یہ ہے کہ حکومت ہند ان کی نئی تحریک پر غور کرنے کے بعد حسب خواہش ترمیم کر دے۔

ع۲۹ ذیل کا خط من جانب منصرم مددگار معتمد حکومت ہند امور خارجہ (سیاسی)، بنام چیف سکرٹری حکومت ہند، فورٹ سینٹ جارج ع۱۱۵۷ مورخہ ۸ اکتوبر ۱۸۶۸ء از مقام شملہ۔

آپ کے خط ع۱۹۹ مورخہ ۱۲ ماہ گذشتہ کے جواب میں عرض ہے کہ وائسرائے اور گورنر جنرل ان کونسل حکومت مدراس کی سفارش کے مطابق نواب عظیم جاہ کے انتقال کے بعد ان کے خاندان میں وظائف کی تقسیم کے مسئلہ پر ہزہائینس کی خواہش کے موافق دوبارہ غور فرمائیں گے اور آپ کی پیش کردہ تجویز پر پورا عمل ہوگا۔"

نواب غلام رسول خاں اور شہزادہ عظیم جاہ کی لڑکیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا، اس لئے کہ عظیم جاہ کی لڑکیاں امیرالامراء عمدۃ الامراء کی پڑپوتیاں ہوتی تھیں اور دوسری خود نواب غلام رسول خاں کی لڑکیاں تھیں ان تمام فرقوں کے باوجود اس وقت کی حکومت نے مناسب نہیں سمجھا کہ اپنے پچھلے فیصلہ پر مکرر غور کیا جائے بلکہ ہمیشہ کے لئے استقلال اور ثابت قدمی کا بیڑا اٹھا لیا اور اس طرح نواب کی لڑکیوں کو ان کے یا ان کے رشتہ والوں کی بلا کسی قصور کے فاقوں مرنے کا موقع دیا۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ کرناٹک خاندان کے وظائف کو جاری رکھنے کے لئے حکومت ہند نے وہ نہایتی رقم والا جاہی خاندان میں اور باقی عظیم الدولہ کے گھرانے میں اور وہ جملہ معقد رقم وظیفہ جو پہلے شخص کے نام منظور ہوئی تھی اور جس کو وہ اپنی زندگی تک حاصل کر رہا تھا، شہزادہ عظیم جاہ کے خاندان میں منتقل کر دی گئی۔

یہاں پر یہ امر غور طلب ہے کہ حکومت ہند کے کسی ریاست کو اپنی سلطنت سے ملحق کرنے کے بعد حکومت خوشی کے ساتھ معزول حکمران اور اس کے خاندان کے افراد کو ازراہ مہربانی یا

ان کی ضبطی کی ہوئی ملک کے صلہ میں معقول وظائف دیتی تھی ، ازراہِ مہربانی جو وظائف جاری کئے جاتے تھے ان کا انحصار حکومت کی سخاوت ، دریادلی اور محض رحم وکرم پر منحصر تھا اور جو وظائف کسی بدلہ کے تحت جاری ہوتے تھے وہ گویا اصل مالکان جاگیر کی ذاتی وملکی جائداد کا حصہ تصور ہوتا تھا۔ ان دونوں صورتوں میں جو وظائف جاری ہوتے تھے وہ موروثی اور پشت در پشت تک جاری رہتے تھے، لیکن ان دونوں میں صلہ والے وظائف کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ ان کا پانے والا واجبی حقدار تسلیم کیا جاتا ہے جس کا ثبوت ذیل کے چند اقتباسات سے مل سکتا ہے۔

عـ۱۲ ذیل کا منسلکہ حصہ منجانب مددگار معتمد حکومت ہند محکمہ فینانس مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۸۷۱ء و عـ۲۲۱۸ ازمقام شملہ، ملاحظہ ہو۔

جب دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وظیفہ مذکورہ کی نوعیت مثل خانگی جائداد کے ہے یا یہ کہ اس کی شکل ایک ایسے وظیفہ کی ہے جو حکومت کی جانب سے کسی خاص جائداد یا ملک کے صلہ میں جاری کیا گیا ہے تو ایسی صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ اس قسم کا وظیفہ مثل خانگی جائداد کے وراثتہً چلتا رہے اسی نوع کے وظائف کی مثال کے طور پر اودھ کے مقررہ وثیقہ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس قسم کے وظائف کی اہمیت کو جتانے کے لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ احیاناً اگر کسی وقت کوئی ایسا وظیفہ کسی خاص وجہ کی بنا پر روک دیا جاتا تھا اور بالخصوص ایسی صورت میں جب کوئی اس کا حقیقی وارث موجود نہیں ہوتا تھا وہ وظیفہ چاہے عرصہ دراز کے بعد ہی کیوں نہ ہو اگر کوئی واقعی دعویدار پیدا ہوتا جس کے دعوے میں صداقت ہو تو بعد تحقیق پھر سے وہ وظیفہ اس خاندان کے فرد کے نام جاری کر دیا جاتا۔ جیسا کہ اناگندی کے راجہ اور زمیندار کا واقعہ پیش آیا۔

اگرچہ حکومت نے خاندان کرنول کے نام جو وظائف جاری کئے ان کو خیراتی وظائف کے نام سے موسوم کیا حالانکہ ان کے اس دعوے میں مطلق صداقت نہیں۔ اس لئے کہ کرنول کی ریاست نواب سے چھینی جا کر حکومتِ ہند سے ملحق کر لی گئی تھی۔ اور اس کے الحاق یا چھن جانے کے اسباب جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے حکومت ہند کے بعض موہوم خیالات اور بے معنی شبہات پر مبنی تھے اور یہ ایک ایسی صریح غلطی تھی جس کو حکومت ہند کے مقرر کردہ کمیشن نے اپنی تحقیقات کے بعد ہی ثابت کر دیا تھا، اس اعتبار سے کرنول کی ریاست ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نہ کسی عہد شکنی کی بناء پر اور نہ نواب کے کسی ناجائز فعل کی بناء پر ضبط کر لی گئی تھی، یہ الفاظ ہمارے نہیں بلکہ اس کمیشن کے ہیں جس کو حکومت ہند نے والیٔ کرنول کے ذاتی اخلاق و عادات کردار اور اس کے افعال قبیحہ کی تحقیق اور صداقت کے لئے مقرر کیا تھا اور نہ کسی فوجی مسئلہ کی بنا پر جیسا کہ ذیل کے بعض اقتباسات سے ظاہر ہو جائے گا۔

منجانب مارکوئس آف ولزلی بنام محمد الف خاں
مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۰۲ء

"نگہداشت صرف ارکان خاندان تک محدود رہے گی۔ اور آپ کی جاگیر حسب ذیل شرائط کے تحت کبھی بلاوارث کے نہ رہے گی۔

(۱) غیر قانونی قتل و غارت کی روک تھام ہونی چاہئیے۔
(۲) اقساط باضابطہ طور پر ادا ہونی چاہئیں۔
(۳) رعایا ہمیشہ مطمئن اور خوش و خرم رہے۔

اگر آپ مذکورہ بالا شرائط کی پابندی کا اقرار کریں تو آپ اپنی جاگیر کے مطلق العنان مالک رہیں گے"

من جانب معتمد حکومت ہند بنام کمشنران کرنول
مورخہ ۵ اکتوبر ۱۸۳۹ء عـ۴۳۷

"حکومت اس امر کے باور کرنے پر مجبور ہے کہ وہ وثیقہ معہ خط مورخہ ۲۵ اگست جو منصرم ریزیڈنٹ حیدرآباد کی طرف سے پیش ہوا ہے دراصل نواب کرنول کا لکھا ہوا نہیں ہے۔"

منجانب کمشنران کرنول بنام چیف سیکرٹری
حکومت ہند عـ۳۵ مورخہ ۷ اکتوبر ۱۸۳۹ء

"ہماری فوجیں ممکنہ عجلت کے ساتھ مسلح ہو کر قلعہ میں داخل ہوگئیں اور تقریباً سات بجے تک بلا کسی تکلیف اور مداخلت کے پورے قلعہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔"

منجانب مسٹر بیلی بنام چیف سیکرٹری حکومت ہند

ع۲۳۶ مورخہ ۲۲ نومبر ۱۸۴۲ء

"یہ بات اب تک واضح طور پر سمجھ میں نہ آسکی کہ آیا قلعہ کرنول میں جو بھی نئی عمارتیں تعمیر ہوں گی وہ سب کی سب حکومت کی ملک کہلائیں گی یا کیا؟ میں اپنے تئیں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ان عمارتوں کو حکومت سے کوئی تعلق ہی نہیں، اس لئے کہ قلعہ مذکور کا کوئی فوجی محاصرہ تو ہوا نہیں تھا بلکہ بغیر کسی مزاحمت کے ہم نے اس پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔"

لہٰذا ایسی صورت میں جب کہ ریاست کرنول کا الحاق کرناٹک یا اور کسی ریاست کے الحاق کی طرح نہیں تھا تو پھر اس خاندان کے پسماندوں کے نام جو وظائف جاری کئے گئے تھے ان کو خیراتی وظائف کے نام سے کس طرح موسوم کیا جا سکتا ہے۔"

اناگندی کی مثال سے واضح ہو جاتا ہے کہ کرنول کے وظائف کس طرح سے "وظائف صلہ" کہلا سکتے ہیں۔ اناگندی کے راجہ کے آبا و اجداد جنوبی ہند میں ایک نہایت ہی وسیع رقبہ کے مالک تھے۔

اس خاندان کے راجاؤں میں سے ایک راجہ نے علاقہ مدراس کی سرزمین اسی طرح بلا کسی شرط کے انگریزوں کے حوالہ کی تھی جس طرح داؤد خاں اول نے علاقہ مدراس کے اطراف و اکناف کے پانچ پرگنے اس قوم کے حوالے کئے تھے، یہ پورا علاقہ میرے بیانوں کے صفحہ ۱۸ پر وضاحت کے ساتھ بتا دیا گیا ہے۔ ۱۶۴۶ء میں مسلمانوں نے راجہ کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اس لئے راجہ کو وہاں سے بھاگنا پڑا اور وہ علاقہ میسور کے مقام اناگندی میں مستقل طور پر سکونت گزیں ہو گیا۔ اس وقت یہ علاقہ ٹیپو سلطان کی سلطنت میں داخل تھا، لیکن ۱۷۹۲ء میں سرنگاپٹم کی صلح کے بعد یہ علاقہ نظام کے قبضہ میں آ گیا تھا۔ اس کے بعد مرہٹوں کے ہاتھ میں چلا گیا، بعد ازاں پھر سے ایک دفعہ کرنول اور ساوانور کے ساتھ حضور نظام کی حکمرانی میں داخل ہو گیا، مگر حکومت نظام کی جانب سے ان دونوں ریاستوں میں سے صرف حکومت کرنول کو شاہی اختیارات عطا کئے گئے تھے اور اناگندی کے راجہ کو حکومت نظام کی طرف سے "وظیفہ صلہ" دیا جاتا تھا۔ جب ۱۸۰۰ء میں یہ تمام علاقے یا اضلاع انگریزی اقتدار کے تحت ہو گئے تو بھی اناگندی کے راجہ کو اس قسم کا وظیفہ عرصہ دراز تک ملتا رہا۔ اس کے بعد زمانہ کی الٹ پھیر کے باعث اناگندی کے خاندان پر کچھ عرصہ تک گمنامی طاری ہو گئی اور وظیفہ وغیرہ بند ہو گیا۔ لیکن پھر کچھ مدت سے جب اس کی وراثت کا از سر نو تصفیہ ہو گیا تو حکومت ہند نے اناگندی کے حقیقی خاندان کے سرگروہ کے نام ماہوار پانچسو روپیہ کا وظیفہ جاری کر دیا ہے جو نسلاً بعد نسلاً جاری رہے گا۔

بلاشبہ یہ امر قابلِ رحم ہے کہ ہم خاندان کرنول کے پسماندوں کو ایسی بُری حالت میں دیکھیں اور خصوصاً ایسی صورت میں جب ہم نوابان کرناٹک اور راجگان اناگندی کے ورثا کے ساتھ ان کی عافیت اور شان و شوکت کا مقابلہ کرتے ہیں۔

عمدۃ الامراء کے وارث کے ساتھ ہر قسم کا آرام اور سہولت روا رکھی گئی اور اس کو شہزادہ ارکاٹ کے خطاب سے بھی سرفراز فرمایا گیا، دوسری طرف اناگندی کے راجہ کے وارث کے وظیفہ کی ایک معقول رقم جاری کرنے کے علاوہ وہ ہر طرح کی ممکنہ رعائتیں ملحوظ رکھی گئیں اور ان دونوں خاندانوں کے ساتھ یہ سلوک ایسا ہے کہ آئندہ ان کے ورثا بھی اس قسم کی مراعات سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ لیکن سخت افسوس کا مقام ہے کہ حکومت کرنول کا حقیقی وارث اور خاندان کرنول کے چشم و چراغ کے نام ایک معمولی رقم کا وظیفہ دیا جاتا ہے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ یہ وظیفہ موروثی نہ ہوگا۔ شاید یہ اس بات کا سلوک تھا کہ کرنول کے آخری نواب نے برطانوی تاج کے ساتھ کبھی غداری نہیں کی۔ بلکہ وہ اس کے بدلے میں ہمیشہ وفاداری اور اطاعت گزاری کا ثبوت دیتا رہا

مذکورہ بالا حقائق کے اظہار کے بعد صریح طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ نواب غلام رسول خاں کو برطانیہ حکومت سے کوئی پرخاش نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت برطانیہ کے مقرر کئے ہوئے کمیشن نے نواب موصوف کو ان تمام جھوٹے الزاموں سے بری کر دیا جو نواب کے متعلق زبردستی گھڑے گئے تھے، کمیشن نے اپنی تحقیقات کے بعد یہ ثابت کر دیا کہ نواب کے دل میں کوئی ایسا ارادہ نہیں تھا جس سے انگریزی حکومت کے مفاد کو ٹھیس لگے اور اس کمیشن نے اس الزام کو بھی جھٹلا دیا تھا کہ نواب نے بارود گولی کا ایک بھاری خزانہ چھپا رکھا ہے جیسا کہ پیشتر بھی بیان کیا گیا" اوّل تو نواب نے اسلحہ یا بارود گولی کا ذخیرہ چھپایا نہیں تھا۔ کچھ

نکلی ضرور لیکن وہ بارود اس قدر ناقص تھی کہ جلانے سے بھی نہ جل سکی۔ لہذا ایسی اشیاء کا برآمد ہونا نہ ہونا مساوی ٹھہرا۔ کمیشن نے اپنی تحقیقات کے بعد یہ ثابت کر دیا تھا کہ نواب کو شروع سے اسلحہ بارود گولی کی فراہمی کا شوق تھا اور اس کے خزانوں سے جو بھی ذخیرہ نکلا وہ سب پچھلے زمانے کی یادگار تھی نہ کہ حالیہ فراہم شدہ ذخیرہ جو کسی خاص مقصد کے تحت جمع کیا گیا تھا۔ کرنول کی بھی ایک حکومت تھی۔ اس حکومت کی بے قاعدہ ہی سہی فوج تو ضرور تھی، جہاں فوج ہو وہاں اسلحہ اور بارود گولی کا ہونا ضروری ہے، اس کے علاوہ نواب مرحوم کو آتش بازی کے کھیل تماشوں کا بھی بہت شوق تھا، یہی وجہ تھی کہ فوج کی سالانہ ضرورت سے کچھ زیادہ مقدار بارود کی تھی جو نام نہاد پوشیدہ خزانوں سے برآمد ہوئی۔ نواب کو جب کبھی کسی چیز کے جمع کرنے کا خیال پیدا ہو جاتا تھا وہ ترقی کرتے کرتے جنون کی حد تک پہنچ جاتا تھا اور حق یہ ہے کہ نواب بذات خود مجنون یا خیالی آدمی واقع ہوا تھا جس کا ثبوت پیشتر کے چند مذکورہ واقعات سے ملتا ہے کہ چند روز تک وہ ایک ایسے غیر محفوظ مقام پر سکونت گزیں تھا جو بارود کے خزانوں سے گھرا ہوا تھا اس کے جنون کا دوسرا صریح ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی اس کی فوج کے سپاہی خود اس سے اپنی تنخواہوں کا مطالبہ کرتے تو وہ ان کو یہ کہتے ہوئے گھاس دلواتا کہ لو یہ بھی تو پیٹ بھرنے کی چیز ہے لہذا ایک ایسے شخص کے متعلق سوائے مجنوں کے اور کیا رائے قائم کی جا سکتی ہے اس کے دیوانہ پن کو تسلیم کرتے ہوئے ہم اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ امور مملکت کے سنبھالنے کے لئے بالکل ہی ناقابل تھا، لیکن اس ناقابلیت کے تسلیم کرنے سے یہ بات تو ہرگز عائد نہیں ہوتی، کہ نواب مذکور ایک بدطینت، بدفطرت، لڑاکو اور سازشی فطرت کا انسان تھا اور ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس کے خیالات اور ارادے فاسد تھے یا وہ حکومت کے خلاف اپنے سر میں سودا لیکا رہا تھا یہ یاد رہے کہ نواب کو بُری باتوں سے اور الزاموں سے بَری کرنے کے لئے ہم کوئی بے جا کوشش نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ چیز خود حکومت برطانیہ کے مقرر کئے ہوئے کمیشن نے ثابت کر دی ہے کہ نواب بالکل ایک سادہ لوح انسان تھا۔ جس کے دل میں کسی قسم کا کینہ کپٹ نہ تھا اور حکومت کے متعلق اس کے خیالات نہایت ہی اچھے تھے، کمیشن کا یہ بیان اس بات کی دلیل ہے کہ نواب کے بُرے

اخلاق یا سازشی کردار کو ثابت کرنے کے لئے کمیشن کو کوئی مواد نہیں مل سکا ورنہ کمیشن نواب کو مجرم اور ملزم ثابت کر دیتا۔ رہی یہ بات کہ ملک میں جو گڑبڑ فساد یا دوسرے معنی میں بغاوت پھیلی تھی اس سے نواب کو کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بغاوت اس کے ملک میں پھیلی تھی جس کو فرو کرنا اس کا کام تھا، لیکن ہم نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ اس کی دماغی کمزوری نے اس کو امور سلطنت کے سنبھالنے سے بالکل ناقابل کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ دوسری خرابی یہ تھی کہ نواب کی فوج بے قاعدہ اس قابل نہ تھی کہ ان باغیوں کا مقابلہ کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی فوج کے بعض سردار خود بغاوت کے علم بردار تھے۔ اس لحاظ سے بغاوت برپا کرنے یا کرانے کے چند الزامات نواب کی ذات پر عاید کئے گئے تھے، مگر سرداروں کے کرتوتوں کو بادشاہ کے سر تھوپنا کس حد تک درست ہے؟ لوگوں کا کہنا تو یہ تھا کہ نواب کے ذہن میں یہ وہم و گمان تک نہ تھا کہ اس کی رعایا ایسی حرکت کر بیٹھے گی، یہ درست ہے کہ فتنہ برپا ہونے کے بعد فرو کرنا ایک رئیس پر ضروری ہو جاتا ہے، لیکن نواب کی دماغی کمزوری اور فوج کی بدنظمی نے باغیوں سے مقابلہ کی اجازت نہ دی نواب کی اس کمزوری اور مجبوری کو اس کی شرارت پر محمول کیا گیا اور حکومت نے یہ سمجھا کہ نواب اس طرح سے برطانوی تاج کو پریشان کرنا چاہتا ہے حالانکہ یہ امر بالکل خلاف واقعہ ہے، اس لئے کہ نواب کے آباؤ اجداد اور انگریزوں کے تعلقات نہایت دوستانہ اور مخلصانہ تھے۔ لہذا اس روایت کو قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ کرنول کا آخری نواب بھی ویسے ہی تعلقات برقرار رکھتا، اس نے دوستی کی رسم کو نہ صرف جاری رکھنے کی کوشش کی بلکہ اپنے تعلقات کو مستحکم اور استوار بنانے کی انتہائی سعی کی، حتٰے کہ اپنے جنون کے دور میں بھی جب کہ حکومت نے تحقیقات کے لئے کرنول کو ایک کمیشن روانہ کیا۔ اس وقت بھی نواب نے انگریزوں سے اپنی سچی وفاداری و دوستی کا ثبوت دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمیشن نے بلا کسی مخالفت کے کرنول کی ریاست کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس کی سلطنت کا الحاق صرف اسی وقت منصفانہ تصور ہوتا جب کہ نواب اور اس کی آل اولاد کے نام اس کی ملک کے صلہ میں وظائف جاری کر دئے جاتے، اس لئے کہ کرنول کو لڑ جھگڑ کر فتح تو نہیں کیا گیا تھا، ہاں اگر ایسی کوئی شکل ہوتی تو حکومت کا رعایتی یا خیراتی وظائف جاری کرنا بالکل واجبی ہوتا۔ اگر حکومت برطانیہ کا اصلی مقصد صرف یہ تھا کہ ریاست کرنول کی خرابیوں کو دور کر کے ملک کے نظم و نسق کی اصلاح

"شب گردی"

رات کے وقت کسی دُور کی آبادی سے
جس میں رہتی ہے تمنّا مری اُس وادی سے

کوئی دیتا ہے بڑے پیار سے آواز مجھے
گدگداتی ہے مری طاقتِ پرواز مجھے

سحرِ شیرینئِ آواز میں کھو جاتا ہوں
نیند آجاتی ہے، مدہوش سا ہو جاتا ہوں

نیند اک اَور ہی سنسار میں لے جاتی ہے
لہلہاتے ہوئے گلزار میں لے جاتی ہے

جس جگہ میں نہ حوادث، نہ زمانہ ہے جہاں
شورشِ گردشِ ایّام فسانہ ہے جہاں

خاکداں کے غم و آلام سے آزاد ہے جو
رُوح افروز ہے جو، دلکش و آباد ہے جو

اپنی تقدیر خود انسان بناتا ہے جہاں
حُسن بھی عشق کو مہمان بناتا ہے جہاں

عشرتِ رُوح کی منزل کے نشاں اَور بھی ہیں
اہلِ عرفاں کے لئے کتنے جہاں اَور بھی ہیں

شب کو جس وقت مرے جسم کو نیند آتی ہے
رُوح چپکے سے کسی سمت نکل جاتی ہے

عدمؔ

بیوی کا جواب

میرا "فوجی شوہر کا خط" اکتوبر کے شاہکار میں شائع ہوا تھا۔ میرے محترم دوست پروفیسر پارٹسن (بمبئی) نے اُسے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے متعلق مجھ سے اجازت طلب فرمائی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ابھی تک اُنہیں کوئی جواب نہ دے سکا، اس کی وجہ "ادیبانہ" یا "شاعرانہ" تساہل نہیں تھا، بلکہ میرا خیال تھا کہ ان کے ایماء کے مطابق "فوجی شوہر کی بیوی" کا جواب بھی لکھ لوں۔

اس جواب میں مجھے افسوس ہے کہ میں ان کے مشورہ پر عمل نہیں کر سکا کیونکہ میرے نزدیک اگرچہ ایک "کامیاب" شاعر اور ادیب کا تخیل ہمہ گیر اور تمام زمانوں کے لئے ہوتا ہے، مگر اس کا مطلب آوارگی نہیں ہوتا۔ ایک ادیب یا شاعر سے یہ امید کبھی نہیں کی جا سکتی، کہ وہ دنیا کی ہر مخالف اور موافق چیز پہ ایمان لا کر بھول بھلیوں میں پھنستا چلا جائے اور اس طرح تمام زندگی میں اپنا کوئی مستقل نظریہ قائم کرنے کے قابل نہ ہو سکے۔ بلکہ اس کا ایک خاص پیغام ہوتا ہے، جس کی تبلیغ میں وہ اپنی تمام زندگی ختم کر دیتا ہے، البتہ اس کے خیالات اور نظریے اسقدر وسیع، طرزِ اظہار اسقدر بلند اور حسین ہوتا ہے، کہ وہ تمام قوموں کے حسبِ حال اور تمام زمانوں پر یکساں مطابق ہو سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ مسٹر موصوف میرے اس نظریہ پر اپنے مشورے کو پرکھیں گے اور اس "بیوی کے جواب" میں بھی میری تقریباً انہی خیالات کی تبلیغ کو حق بجانب قرار دیں گے۔ (امین حزیں)

فرخ آباد
۸ ستمبر ۱۹۱۴ء

میرے پیارے سرتاج!

آپ کا خط ملا، میں خوش ہوں کہ اپنے.... آخری لمحات میں آپ مجھ سے اس طرح مخاطب ہوئے، جیسے میں آپ کی ڈوبتی اور ڈگمگاتی ہوئی زندگی میں ایک آخری سہارا ہوں!

میں نے آپ کے خط سے آپ کے دل و دماغ کی کیفیت کا بخوبی اندازہ کر لیا ہے..... مگر سکندر! آپ کے خط نے مجھے ڈھارس اور تسلی دینے کی بجائے اور زیادہ بیقرار کر دیا ہے... اگر آپ کا خط نہ آتا، تو مجبور سمجھ کہ آپ کی حیات کی امید ہیں، آپ کی خاموشی کو صرف آپ کی بے اعتنائی کا نتیجہ سمجھ کر زبان پر چند شکوہ اور شکایت کے الفاظ لا کر ہی مطمئن ہو جاتی اور اسی طرح اپنے اندر آپ کے ملنے کی آرزو اور امید کی مشعل روشن کئے، اپنی آخری منزل کو پہنچ جاتی،... مگر آہ! آپ کے خط کے ہر ایک لفظ سے "موت کا دیو" اپنے خونی اور مکروہ دانتوں سے میری تنہائی کے پُرسکون لمحات نوچ رہا ہے، میری امید اور محبت کی روشن دُنیا میں زہر اور آگ میں بجھے ہوئے تیر پھینک رہا ہے، میری نافرمان تقدیر پر اپنی تمام تاریک مسرتوں اور استکراہانہ قہقہوں سے رقص کر رہا ہے۔

سکندر! آپ جانتے ہیں کہ جس دن سے ہماری محبت کی بنیادیں تعمیر ہوئی ہیں، جس دن سے ہم نے ایک دوسرے کی آگ میں سُلگنا سیکھا ہے میری حیات آپ کی زندگی کا محض ایک سایہ بن کر رہ گئی ہے، تقدیر اور خدا کے گہرے رازوں نے ـــ جس کی تشریح نجومیوں کو مبارک ہو ـــ مجھے آپ کا ایک اہم جزو بنا دیا ہے اور میری ہستی آپ کی ہستی میں گم ہو کر رہ گئی ہے، اس لئے میں اپنی اذیت یا مسرت سے، آپ کی مصیبت یا کامرانی کا بخوبی اندازہ کر سکتی ہوں۔

اکثر اوقات، آپ کی غیر حاضری میں، جب میری روح ایک آزاد پرندے کی طرح فضا کی بلندیوں میں رقص کرنا چاہتی ہے، تو میں ایک ایسی آسمانی خوشی محسوس کرتی ہوں، جیسے کوئی آسمانی فرشتہ مجھے بتا رہا ہے کہ سکندر نے کسی اہم مہم میں کامیابی حاصل کی ہے..... لیکن آج میری روح پر ایک بوجھ ہے، ایک اندوہ ہے، خشک زندگی کے زرد پتے کھڑکھڑا کر میری رُوح کی نیند میں خلل پیدا کر رہے ہیں، میں چاہتی ہوں کہ آج جی بھر کے روؤں،... آہ! مجھے یقین ہو رہا ہے کہ میری آرزوؤں اور امیدوں کے رنگین نغموں پر، جن کی میں نے آج تک اپنے پہلو میں زندگی کے خون سے پرورش کی ہے ایک خاموشی ـــ تاریک اور ہیبتناک خاموشی ـــ مسلط ہونے والی ہے، مجھے خوف ہے کہ آپ اسے ایک

ایسا ہوگا کیونکہ جیسے آپ کو معلوم ہے، میں نے کبھی آپ کی جوانمردی اور عزم کی پاکیزگی کو شبہ کی نظروں سے نہیں دیکھا، لیکن میں پوچھتی ہوں کہ صرف موت کا خوف نہ کھانے پر ہی مردانگی کا انحصار ہے اور کیا تباہیوں کو خود دعوت دینے، نامرادیوں کے تاریک غاروں میں کودنے اور اپنے سینے کو سنگینوں سے چھلنی کروانے کے بغیر جرأت اور ہمت کا دُنیا میں نام ہی باقی نہیں رہ جاتا؟

سکندر! کاش!! تم میرے لئے نہیں، اپنے لئے سوچتے!

آپ نے لکھا ہے کہ "محبت کے دروازے اس دُنیا میں بند تھے۔"

کیا آپ ان دروازوں کی بندش کا الزام بھی حسب عادت تقدیر پر باندھنا چاہتے ہیں؟ ذرا سوچیں! محبت کی دُنیا میں ناکام و نامراد واپس جانے کے آپ خود کس حد تک ذمہ دار ہیں؟ زندگی مانا ہر دم ہمارے سامنے نئے مراحل پیش کرتی ہے، مگر ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے اور ان کا مناسب حل دریافت کر کے اپنا آزادانہ فیصلہ مرتب کرنے کا حق تو تقدیر ہم سے نہیں چھین سکتی!...... میں پوچھتی ہوں، کیا آپ نے کبھی ان پر غور کر کے ان پریشان کن گتھیوں کو سلجھانے کی بھی کوشش کی؟ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ یہاں سے جانے سے پیشتر ان تمام ضروری نتائج" پر غور فرما لیتے تو مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا،...

آہ! آپ نے غور بھی کیا تو اس وقت جب اس کا نتیجہ پریشان کن ہوا! سوچا تو اس وقت جب اس کے مطابق کوئی فیصلہ مرتب کرنا بے معنی ہوا!

مجھے یقین ہے کہ میرے اس خط کے لکھتے وقت آپ اپنے دشمن پر زور شور سے حملہ آور ہو رہے ہوں گے اور اپنی طاقت اور جوانی کا بہترین مظاہرہ کر رہے ہوں گے اور اگر فتح آپ کی قسمت میں شاید لکھی ہوگی، تو واپس آ کر میرا خط بھی پڑھ سکیں گے، ورنہ انسانی تقدیر اور مذہبی واقعات کی مناسبت پر کون یقین رکھتا ہے؟

میں انسان کی اس فتح اور قسمت کے "میلان" پر اکثر سوچا کرتی ہوں اور حیران ہوتی ہوں کہ جب ہم کسی مصیبت سے بچ نکلتے ہیں، تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، قدرت اور قسمت کو سراہتے ہیں کہ انہی کی برکت سے ہم نے نجات حاصل کی! لیکن اس وقت جب ہم زور شور سے اپنی مہمات کی تیاریوں میں مصروف ہوتے ہیں، جب ہم ان تباہیوں کے منہ میں جا رہے ہوتے ہیں ان نامرادیوں کے دروازوں پر دستک دینے چلتے ہیں، اُس وقت خدا اور تقدیر کہاں جاتی ہے؟ کیا ہم یہ یقین کر لیتے ہیں کہ ہمارے عزائم اتنے مضبوط اور ہمتیں اتنی کڑی ہیں کہ تقدیر اپنے تمام زور کے باوجود بھی انہیں نہیں توڑ سکتی! اور خدا اپنی تمام طاقتوں کے باوجود بھی ہمیں اپنے عزائم سے باز نہیں رکھ سکتا؟....

ہم کس یقین اور کن امیدوں سے ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں؟ لیکن جب ان ارادوں اور امیدوں کے خواب پراگندہ ہو کر ہمیں اپنے عزائم کی کمزوری اور کوششوں کی ناتوانی کا یقین دلا دیتے ہیں، تو کس منہ سے کہتے ہیں "خدایا! تیرا ہزار بار شکر!" "خدایا! جیسے تیری رضا!"

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم صرف تقدیر پر تمام و کمال اپنی زندگی کی حرکات کو چھوڑ دیں، تو زندگی کے لئے ناکامیوں اور نامرادیوں کے طوفان بہت کم تباہی خیز اور بلائیں بہت کم خوفناک ہو سکتی ہیں....

سکندر! میں نے آج ایک بچہ کو دیکھا جو گلیوں میں کاغذی کھلونے بیچ رہا تھا، میں سوچنے لگی کیا اس بچے کے لئے ان کھلونوں میں کوئی دلچسپی نہیں؟ کیا اس کے معصوم دل سے وہ حسیات فنا ہو چکی ہیں، جو اسے کھلونوں اور کھیل کی طرف مائل کر سکتی ہیں؟ وہ انہیں کیوں بیچ رہا ہے؟! کیا زندگی ابھی سے اس کے لئے ایک خوفناک جنگ ہے؟ اس کے کپڑے بوسیدہ ہیں! وہ اس اگست کی گرمی اور دھوپ میں بھی پاؤں اور سر سے ننگا ہے! کیا اپنے معصوم پیٹ کو پالنے کے لئے اسے اپنے کھلونے تک بھی نثار کرنے پڑے ہیں؟...... آہ! وہ دوسرے بچوں کی جیبوں کی طرف کس حسرت سے دیکھ رہا ہے اور کس اندوہناک آواز میں پکار رہا ہے:-

"بالناتھ جی! ایک ایک پیسے!"

میں نے اس سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس کا باپ بھی جنگ میں مارا گیا تھا اور اس مقدس اجتماعیت پر قربان ہو گیا تھا۔

آہ کس طرح دنیا کے درندوں نے ایک غریب بالناتھ کو دوسرے بالناتھوں کے لئے اپنی معصوم مسرتوں تک کی قربانی پر مجبور کر دیا ہے؟! ــــــ سکندر! خدا کا شکر ہے۔ ہمارا کوئی بیٹا نہیں تھا!

پیارے سکندر! محبت کا آپ نے کیسا نظریہ پیش کیا ہے؟" کیا آپ مجھ سے یہ امید رکھتے ہیں، کہ میں اپنی محبت کی شاہراہ پر دوسروں کو چلنے کی دعوت دوں؟ کاش! آپ کو معلوم ہو سکتا، کہ یہ بدبخت عورت کی محبت ہے اور وہ بھی شادی شدہ عورت کی! ــــ آہ! مجھے دل اور دنیا، دونوں نے باندھ رکھا ہے! خودکشی میرے لئے حرام ہے، ورنہ...... آہ! یہ اخلاق اور مذہب کی دیواریں بعض اوقات

ہمارے راستوں میں کس طرح حائل ہوتی ہیں! کیا مذہب اور اخلاق کا یہی تقاضا ہے کہ ایک بدقسمت اور برباد ہستی تمام عمر جگر میں ناسور لئے پھرتی رہے، —— جب کہ ان کا علاج بھی اس دنیا میں ختم ہو چکا ہو —— تمام عمر بربادیاں اور ناکامیوں سے روشناس ہوتی رہے مگر موت کا نام نہ لے، خدا کا گلہ بھی نہ کرے —— بدبخت انسان! خدا اور تقدیر دونوں تجھے نرغے رہے ہیں، دونوں تجھے نگلنا چاہتے ہیں، مگر پھر بھی تو مسکرا رہا ہے!؟ —— طوفانی سمندروں میں بلاخیز موجوں میں ایک ٹوٹے ہوئے تختہ پر ہچکولے کھاتے ہوئے، ایک نامعلوم منزل کی طرف بہا جا رہا ہے ..... رقص کرتے ہوئے، مسکراتے ہوئے، نغمے الاپتے ہوئے ..... کبھی اژدہوں اور مگرمچھوں کو دیکھتا ہے تو منہ پھیر لیتا ہے ..... مگر نغمہ بدستور جاری رہتا ہے ..... اور جب آخر کار یہ تختہ کسی لڑھکتے ہوئے برفانی تودے کے ساتھ ٹکرا جاتا ہے، تو پیشانی پر ایک مدھم بےچین بل کے ساتھ بےچین امواج کی آغوش میں سو جاتا ہے —— مسکراتے ہوئے، رقص کرتے ہوئے!

انسان! آہ! تیری فطرت میں وہ کون سی آگ ہے، جو تجھے مسکراتے ہوئے ان تباہیوں کا سامنا کرنے پر مجبور کرتی ہے؟!

پیارے سکندر! میں بھی مسکراتے ہوئے اس مستقبل کے تباہ کن سوگ میں داخل ہو رہی ہوں، میری روح گھٹ رہی ہے، مگر میرے لبوں پر تبسم ہے، —— موت کی حسین آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے، اور میرے چہرے کے ایک ایک بل میں مسرت رقص کر رہی ہے!

میں موت سے خوفزدہ نہیں —— ہر روز جب سورج غروب ہوتا ہے، ہم میں سے سینکڑوں انسانوں کی حیات اور رُوح کو ہمیشہ کے لئے اپنے ہمراہ لے جاتا ہے جس کی لاشوں کا نظارا اور موت کی آواز اس وسیع دنیا میں سوائے چند انسانوں کے اور کسی کو سنائی تک نہیں دیتی! ..... اس لئے مجھے یہ افسوس نہیں کہ آپ زندگی سے بخوشی دست بردار ہو رہے ہیں، بلکہ یہ افسوس ہے کہ آپ اپنی اس مختصر زندگی میں کچھ نہ کر سکے! اور آپ کے تمام رنگین خواب بے تعبیر ثابت ہوئے اور آپ نے اپنے ہمراہ ایک دوسری زندگی بھی برباد کی!

سکندر! اگر مجھے یہ یقین ہو جاتا کہ آپ کا یہ اقدام اور قربانی آپ کو عظمت، عزت اور شہرت کی طرف لے جائے گی، تو میں خوشی سے یہ بیوگی گوارا کر لیتی، مگر مجھے افسوس ہے کہ آپ کا تمام خط پڑھنے کے بعد بھی میں آپ کی قربانی کو "عظیم الشان" نہیں کہہ سکی۔

سکندر! اب میں نہ مرنا چاہتی ہوں اور نہ جینا چاہتی ہوں .... کاش! کوئی تیسرا راستہ ہوتا یا ہو سکتا! —— آہ! زندگی ایک روگ ہے، جس سے نجات حاصل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔

تمہاری سوگوار
نجمہ

امین حزیں (بہاولپور)

ہموطن کے نام

(از کرشن کمار ایم۔ اے)

دستِ بستہ ہیں پہ تابِ امتحاں باقی تو ہے	جسمِ لاغر میں ابھی صیاد! جاں باقی تو ہے
عندلیبانِ چمن! کیوں چپ ہوئی جاتی ہو تم	یادگارِ رنگ و حُسنِ گلستاں باقی تو ہے
رہروِ محوِ تغافل! اُٹھ پشیمانی نہ کر	نقشِ پائے ساربانِ کارواں باقی تو ہے
گردشِ ایام سے گو ہو گئے ہیں خستہ حال	ہندیو! لیکن ابھی نام و نشاں باقی تو ہے

ممتحن

(ناکام طالبعلم کی نگاہ میں)

معزز ناظرین! اس میں شک نہیں کہ نظم زیر نظر کے ابتدائی شعر کا پہلا مصرع بے حد درشت واقع ہوا ہے مگر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ناکام طالبعلم خصوصاً وہ جو اپنی بدخطی کے سلسلہ میں فیل ہو جاتے ہیں ممتحن کی بے پروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے تہذیب سے باہر پہنچ جاتے ہیں۔ کسی دن آپ ناکام طالب علموں کے پیچھے چھپ کر جائیں تو آپ کو اندازہ ہو کہ وہ ہمارے لئے کسقدر عمدہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اب رہا ممتحن صاحبان کی توہین کا پہلو تو یہ اعتراض مجھ پر اس لئے عائد نہیں ہوتا کہ میں خود بھی ممتحن صاحبان کی صف میں موجود ہوں، لیکن طالب علم کی کاوش ذہنی پر محض بدخطی کے صلہ میں پانی پھیرنا میرے نزدیک ایک اخلاقی کمزوری ہے جس کی اصلاح سررشتہ تعلیم پر فرض ہے۔ (شاد عارفی)

دیوِ استبداد۔ بوالہولِ تعدّی، گرگِ ظلم　　احتجاجِ "علمِ کمسن" کو سراسر صُم و بکم

آرزوئے کامیابی کا مخالف سخت گیر　　منزلِ تعلیم کی دشواریوں کا یہ سفیر

چاہتا ہے طالبعلموں سے یہ اپنے سر جواب　　دیکھتا ہے پھول کی پتی میں گلزاروں کے خواب

کاپیاں پڑتا لتا ہے اپنی اُجرت کیلئے　　کام بے پروائی سے لیتا ہے عجلت کیلئے

کوئی بدخط ہو تو گویا اس کا لکھا ہی خراب　　پھینک دیتا ہے اُٹھا کر کاپیاں دستِ عتاب

نفسِ مطلب ہیچ ہے اُلجھی ہوئی تحریر میں　　قید ہوتا ہے "جوابی حسن" اس تقصیر میں

دل میں کہتا ہے کہ بیحد کوئی ناکارا ہے یہ　　چاہین کے حرف ہجا میں خوب جھک مارا ہے یہ

حسنِ مضموں پھونکتا ہے ممتحن کا التہاب　　ہر ورق پر پیٹتا ہے سر جوابِ باصواب

فارغ التحصیل ہوتا ہے رعونت کی خبر
ممتحن کا قلب ہے ہم رشتۂ قلب الحجر

ناکام طالبعلم

(شاعر کی نگاہ میں)

دیکھنا آتا ہے سر ڈالے وہ ناکامِ اُمید
جس نے کھو دی ہے درِ آغازِ عشرت کی کلید

خشک ہونٹوں پر تبسّم ٹھوکریں کھاتا ہوا
پوچھنے والوں کی تلواروں سے کتراتا ہوا

مُمتحن کی سخت گیری کو بُرا کہتا ہوا
پرسۂ احباب کی دلدوزیاں سہتا ہوا

فکر کے آثار پیشانی پہ بل کھائے ہوئے
ضبط کے قبضے میں آنسو آنکھ تک آئے ہوئے

فیل ہو جانے کے ہر پہلو پہ نظریں ڈالتا
علتیں سَو سَو بناتا سَو طرح سے ٹالتا

تیسرے پرچے میں شاید کوئی خامی رہ گئی
رہ گئی لکھنے سے شرحِ نظمِ جامی رہ گئی

یا نظامی کو جو فردوسی سے لکھا تھا بلند
ممتحن کو یہ اوپچ شاید نہ آئی ہو پسند

ہر طرح لاتی ہے "دشواری" پہ "آسانی" دلیل
دل کو سمجھانے کی لیکن کب نکلتی ہے سبیل

مضمحل ہے ناتمامی پر مگر روتا نہیں
بزدلی سے حُسنِ ہمّت کا بھرم کھوتا نہیں

امتحاں میں یہ نظر آئے گا اگلے سال بھی
اپنی قسمت کو بنا ڈالے گا حسبِ حال بھی

شاد عارفی

فریادِ شکستہ

اُٹھی دل سے فغاں دردِ نہاں کی ترجماں ہو کر — زباں پر آ گیا حرفِ شکایت داستاں ہو کر

زمانے کے حوادث نے وہ دل پامال کر ڈالا — جو زیرِ آسماں رہتا حریفِ آسماں ہو کر

سمٹ کر رہ گیا وہ سیلِ نورانی تخیّل کا — جسے بہنا تھا اک دن جوئبارِ کہکشاں ہو کر

فسُردہ ہو گئیں وہ تابشیں رنگیں تصوّر کی — نکھرتیں جو کبھی صبحِ بہارِ جاوداں ہو کر

لگا دی بیدلی نے اُن لبوں پر مُہرِ خاموشی — کبھی کھُلتے جو پُر اسرارِ فطرت کی زباں ہو کر

نظر آئی نہ زیرِ آسماں صورت ٹھکانے کی — ہمیشہ پاؤں کا چکّر رہی گردش زمانے کی

خزاں کے تُند جھونکے کر گئے تاراج گلشن کو — تمنّا ہی رہی غنچے کے دل میں مُسکرانے کی

چمک اُٹھی نگاہِ باغباں برقِ تپاں بن کر — بنا ڈالی نہ تھی مرغِ چمن نے آشیانے کی

اُڑا کر لے گئی بادِ صبا پہنائے صحرا میں — ملی فرصت نہ بُو کو جامۂ گُل میں سمانے کی

زمانے کے مصائب آ پڑے کوہِ گراں ہو کر — کوئی بدبخت کیوں کر تاب لاتا سر اُٹھانے کی

گدائے رہ جہاں میں درخورِ اعزاز کیا ہوتا! — جسے پامال ہونا تھا وہ سر افراز کیا ہوتا!

طلب تھی التفاتِ حسن کو اہلِ امارت کی — تہی داماں سزاوارِ نگاہِ ناز کیا ہوتا!

ہوئی عنقا دلِ بے دست و پا کی خوئے شہبازی — یہ مرغِ پر بُریدہ آسماں پرواز کیا ہوتا!

حصولِ مدعا پر منحصر تھی نغمہ پیرائی ۔۔۔ اسیرِ دام ناکامی نوا پرداز کیا ہوتا!
ہوئی پیدا نہ صیادی کبھی مرغِ پرافشاں میں ۔۔۔ جو خود بسمل تماشا تھا وہ تیر انداز کیا ہوتا!

تپش ناآشنا حالِ دلِ بیتاب کیا جانے! ۔۔۔ لبِ ساحل حدیثِ شورشِ گرداب کیا جانے!
جہاں میں زندہ جلنا کام ہے پروانہ کیشوں کا ۔۔۔ بہ رسمِ جانگدازی کرمکِ شب تاب کیا جانے!
کوئی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا سے باخبر کیوں ہو؟ ۔۔۔ شکستہ ساز کی فریاد کو مضراب کیا جانے!
نگاہِ عیب بیں جوہر سے واقف ہو نہیں سکتی ۔۔۔ خزف چیں آب و تابِ گوہرِ نایاب کیا جانے!

ہر اِک آنسو میں دردِ زندگی کا راز مخفی ہے
کوئی ناداں رموزِ دیدۂ پُرآب کیا جانے!

بیدار

رباعیات

طوفانِ بہار

طوفانِ بہار ہوا دامانِ بہار
دامانِ گلستاں میں طوفانِ بہار
اللہ اللہ جوشِ فضائے عالم
میخانہ بدوش ہے گلستانِ بہار
پیمانہ بکف سیاہ مستانِ بہار

اعلانِ بہار

رشکِ گلشن بنا ہے دامانِ بہار
کرتی ہیں سیہ گھٹائیں اعلانِ بہار
بادل کی گرج صلائے مے نوشی ہے
پھر جھوم رہے ہیں بادہ نوشانِ بہار

یزدانی جالندھری

مختصرات

کابینۂ وزارت پنجاب کا برشگالی دورہ

گذشتہ مہینے حکومت پنجاب کے کابینۂ وزارت نے پنجاب کے بہت سے اضلاع کا دورہ کیا۔ ہر جگہ بے امتیاز مذہب و ملت صوبے کی تمام جماعات و افراد نے جماعتی اور انفرادی حیثیت سے وزراء کا شاہانہ استقبال کیا۔ اہل پنجاب کے اس متحدہ استقبال سے ہر منصف مزاج انسان یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ پنجابیوں کو اپنی وزارت پر پورا اعتماد ہے۔

تمام وزرا دورے کی بیشمار مصروفیتوں کے سبب تھک کر چور ہو چکے ہیں کیوں کہ مقامی وفود کی عرضداشتیں سننے افراد کے ہجوم سے ملاقاتیں کرنے اور ہر جگہ کے ادارات کے معائنوں کے سبب انہیں آرام کا مطلق موقعہ نہیں ملا۔

ہر وزیر نے پبلک کی خدمت کو اپنے ذاتی آرام پر ترجیح دی۔

وزرا کی صلح کل آشتی جو ہمدردانہ ملاقاتوں اور تقریروں نے پبلک کو یقین دلا دیا کہ اس وقت پنجاب پر ہماری حکومت ہے بیرونی لوگ ہم پر مسلط نہیں ہیں۔ وزیراعظم کی کوٹھی پر ملاقاتی وفود اور اشخاص کا ہجوم آٹھ پہر رہتا تھا۔

انہیں اپنی مصروفیتوں کے سبب کبھی وقت پر کھانا نصیب نہیں ہوا وزراء کے سیکرٹریوں کو بھی مصروفیات کے اژدحام میں سر و پا کی خبر نہ تھی۔

وزیراعظم اور وزیر تعلیم کی تقریروں نے موجودہ حکومت سے اختلاف رکھنے والی جماعتوں کو بھی اپنی مخلصانہ خدمت اور درد آشنا طرز عمل کا معترف بنا لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کابینۂ وزارت کے اس دورے نے پنجاب کے آباد جغرافیے میں زندگی اور مسرت کی لہر پیدا کر دی ہے۔

پنجاب کے فرقہ پرست اخبارات کو انتباہ

وزیراعظم اور نواب دولتانہ نے اپنے اعلانوں میں پنجاب کے فرقہ پرست پریس کی فتنہ آفرینوں کے پیش نظر انہیں دوسری بار تنبیہ کی ہے۔ اسی کے ساتھ اُن اخبارات کا شکریہ بھی ادا کیا ہے جو فرقہ پرستانہ جذبات سے بالاتر رہ کر صوبے کی خدمت کر رہے ہیں۔

ہمیں ہر دو اعلانوں کے اس آخری حصے سے حیرت ہوئی ہے کیوں کہ ہمارے خیال میں پنجاب کے اخبارات میں ایسا کوئی بھی اخبار نہیں جو فرقہ پرستی کی لعنت سے پاک ہو خاص طور پر اُردو، ہندی اور گورمکھی کے اخبارات نے تو اخبار نویسی کی مقدس روایات کو ذلیل کر دیا ہے۔

ہندو مسلمانوں کی معمولی معمولی مقامی چپقلشیں کو دہشت انگیز سُرخیوں سے شائع کر کے سارے ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کے دلوں میں نفرت کی تخم ریزی کرنے کی کوشش ان اخبارات کا محبوب مشغلہ بن گیا ہے۔

جب تک یہاں انگریزی حکومت تھی تو کہا جاتا تھا کہ انگریزوں کی شہ پر یہ اخبارات باہمی افتراق کی سعی میں لگے رہتے ہیں اب کہ حکومت کی باگ ڈور خود پنجابیوں کے ہاتھ میں ہے پھر حکومت کا وزیراعظم شروع ہی سے اتحاد پسند واقع ہوا ہے بھلا اس وقت انہیں کون شہ دے رہا ہے؟ کوئی نہیں۔

بات یہ ہے کہ یہاں اخبار نویسی ہر شخص کر سکتا ہے۔ اُسے جرنلزم کی تعلیم حاصل کرنے یا اصول صحافت سے واقف ہونے کی ضرورت ہی نہیں یہاں اخبار نویسی کے لئے سند قابلیت صرف یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو دنیا کے کسی مصرف کا نہ ہو قابلیت میں صفر ہو حکومت کو جا و بیجا بے تکی گالیاں دے سکتا ہو، کچھ دنوں کے لئے جیل کی ہوا بھی کھا چکا ہو بلیک میل کرنے اور لوگوں کی پگڑیاں اچھالنے کی مشق رکھتا ہو۔ انفرادی نزاع کو آل انڈیا فسادات بنانے کے لئے بنیاد کے طور پر استعمال کرنا جانتا ہو، اخبار کی پالیسی دس دس ہیں ہیں روپے لیکر تبدیل کر سکتا ہو مختصر یہ کہ بے اصولی کے اصول پر مضبوطی سے کاربند رہ سکتا ہو بس وہ اخبار نویس ہو سکتا ہے پھر جب معیار اخبار نویسی یہ رہ گیا ہو تو اخبارات سے راست روی کی توقع کہاں تک کی جا سکتی ہے۔ آنریبل چیف منسٹر اخبار نویسوں کو دعوت آشتی و صلح دے دے کر حقیقت انہیں فساد انگیزی کے لئے زیادہ جری بنا رہے ہیں

یہ حضرات اِس عزت کے مستحق ہی نہیں اُن سے جتنی رواداری برتی جائے گی اُسے کمزوری پر محمول کریں گے۔ اُن کی کج راہی کا ایک ہی علاج ہے کہ پہلے پانچ پانچ ہزار کی ضمانت۔ پھر پریس کی ضبطی اس کے بعد یہ آپ درست ہو جائیں گے۔ اور اس سے پہلے اپنے لہجے میں تبدیلی کرنا ان کیلئے دشوار ہے۔ نقد ضمانتوں اور پریس کی ضبطیوں کے بغیر یہ کبھی راست پر نہ آئینگے

کیسے ظلم کی بات ہے کہ یہ نام نہاد اخبار نویس خود تو آپس میں دن رات ملتے ہیں اور جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں دوستی اور مہر و ولا کے انداز میں ملتے ہیں لیکن جماعتوں میں تشتت و افتراق پیدا کر کے انہیں ایک دوسرے کا تشنۂ خون بنائے رکھنے پر مصر ہیں ملک کا امن و امان اُن کی افتراق انگیزی سے زیر و زبر ہے۔

تجارت تباہ ہوئی جاتی ہے عام کاروبار پر برا اثر پڑ رہا ہے ہندو کوچوں میں مسلمان اور مسلم محلوں میں ہندو جاتے ہوئے خوف کھاتے ہیں۔ معصوم عوام کو یہ بھی خبر نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن اور درپئے آزار کیوں بنے ہوئے ہیں ادھر حکومت کی نرم پالیسی کا یہ حال ہے کہ وہ صلح و آشتی کے پامال کرنے والوں ہی سے صلح کوشی کی درخواستیں کرتی ہے۔

ہم آنریبل چیف منسٹر کو یقین دلاتے ہیں کہ اخبار نویس رواداری اور نرم گفتاری کو کمزوری پر محمول کرنے کے عادی ہیں ان کی خوں ریز جرائتیں حکومت کی درخواستوں اور شیریں نصیحتوں سے زیادہ نشو و نما پائیں گی یہ تجربہ بارہا ناکام ثابت ہو چکا ہے اب تو ؎

"و آخر الدواء الکئی"

کے مطابق گھن کی سی ایک چوٹ لگانے کی ضرورت ہے۔ یہ صوبہ فوجی صوبہ ہے یہاں تو "دو من کو سوا من" کے اصول پر کاربند ہونا مفید مقصد ہو سکتا ہے یہ لوگ ضدی بھی نہیں کہ ستیہ گرہ کا اندیشہ ہو کیونکہ اس کیلئے غیرت اور ایثار کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ لوگ غیرت اور ایثار کے مالک ہوتے تو رونا کا ہے کا تھا۔ افتراق انگیزی کی لعنت ہی میں کیوں مبتلا ہوتے۔ یہ ہیں ذاتی مفاد کے پجاری ذرا سی ترغیب مالی یا ترہیب آلی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے میں انہیں تامل نہیں ہوتا مالی ترغیب تو حکومت منظور نہ کریگی اور یہ دیرپا اثر بھی نہیں ہوتی۔ البتہ آلی سرزنش انہیں سیدھا کرنے کے لئے کارگر ہتھیار ثابت ہوگی زبانی فہمائش بہت ہو چکی اب تو عربی شاعر کے اس متجربہ مقولے پر کاربند ہونے کی ضرورت ہے "وفی الشر نجاۃ حین لا ینجیک احسان"

سر چھوٹو رام اور مہاسبھائی اخبارات

ہمارے ایک ادیب دوست جو ملک کے مشہور افسانہ نگار اور خاص طرز کے انشا پرداز ہیں امریکن لٹریچر کا بہت زیادہ مطالعہ کرتے ہیں۔ امریکہ کے خاص خاص رسالے براہِ راست منگاتے ہیں امریکہ کے متعلق اُن کے معلومات اپنے وطن ہندوستان کے معلومات سے زیادہ ہیں امریکی ادبیات کی کثرت مطالعہ کا اثر یہ ہوا ہے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی میں امریکہ کو رہنمائی کا درجہ دینے لگے ہیں۔

اُن کا ہر موضوع گفتگو امریکہ کو اُن کا تکیہ کلام دیکھکر اُن کے ظریف دوستوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ "شیخ صاحب کو امریکہ ہو گیا ہے"

کچھ مدت سے پنجاب کے مہاسبھائی ذہنیت کے اخبار نویسوں کے لئے سر چھوٹو رام کا ذکر بھی ایک وظیفہ صحافت بن رہا ہے۔

کسی تاریخ کے کسی اخبار کو اٹھا لیجئے اُس کے ایڈیٹوریل کالموں کی عبارت سے حروفِ رابطہ نکال دیجئے پھر آپ دیکھیں گے کہ ادارتی صفحات پر صرف یہ رہ جائے گا۔

چھوٹو رام چھوٹو رام، چھوٹو رام، چھوٹو رام، چھوٹو رام

دن رات چھوٹو رام کا تصور کرتے کرتے غالباً مہاسبھائی اخبار نویسوں کو "چھوٹو رام ہو گیا ہے"

ہمارے وہ ادیب دوست تو ایسے ژرف نگر واقع ہوئے ہیں کہ امریکہ کی زندگی کا ہر پہلو انہیں روشن ہی نظر آتا ہے لیکن مہاسبھائی اخبار نویسوں کو سر چھوٹو رام میں کوئی خوبی دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ اُن کی خوبیاں بھی اُن کی بدبیں نگاہوں کو برائیاں نظر آتی ہیں سر چھوٹو رام کے حرکات و سکنات سے ان حضرات کو اس قدر گرویدگی پیدا ہو گئی ہے کہ آپس میں ہر ایڈیٹر سر چھوٹو رام کے متعلق زیادہ سے زیادہ اطلاعات فراہم کرنے میں دوسروں سے بازی لے جانا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں من گھڑت خبریں چھاپنے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔

وہ دورے میں جہاں بھی تشریف لے جاتے ہیں کوئی نام نہاد مقامی کانگریسی ان کی تقریروں کو توڑ مروڑ کے اخبار کو بھیج دیتا ہے ایک آدھ ہفتہ جولانیاں دکھانے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی غریب کے ہر موقع سے مایوس ہو کر کابینۂ وزارت کے غیر اتحادی وزراء کو اُن کے خلاف اکسانے کی کوشش کی جاتی ہے کبھی وزیر اعظم کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ سر چھوٹو رام کے تعاون سے دست بردار ہو جائیں

مختصر یہ ہے کہ مہاسبھائی اخبار نویسوں نے اپنی دماغی بیماری کا نام چھوت رام رکھ لیا ہے۔

آنریبل وزیر تعلیم کا شکریہ

ہم نے آنریبل وزیر تعلیم کی توجہ اسکولوں اور کالجوں کی تعطیلات کے غیر منصفانہ تفاوت کی جانب مبذول کراتے ہوئے عرض کیا تھا کہ اسکولوں کے استادوں کو کالجوں کے اساتذہ کے مقابلے میں تعلیم و تدریس کا کام۔ انتظامی ذمہ داری خصوصاً پرائیویٹ سکولوں میں طلبہ کی فراہمی اُن کے اعزا کی تالیف قلوب فراہمی چندہ وغیرہ کی ذمہ داریاں کئی گنا زیادہ ہوتی ہیں پھر طرہ یہ کہ اُن کی تنخواہیں بہت قلیل موسم گرما کی تعطیلات جسمانی تکان اور دماغی درماندگی دور کرنے کے لئے دی جاتی ہیں غریب سکول ماسٹروں کو صحت کی بحالی اور آرام و سکون کی بہت ضرورت ہے مگر ہوتا یہ ہے کہ اسکولوں کو مشکل سے چھ ہفتے کی تعطیل ملتی ہے اُن کے مقابلے میں کالجوں کے اساتذہ ہیں دو تین پیریڈ پڑھائے اور گھر چلے آئے اُن کے لئے کالج بند ہونے تک کالج میں ٹھہرنا ضروری نہیں آئے دن بات بہانے چھٹیاں ملتی رہتی ہیں۔ پھر تعطیلات کلاں میں انہیں عموماً تین ماہ کی طویل تعطیل میسر آجاتی ہے انہیں معاوضہ خدمت بھی بیش قرار تنخواہوں کی صورت میں مل جاتا ہے۔

یہ تفاوت غیر منصفانہ ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ محکمے کی نگاہ میں اسکولوں کے اساتذہ کی کوئی اہمیت نہیں۔ ضرورت ہے کہ اُن کی تعمیر حال کے پیش نظر اسکولوں کی تعطیلات موسم گرما کو وسعت بخشی جائے۔

ثانوی تعلیم کے اساتذہ کو آنریبل وزیر تعلیم کا سپاس گزار ہونا چاہئے کہ اُن کی توجہ سے پہلی بار امسال تمام سکول موسم گرما کی تعطیلات کیلئے دو ماہ کے واسطے بند ہوئے ہیں۔ مدیر شاہکار بھی آنریبل وزیر کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اُس کی عاجزانہ تجویز کو شرف پذیرائی بخشا گیا۔

سر راس مسعود کا سانحہ وفات

نواب مسعود جنگ بہادر ڈاکٹر سر راس مسعود کا سانحہ وفات ملک کی بدنصیبیوں میں ایک گراں بار اضافہ ثابت ہوگا۔

انہوں نے اپنی ساری زندگی ملک و ملت کی تعلیمی خدمت میں بسر کی علم و ادب، تعلیم و تعلم اُن کی زندگی کے محبوب مشاغل تھے جامعہ عثمانیہ کی قبولیت اور کامیابی میں مرحوم کی مساعی کا بہت بڑا حصہ ہے۔

انہیں کی شخصیت تھی جو مسلم یونیورسٹی کی ناقابل تدارک مشکلات کے ہجوم میں اپنے حسن انتظام اور شبانہ روز خدمات سے یونیورسٹی کو مشکلات سے بچاکر شاہراہ ترقی پر لائی۔

آہ! راس مسعود! تیری قوم کو تیری مخلصانہ خدمات کی سب سے زیادہ ضرورت تھی ایسے نازک وقت میں موت نے تجھے اپنی محبوب ملت سے چھین لیا۔

سید مقبول شاہ مرحوم

سید مقبول شاہ صاحب آئی، ای، ایس ریٹائرڈ کے انتقال کی خبر اس صوبے کے ہر خادم تعلیم کے لئے جاں گزا ثابت ہوگی۔ ایسے شریف، مرنجاں مرنج، پیکر علم و عمل تعلیمی رہنما کی موت کا صدمہ اس سے تعلق رکھنے اور جاننے والوں کے لئے ایک صدمۂ عظیم ہے محکمۂ تعلیم پنجاب میں مرحوم نے زندگی کے بہترین تیس سال نہایت نیک منشی اور نیک نامی سے گزار کر پنشن لی تھی، پنشن لینے کے بعد بھی وہ یونیورسٹی کے فیلو، پنجاب ایڈوائزری بورڈ کے ممبر، انجمن حمایت اسلام کی مجلس انتظامیہ کے ممبر و عہدیدار کی حیثیت میں علم و تعلیم کی خدمت میں برابر لگے ہوئے تھے۔ ہم اس صدمے میں اُنکے محترم فرزند سید یعقوب شاہ سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

آیندہ اکتوبر سے

شاہکار کو اپنے مقررہ بلند معیار تک پہنچانے کی مہم آئندہ اکتوبر یعنی اگلے پرچے سے شروع کرنا چاہتا ہوں۔ اُمید ہے کہ اس کی ظاہری و معنوی خصوصیات میں ارتقا کا آغاز اکتوبر کے پرچے سے نمایاں طور پر نظر آنے لگے گا۔

خدا شاہکار کے اہل قلم اور اہل نظر کو توفیق التفات بخشے اور مجھے صحت و اطمینان بھر مجھے بھی یہ ثابت کرنے کا موقعہ ملیگا کہ

"ابھی تو میں جوان ہوں۔"

اہل قلم سے

شاہکار کے متعلق پہلے عرض کرچکا ہوں کہ چوہدری برکت علی بی۔اے مالک پنجاب ایجنسی پولاہور سے میں نے واپس لے لیا ہے۔ دو جوان مرگ بچوں کے صدمے سے میرا توازن دماغی صحیح نہ رہا تھا۔ اور خطرہ تھا کہ شائد رفتگی حواس میں اور ترقی ہو اس خطرے کے پیش نظر شاہکار اور اُردو مرکز کو اُن

کے سپرد کر دیا تھا مگر انہیں اپنی کاروباری مصروفیتوں نے اتنی اجازت نہ دی کہ شاہکار کو ترقی دیتے بلکہ وہ تو اس کی سپرد کردہ حیثیت کو بھی قائم نہ رکھ سکے۔

میری تحریکات کو محبت کی نظر سے دیکھنے والوں نے اصرار کیا کہ شاہکار اور اردو مرکز کو واپس لے لیا جائے۔ اور میری سخت جانی اس صدمے کو برداشت کر گئی۔ اور خدا نے چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کیلئے میرے دماغ اور حواس کو سکون بخش دیا۔ شاہکار گرتا پڑتا رہا تھا اور اگر چند روز اور اُن کے پاس رہتا تو شاید کچھ دنوں کے بعد وہ اسے بند کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔ ان وجوہ کی بنا پر میں اسے واپس لینے پر مجبور ہو گیا۔

حالات کی ناسازگاری غیر اختتام جاری ہے اب شاہکار اور اردو مرکز کا ان سے کچھ تعلق نہیں رہا۔ اس واپسی میں مجھے دو ہزار روپے کے لگ بھگ نقصان اٹھانا پڑا لیکن بپاس خاطر احباب اس استروں کی مالا کو پھر اپنے گلے میں ڈال لینا پڑا۔ موجودہ حالت میں شاہکار کی گراں بار مشکلات کے نرغے میں گھرا ہوا ہوں۔ مالی امداد کے لئے بفضل ایزدی میں نے کبھی ہاتھ پھیلانا گوارا نہیں کیا۔ اور خدا نے میری زندگی کی خودداری کو اب تک قائم رکھا ہے اور اس سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے آئندہ بھی اس توفیق سے شرف اندوز بنائے کہ میں کسی کی جیب کی جانب نظر نہ اٹھاؤں۔

لیکن شاہکار کے اہل قلم سے درخواست ہے کہ وہ پھر اپنی توجہ کو میرے لئے بیدار کریں اور شاہکار کی قلمی اعانت کے لئے اپنی عزیز مصروفیتوں میں سے کچھ لمحات گرامی وقف کر دیں تاکہ میں اسے اپنے پیش نظر معیار کی سطح تک بلند کر سکوں۔ میری اس درخواست کو رسمیات کے ذیل میں شمار نہ کیا جائے۔ کہ میں رسم پرست نہیں ہوں۔ خدا کے سوا میں نے کسی کی کبھی پرستاری نہیں کی شاہکار کی دفتری مشکلات کے ازالے کی میں سعی کر رہا ہوں اور اس میں میرا بہت سا وقت صرف ہو رہا ہے شاہکار کے محترم قلمی معاونین اگر قلمی اعانت کی جانب متوجہ ہو جائیں تو مجھے اس کے مرحوم امتیازات کو پھر سے زندہ کرنے کا وقت مل سکے گا شاہکار درحقیقت اہل قلم اور اہل ذوق کی ملکیت ہے اور ان کی جانب میں اس کی خدمت کو اپنے ذاتی آرام و سکون کو قربان کر کے انجام دے رہا ہوں تو رحم اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اہل قلم حضرات جو اردو زبان کی ترقی کے تمنائی ہیں اپنے فرض کی ادائیگی سے دریغ نہ فرمائیں۔

محترم خریداروں سے یہ میں نے عہد کر لیا ہے کہ شاہکار کے خریداروں کو کبھی زحمت التفات نہ دوں گا۔ وہ مطمئن رہیں کہ چاہے شاہکار اور اس کی مشکلات میرا کچھ ہی حال نہ بنا دیں میں اُن سے دردآشنا بننے کی درخواست انشاءاللہ نہیں کروں گا۔ اُن کے لئے میرے پہلو میں دل بے مدعا ہے میں کوئی پیشہ ور رسالچی نہیں بننا چاہتا کہ پرچے کے خریدار بڑھانے کیواسطے عاجزانہ بلکہ گدایانہ التجاؤں سے اُن کی جامہ ہمدردی میں گداز پیدا کروں۔

اہل نظر سے

میں محکمہ تعلیم کے ذوق ادب رکھنے والے افسران تعلیم اور حضرات اساتذہ و اہل علم کو اپنے رسالے کے اہل نظر میں شمار کرتا ہوں اور چونکہ تعلیم اور اہل تعلیم کی خدمت اور حمایت کے لئے شاہکار کو میں نے مخصوص کر دیا ہے اس کے علاوہ میں خود بھی تعلیمی لائن میں خدمت تعلیم انجام دے رہا ہوں اس لئے تعلیمات سے تعلق رکھنے والے حضرات کو اپنی برادری خیال کرتا ہوں ان حضرات سے درخواست کی بجائے اصرار کرنے کا مجھے حق حاصل ہے اور اس حق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہتا ہوں اور کہتا رہونگا کہ وہ اپنی توجہات کا پہلا اور سب سے ممتاز حصہ دار شاہکار کو بنائیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا کریں گے انہیں ایسا کرنا چاہیئے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو میرے ساتھ بے انصافی اور قدر ناشناسی کا برتاؤ کریں گے

اردو۔ فارسی اور عربی پڑھانے والے اساتذہ بھی خاص طور پر میری توقعات کا مرجع ہیں۔ میں صحیح معنی میں اُن کی نمائندگی کر رہا ہوں ان کے حقوق کی حمایت اور حفاظت کرتا ہوں اُن کی حق رسی کے لئے افسران محکمہ، وزیر تعلیم اور مجلس قانون ساز پنجاب (پنجاب اسمبلی) کے حامیان تعلیم ممبروں کو توجہ دلاتا رہتا ہوں۔

اساتذہ سے

محترم اساتذہ جو سرکاری یا پرائیویٹ اسکولوں میں خدمت تعلیم و تدریس انجام دے رہے ہیں۔

مجھے اپنی مشکلات سے مطلع فرماتے رہیں انہیں کیا مشکلات ہیں کیا شکایات ہیں اُنکے حقوق کیا ہیں اپنی حقوق رسی میں وہ کیوں اور کس حد تک ناکام ہیں اور اسی نوع کی تفاصیل سے مجھے ضرور باخبر رکھیں میں اُن کی بے اثر فریاد کو متعلقہ افسران کے کانوں تک پہنچانے کی سعی بلیغ کا وعدہ کرتا ہوں۔ خود اپنے پرچے میں بھی لکھوں گا۔ دوسرے

اخبارات میں بھی لکھوں گا - اور اپنے محدود دائرۂ رسوخ کو کام میں لانے میں دریغ نہ کروں گا -

تاجور

تعلیمی فلمیں

جولائی کے شاہکار میں "سنیما اور تعلیم" کے عنوان سے تعلیمی فلموں کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی تھی

عوام الناس کی تعلیم و تربیت کیلئے کھیل، ورزش اصولِ حفظانِ صحت وغیرہ کے متعلق معلومات افروز فلموں کی تیاری جہاں ملک کے لئے مفید ہے وہاں فلمسازوں کیلئے بھی باعث منفعت ہو سکتی ہے ترقی یافتہ ممالک میں فلموں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے - وہاں فلموں سے مدارس میں تعلیم دینے کے لئے ایک امدادی عنصر کے طور پر کام لیا جاتا ہے -

مقام شکر ہے کہ اس ضرورت کی اہمیت کا بعض ہندوستانیوں کو بھی احساس ہو رہا ہے اور وہ کچھ کچھ اس جانب متوجہ ہوتے نظر آ رہے ہیں - چنانچہ جناب فرید انصاری کی اطلاع کے مطابق میسرز فضل بھائی لمیٹڈ کے زیر انتظام جنرل فلم لمیٹڈ کے نام سے بمبئی میں ایک نئی کمپنی رجسٹرڈ ہوئی ہے جو خصوصیت سے تعلیمی فلمیں تیار کرے گی سیفٹی فرسٹ ایسوسی ایشن اور میونسپل کارپوریشن خاص طور پر تعلیمی فلمیں تیار کرنے میں مدد کرینگی - اس کمپنی کی پہلی فلم سٹو و ٹریجیڈی (Stove Tragedy) ہو گی -

تعلیمی فلموں کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلی جو جغرافیائی حالات اور سیر و سیاحت سے متعلق ہو اور دوسری جو تاریخ وغیرہ کے خاص موضوع پر بنائی جائے - ان فلموں کے ذریعے استاد کو زیادہ محنت نہ کرنی پڑے گی - اور طلبہ کو نہایت آسانی سے سبق یاد ہو سکیں گے -

تاریخ و جغرافیہ اور معدنیات و نباتات کی تعلیم کے علاوہ سائنس - انجینئرنگ اور صنعت و حرفت کی تعلیم کا کام بھی لیا جا سکتا ہے کہ ان کے ذریعے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کس طرح خوشحالی و فارغ البالی کی نعمت سے مالا مال ہو رہے ہیں -

ملک و قوم کی فلاح و بہبود کا احساس رکھنے والے حضرات اور قومی اخبارات کو چاہئے کہ وہ اس اہم موضوع کے متعلق متواتر پروپیگنڈا کریں - اور لوگوں کو تعلیمی فلموں کے فوائد سے آگاہ کر کے رائے عامہ کو منظم کریں - کیونکہ جبتک رائے عامہ منظم نہ ہو یہ کام تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا -

یزدانی

اتحاد کانفرنس

سب جانتے ہیں اور مخالفین کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ سر سکندر حیات فطرتاً غیر متعصب اور اتحاد پسند واقع ہوئے ہیں - لاہور میں ان کی سیاسی زندگی کے دس بارہ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں اس طویل مدت میں انہیں اپنے سیاسی عقاید کے اظہار کے غیر متعدد مواقع ملے اور ہر موقع پر انہوں نے آزادانہ انداز میں وطن پرورانہ خیالات کا اظہار کیا ہے - یہ حقیقت بھی کسی سے مخفی نہیں کہ وہ مشترکہ انتخاب کی جانب مائل ہیں اور انہوں نے اپنے اس عقیدے کو ایسے نازک دور میں بھی چھپانے کی کبھی سعی نہیں کی جب پنجاب فرقہ پرستی کے معرکوں کا میدان بن رہا تھا

وزارتِ عظمیٰ کی مسند پر بیٹھتے ہی پہلی فرصت میں انہوں نے صوبے کی فرقہ وارانہ ہنگامہ آرائیوں کو فرو کرنے اور پنجاب میں مستقل امن قایم کرنے کے مقصد سے ہر فرقے کے لیڈروں کی ایک مجلس "اتحاد کانفرنس" کے نام سے قایم کی ہے - اس مجلس کے متعدد اجلاس سر سکندر حیات کی صدارت میں ہو چکے ہیں - مجلس کے اراکین نہایت خاموشی اور انہماک سے موجودہ فرقہ آرائی کو بند کرنے کی تدابیر سوچ رہے ہیں - سر موصوف کے ارشاد کے موافق راہ امن سے مشکلات کے خارزار کو صاف کرنے کی بہت سی تجاویز پر مجلس کے ممبران میں ہم آہنگی و ہم رائی پیدا ہو چکی ہے

خدا کرے یہ مبارک اور اہم کانفرنس جس کا انعقاد موجودہ حالات اور آئندہ خطرات کے پیشِ نظر ضروری تھا کسی مفید انجام پر پہونچے -

تاجور

کلامِ تاجور

برداشت دردِ عشق کی دشوار ہو گئی — اب زندگی بھی جان کا آزار ہو گئی

خودداریٔ جنوں نے نہ جانے دیا وہاں — کمبخت راہِ دوست میں دیوار ہو گئی

ہے وجہِ انبساط محبّت میں اعتدال — جب حد سے بڑھ گئی رسن و دار ہو گئی

اُس بزمِ خاص میں تھا فقط عشق باریاب — بے امتیازیوں سے جو بازار ہو گئی

اُف وہ نظر کہ سب کے لئے دلنواز ہے — مجھ پر کبھی پڑی ہے تو تلوار ہو گئی

تھا اُن کو خود بھی اپنی جفاؤں کا اعتراف — میری زبان کہہ کے گنہگار ہو گئی

اُلفت ہے راز، راز کی حد تک ہے سرفراز — جب داستانِ بزم بنی خوار ہو گئی

وہ مجھ سے ربط و ضبط بڑھا کر بگڑ گئے — ہونی تھی یہ بھی عاقبتِ کار ہو گئی

اے تاجور وہ نزع میں آئے زہے نصیب
حاصل مجھے سعادتِ دیدار ہو گئی

تاجور

سوال و جواب

سوالات

۱- کیا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ غیر مقفیٰ شاعری عنقریب مروّج شاعری کی جگہ لے لیگی۔

۲- ہندی نہایت سُرعت کے ساتھ ملک میں پھیلتی جا رہی ہے ہندی فلمیں ہندی ریکارڈ عوام پر گہرا اثر ڈال رہے ہیں کیا کوئی ایسا آسان ذریعہ ہے جس سے اردو زبان کی حفاظت کی جائے اور ہندی کی بڑھتی ہوئی رَو کو روکا جائے۔

۳- اکثر اُردو رسالوں اور اخباروں کا معیار بہت گرا ہوا ہے لیکن وہی ملک میں کثرت سے فروخت ہوتے ہیں جس سے پبلک کا مذاق بگڑتا چلا جا رہا ہے۔ اگر ان اخبارات اور رسالہ جات کی طرف نامور شعرا اور مضمون نگار توجہ دیں تو تھوڑے ہی عرصے میں ان کا معیار بلند کیا جا سکتا ہے آپ کی اِس کے متعلق کیا رائے ہے؟

شیخ محمد طفیل از شملہ۔

جواب

۱- زندگی کا ہر پہلو آزادی کی نعمت سے شاد کام ہو رہا ہے تو اردو شاعری نے کیا قصور کیا ہے کہ اُسے ردیف اور قافیے کی زنجیروں میں گرفتار رکھا جائے۔ بے قافیہ نظموں سے شعرا کی وحشت دور ہو چکی ہے۔ اچھی بے قافیہ نظمیں بلند پایہ اُردو رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ جدت پسند نوجوان شعرا کی توجہ ادھر مبذول ہوتی جاتی ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ بے قافیہ شاعری قبولیت عام حاصل کرلے گی۔ انجمن ارباب علم پنجاب کے ذریعہ میں نے بے قافیہ نظموں کو رواج دینے کی مسلسل کوشش کی تھی اِس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اب بے قافیہ نظمیں اجنبی نگاہوں سے نہیں دیکھی جاتیں ضرورت یہ ہے کہ پختہ مشق اور قادر الکلام اردو شعرا ادھر توجہ کریں کیونکہ بے قافیہ نظم میں ترنم اور نغمہ پیدا کرنا آسان نہیں نظم میں زیادہ تر قافیہ ترنم کا کفیل ہوتا ہے۔ قافیہ اڑا کر نظم میں ترنم پیدا کرنا بہت مشکل کام ہے پختہ مشق اور قادر البیان شعرا ایسی نظموں میں قافیے کی ترنم ریزی کا نعم البدل پیدا کر سکتے ہیں خام مشق نوجوانوں کے بس کی یہ بات نہیں بلکہ مجھے تو اندیشہ ہے کہ اگر خام مشق نوجوانوں نے بے قافیہ نظموں کی جانب زیادہ توجہ مبذول کر دی تو یہ صنف کبھی سرسبزی نہ ہو سکے گی۔

۲- ہندی کی بڑھتی ہوئی رَو کو روکنا بہت خیالی ہے۔ ہندی اگر واقعی سُرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے تو بہت مبارک ہے۔ وہ بھی آخر ہمارے وطن کی بولی ہے اور علمی سرمائے کی مالک اِس کی ترقی سے ہر ہندوستانی کو خوش ہونا چاہئے۔ ہندی کو اردو کا حریف تصوّر کرنے کی بجائے اُسکی سہیلی خیال کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کی اشاعت زیادہ تر ہندو مصنفین ہندو پبلشروں اور ہندو صحافت سے اشاعت پذیر ہو رہی ہے۔ اور اُردو ادب ہندو شعرا و ادبا کی تربیت و سرپرستی کا ابتدا سے مرہونِ منّت رہا ہے اور اب بھی ہے۔ ہمیں ہندی فلموں اور ریکارڈوں کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ بلکہ مسلمان طلبہ اور اہل ذوق کو ہندی سیکھنی اور اپنی بساط بھر ہندی کی اشاعت میں سعی کرنی چاہیئے۔

اُن لوگوں سے جو ہندی کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں صرف وہاں اختلاف ہوتا ہے جب وہ اُردو کو مٹانے کے خواب ہائے پریشاں دیکھنے لگتے ہیں۔ ہندو مسلمان اُردو ہندی دونو کو اپنا کر دونوں کے نشر و اشاعت کی سعی کریں تو دونوں زبانوں کے لئے بہتر ہو ادبیات میں پالیٹکس کو داخل کر کے اُردو ہندی کی مخالفت وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں خانہ جنگی میں لطف آتا ہے۔

۳- ملکی غلامی کا اثر ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر طاری ہے تو ہمارا لٹریچر اس سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ پست نگاری بیہودہ نگاری عُریاں نگاری جدید تعلیم یافتہ نوجوان پسند کرنا چھوڑ دیں تو پست معیار پرچوں پر مرگِ عام طاری ہو جائے۔

ہمارے نوجوان تعلیم حاصل کر رہے ہیں مگر تربیت سے محروم ہیں۔ ان کی سوسائٹی تہذیب و متانت سے عموماً پاک ہے۔ ادھر

انگریزی تعلیم کی مصروفیت نے انہیں ملکی زبانوں کی صحیح تعلیم سے بے بہرہ کر رکھا ہے فارسی۔ عربی زبانیں اُردو کے پیکر میں رُوح کا درجہ رکھتی ہیں ان زبانوں کے بغیر علمی و ادبی اُردو سے استفادہ دشوار ہے اور عربی و فارسی کی جگہ تعلیمات میں فرنچ، پولیٹکل سائنس اور جرمن لے رہی ہے مزید براں یہ ہے کہ ادبی اُردو عربی فارسی کے مغلق الفاظ سے بھرتی چلی جاتی ہے ان مشکلات کی موجودگی میں نوجوان بلند معیار پرچوں سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے اور مجبور ہو کر پست معیار پرچوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان موقت الشیوع کوک شاستروں کو ترویج عام کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اور اسی مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ نوجوانوں میں آوارگی پیدا ہو رہی ہے اس مصیبت کا علاج ان مشکلات کے ازالے میں مضمر ہے مگر میں جانتا ہوں کہ یہ ازالہ اُردو کے مقدر میں نہیں ہے۔

تاجور

سوال نمبر ۴

میں منشی فاضل کا امتحان دینا چاہتا ہوں۔ فارسی ادب سے مجھے ابتدا سے دلچسپی ہے۔ ایف۔ اے میں بھی فارسی لے رکھی تھی مگر عربی بی۔ اے کورس سے خائف ہوں۔ کیونکہ عربی میں نے بالکل نہیں پڑھی۔ امتحان میں چھ سات مہینے رہ گئے ہیں۔ کوئی ترکیب ایسی بتائیے کہ عربی کورس کے پرچے میں فیل ہونے سے بچ جاؤں

امرت لال نظر مدرس مڈل سکول ملتان

جواب نمبر ۴

آپ لگ کے محنت کریں تو منشی فاضل کا باقی نصاب چھ سات مہینے میں تیار کر سکیں گے اور عربی بی اے کورس سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں منشی فاضل کے پچانوے فی صدی کامیاب اُمیدوار اسے رٹ رٹا کر پاس ہو جاتے ہیں۔ آپ بھی کورس کی عبارت اور اس کا اُردو ترجمہ طوطے کی طرح رٹ لیجئے "پڑھو جا رام بھلی کریں گے" تُک بیٹھ گئی تو اس پرچے میں بھی پاس ہو جائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ فارسی زبان آسان ہے۔ چند ماہ میں بقدر کامیابی امتحان آ سکتی ہے لیکن عربی کے لئے کچھ سال ضرور لگانے پڑتے ہیں۔ آپ کے پاس نہ اتنا وقت نہ شاید آپ کو اس کی ضرورت کہ عربی زبان کو پڑھنے کی طرح پڑھیں پھر خائف ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ سارا کورس رٹنے میں دماغ پر غیر معمولی بوجھ تو پڑے گا مگر اس کے بغیر چارہ کار بھی کیا ہے؟ میرے خیال میں تو منشی فاضل کے نصاب میں عربی بی اے کورس داخل کرنا بے سود بلکہ اُمیدواران کے لئے ہمت آزما بھی ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ منشی اور منشی عالم پاس کئے بغیر بھی ہر شخص منشی فاضل کے امتحان میں شریک ہو سکتا ہے۔ اس نصاب میں اسے شامل کرنے کا غالباً یہ مقصد تھا کہ فارسی ادب میں چونکہ عربی الفاظ و خیالات کا عنصر زیادہ ہے۔ اس لئے عربی بی اے کورس پڑھنے سے اُمیدواروں میں بلند فارسی کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہو جائے گی لیکن یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا تھا کہ نیچے کے درجوں کے امتحانات پاس کرنے ضروری قرار دیئے جائیں اور اس طرح طلبہ کو عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملتا پھر البتہ اُن کے لئے منشی فاضل میں عربی کورس کا سمجھنا اور پڑھنا آسان ہو سکتا تھا۔ جب ایسا نہیں ہے تو عربی کورس کا اس کے نصاب میں داخل کرنا اُمیدواران امتحان کے دماغوں کو رٹنے کی سزا دینے کے برابر ہے۔

سوال نمبر ۵

حضرت جگر کا پتہ مطلوب ہے۔ آپ کو معلوم ہو تو مطلع فرما کر ممنون کیجئے،

غلام محمد نسیم ہوشیار پور

جواب نمبر ۵

حضرت جگر جہانیاں جہاں گشت ہیں۔ اُن کا کوئی مستقل پتہ نہیں بتا سکتا۔ آپ جامعہ ملیہ کے کتبخانہ کے منیجر صاحب سے دریافت فرمایئے اشاید انہیں اُن کا پتہ معلوم ہو یا پھر اُن کے دوست شیخ اصغر حسین صاحب مختار مین پوری یو۔ پی سے اُن کا موجودہ پتہ مل سکے گا۔

سوال نمبر ۶:- کلیات سودا میں سودا کے قصیدے کا ایک شعر ہے جس کا دوسرا مصرعہ سمجھ میں نہیں آتا "اُن گلوں کھُپٹ جو تنگہ کے ہیں سدا مستعمل" اس میں کھپٹ" کے کیا معنی ہیں؟

رام لال ٹیچر مڈل سکول ڈیرہ غازی خاں

جواب نمبر ۶:- "کھُپٹ" "چھوڑ" کی جگہ استعمال ہوا ہے یعنی اُن پھولوں کو چھوڑ کے۔ اُن کے علاوہ جو ہمیشہ دیکھنے میں آتے ہیں" کھُپٹ" کا لفظ اب متروک الاستعمال الفاظ میں شامل ہے۔

تاجور

جنرل فلمز لمیٹڈ بمبئی کے نام سے رجسٹرڈ ہوئی ہے۔ کمپنی خاص طور پر تعلیمی فلم تیار کریگی کمپنی کی پہلی فلم Stone Tragedy ہوگی سیفٹی فرسٹ ایسوسی ایشن اور میونسپل کارپوریشن خاص طور پر تعلیمی فلمیں تیار کرنے میں مدد کریں گی ہندوستان میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ اس قسم کے تعلیمی فلم پبلک مفاد کے لئے خاص طور سے تیار کئے جا رہے ہیں۔

ہندوستانی اداکاروں میں جنہوں نے غیر ممالک میں شہرت حاصل کی دیویکا رانی ممتاز ہے جس نے "کرما" نامی فلم میں کافی نام پیدا کیا اس کے بعد جنوبی ہند کا ایک ۱۲ سالہ لڑکا سابو ہے جس نے کپلنگ کے ڈرامہ "ٹومائی آف دی ایلی فینٹس" میں کام کیا ہے۔ یہ فلم ایک برٹش کمپنی نے میسور کے جنگلوں میں تیار کی سابو کے متعلق اس کے نگراں کا خیال کہ وہ ایک فطرتی اور سمجھدار بچہ ہے۔ اکثر شرارت بھی کرتا ہے لیکن درحقیقت بہت اچھا لڑکا ہے۔

ان چیزوں سے یقیناً ثابت ہو جائیگا کہ ہندوستانی فلم انڈسٹری کھیلوں کو کامیاب اور معیار پر لانے کی کوشاں نظر آ رہی ہے ملاحظہ فرمائیے اکر مندرجہ ذیل کھیلوں پر تقریباً سوا لاکھ روپیہ ...... لاگت آئی ہے جو صرف اس لئے ہے کہ ڈراموں کو کامیاب بنایا جائے۔ اور ایک حد تک یہ کھیل کامیاب بھی ہوئے کاروانِ حیات ۔ سانگ آف لائف ۔ طوفانی ۔ سبتا ۔ سپاہی کی سجنی ۔ انارکلی ۔ ڈاکو کی لڑکی ۔ جنم بھومی اچھوت کنیا ۔ پریذیڈنٹ وغیرہ وغیرہ ۔

آخر میں عرض کرونگا کہ ایک چیز جو فلموں کیلئے بہت زیادہ مفید ہو سکتی ہے یہ ہے کہ فلم کمپنیوں کے ڈائرکٹر مخالف اور موافق تنقیدوں کو جو اُن کی تیار کردہ فلموں پر ہوا کرتی ہیں ...... بغور نہیں دیکھتے۔ اگر ایسا کرنے لگیں تو یقیناً آنیوالی فلمیں نقائص سے ایک حد تک مبرا نظر آنے لگیں دوسرے یہ کہ ہماری فلمیں ایسی ہونا چاہئیں جس سے مُلک کی سماجی بُرائیاں دور ہو سکیں۔ اگر ہمارے فلم ساز حضرات ذرا بھی توجہ سے کام لیں تو ہندوستانی فلمیں یقیناً عروج پر پہنچ سکتی ہیں۔

بہرحال ہماری فلم کمپنیاں کھیلوں کو بہتر اور کامیاب بنانے میں یقیناً کوشاں نظر آ رہی ہیں۔

فریدا انصاری (بھوپال)

ایک فراموش کار سے

اے مری جانِ تمنا اے قرارِ زندگی — اے گلستانِ محبت اے بہارِ زندگی

تو ہے میرے واسطے سرمایۂ عیش و نشاط — تیرے جلووں سے برستی ہے شرابِ انبساط

تو دلِ مضطر کے حق میں باعثِ لطف و قرار — ہائے کس لذت سے کرتا ہوں میں تیرا انتظار

جب مری تخئیل تیری یاد سے معمور ہے — راحتِ جاں! پھر مری آنکھوں سے تو کیوں دور ہے

وہ بھی دن تھے جب تجھے میری وفا کا پاس تھا — اور میرے جذبۂ دل کا تجھے احساس تھا

وہ بھی دن تھے تجھ سے تھا جب عہد پیمانِ وفا — یاد ہے اب تک مجھے وہ دور اے جانِ وفا

کس لئے وہ دل نوازی کی ادا جاتی رہی — کیا دیارِ حسن سے رسمِ وفا جاتی رہی

قربان حسین شہیدؔ

وطن کو خیرباد کہتے ہوئے

سلام اے وطن کی حسیں سیرگاہو　　کسی کے قدم چومنے والی راہو
سلام اے وطن کی فسوں گر ہواؤ　　شرابوں میں ڈوبی ہوئی سی فضاؤ
سلام اے محبت کی رنگین وادی　　بہاروں میں کھوئی ہوئی خلدزادی
سلام اے پہاڑوں کی دلکش قطارو　　سلام اے مرے رازداں دیو دارو
سلام اے تمنّا کی آنکھوں کے تارے　　سلام اے مری حسرتوں کے سہارے
سلام اے جوانی کی راتوں کی زینت　　وطن کے جوانوں کی باتوں کی زینت

بہت دُور باچشمِ تر جا رہا ہوں
نہیں چاہتا گو مگر جا رہا ہوں

مجھے یاد کر کے نہ آنسو بہانا　　حسیں انکھڑیوں کو نہ بیکل بنانا
جگر کو نہ ٹیسوں سے آباد کرنا　　جوانی کی راتیں نہ برباد کرنا
محبّت میں خود کو نہ بیکار کرنا　　مرے واسطے غم نہ تنہا رکرنا
اگر زندگی نے رفاقت نہ چھوڑی　　اگر موت نے سانس کی لَے نہ توڑی

تو دم تیرے زانو پہ توڑوں گا سلمیٰ
تجھے بعد مرنے کے چھوڑوں گا سلمیٰ

الطاف مشہدی.

عدم کی شاعری

کسی شاعر کی شاعری کو سمجھنے کے لئے یہ بہت آسان ہوگا کہ ہم اُس شاعر کی زندگی کا مطالعہ کریں۔ شاعری کو ہماری زندگی کے ساتھ جو گہرا تعلق ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ کیونکہ "شاعری آرٹ ہے اور سارٹ زندگی ہے" اس لئے یہ اصول بالکل درست ہوگا کہ کسی شاعر کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پہلے شاعر کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ اصول جتنا آسان ہے۔ اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ کیونکہ ہر نقاد کے لئے ایک مشکل سی بات ہوگی کہ وہ ہر شاعر کی "زندگی" کا مطالعہ کرنے کے لئے اُس کے ساتھ ربط و ضبط پیدا کرے

لیکن خوش قسمتی سے مجھے اس اصول کو برتنے کا موقع ملا ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ راقم السطور نے عدم کی شاعری کا مطالعہ کرنے کی بجائے عدم کے خیالات و جذبات کا مطالعہ نظر غائر سے کیا ہے۔ اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جہاں عدم فطرتاً شدید الاحساس۔ بلند نظر اور صاحبِ وجد و حال واقع ہوا ہے۔ وہاں اس کی شاعری میں بھی مجھے یہی چیزیں نظر آرہی ہیں۔

عدم سطحی شاعر نہیں ہے۔ اُس کے خیالات و جذبات سطحی نہیں ہوتے بلکہ اس کے خیالات و جذبات میں ایک وسعت اور ایک گہرائی ہوتی ہے۔ اُس کی نظم کا نفسِ مضمون عالمگیر ہوتا ہے۔ جو انسانی جذبات کا صحیح ترجمان ہوتا ہے۔ گو اس پر شاعر کا ذاتی رنگ غالب ہوتا ہے جس کے باعث کم فہم لوگ اسے شاعر کے ذاتی خیالات کا آئینہ دار سمجھتے ہیں؛

عدم کی شاعری نہ محض تخیلی ہے نہ صرف جذباتی۔ بلکہ شاعری میں تخیل اور جذبات دونوں کار فرما ہیں۔ وہ ہر نظم میں جہاں تخیل کی روح بھرتا ہے۔ وہاں جذبات کی روح بھی نظم میں حل کر دیتا ہے۔ تخیل اور جذبات کے امتزاج سے نظم میں ایک خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو بہت کم شعراء کے کلام میں نظر آتی ہے ذیل کی نظم "رخصت" میں تخیل کی بلندی اور جذبات کے لوچ کے امتزاج سے نظم میں ایک چیز پیدا ہو گئی ہے۔ جو یقیناً قابلِ تعریف ہے۔

رخصت اے دوست یہاں آئے تھے رونے کے لئے
جو ہر زیست غمِ عشق میں کھونے کے لئے
سو گیا ہے مرے ہاتھوں میں جوانی کا رباب
زندگی کیا تھی؟ بس اک نغمۂ افسردۂ شباب
میری پتھرائی ہوئی آنکھوں کو فرصتِ خواب
کہ میری روح بھی بے چین ہے سونے کے لئے

اس طرف ایک سمندر ہے خموش اور مغموم!
جس کی تہہ میں نظر آتا ہے ستاروں کا ہجوم
اُس سمندر کے کنارے پہ سفینہ ہے کوئی
منتظر میری سفینے میں حسینہ ہے کوئی
مجھکو جانے دے یہ مسعود مہینہ ہے کوئی
مجھکو درپیش ہے پیارے! سفر شہر نجوم!

مجھکو جانے دے خدارا مری منزل ہے وہی
کر رہے ہیں کا اشارہ مری منزل ہے وہی
مجھکو اس ارضِ مقدس کا سفر کرنے دے
عشق کے آخری میداں میں قدم دھرنے دے
روحِ محبوب سے ملنے کے لئے مرنے دے
میں بھی ہوں ایک ستارہ مری منزل ہے وہی

اُردو شاعری غنائی شاعری ہے۔ حزن و ملال۔ بے ثباتیٔ دُنیا۔ ناسازگاریٔ روزگار۔ بے مہریٔ فلک وغیرہ ایسے عنوانات ہیں۔ جن سے اُردو شاعری بھری پڑی ہے۔ درحقیقت یہ "قنوطیت" ماحول کے اثر کا نتیجہ نہیں ہے (گو تمام حالتوں میں نہیں) بلکہ یہ چیز فارسی شاعری کے تتبع کا نتیجہ ہے۔ وہی خیالات و حزن و ملال "شکایت فلک" اور وہی ماحول جو فارسی شعراء نے اپنے لئے پیدا کیا تھا۔ اُردو شاعری کی جان ہو کر رہ گیا ہے۔

میں یہ مانتا ہوں کہ اُردو کے بعض شعراء مثلاً میر تقی میر وغیرہ کا ماحول ہی ایسا تھا جس کو "قنوطی" کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے اُن سے یہ توقع رکھنا کہ وہ زندگی کے روشن پہلوؤں کو اپنی شاعری کا آئینہ دار بنائیں ایک ناممکن سی بات ہے "قنوطیت" اُن کی زندگی بن چکی تھی اور اس سے خلاصی پانا اُن کے لئے دشوار تھا۔ مگر یہی "قنوطیت" ہمیں اُردو کے دوسرے شعراء میں بھی نظر آتی ہے۔ کیوں؟ اس کی وجہ میں فارسی شعراء کا تتبع بتا چکا ہوں۔ لیکن اس سے زیادہ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ یہ چیز دورِ جدید کے شعراء میں بھی نمایاں ہے۔ حالانکہ "قنوطیت" موجودہ ماحول کے بالکل خلاف ہے۔ جو خواہ مخواہ شاعری میں گھسیٹ لی گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ اُردو شعراء کی تخلیقی قوت نہایت کمزور واقع ہوئی ہے۔ بجائے اس کے

کہ وہ زندگی کو "ماحول" کے مطابق بنائیں یا زندگی کو اپنی نظر سے دیکھیں۔ غیر کی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ایسے شعراء کے کلام کا مطالعہ جس کی شاعری حزن و ملال۔ بے ثباتیٔ دنیا۔ کجرویٔ فلک کا درس دینے کے سوا اپنے اندر اور کچھ نہیں رکھتی۔ ہمارے ذہنوں میں انہی خیالات کو جاگزیں کر دیتی ہے اگر ایسے ہی "قنوطی نظریات" کی بھرمار رہی ہے تو مجھے ڈر ہے کہ ہماری شاعری کی پرواز بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ ادب یا شعر کا کام خیالات کو پست بنانا نہیں ہے۔ اور نہ ایسی کیفیت ہی کو پیدا کرنا ہے جو ہمیں زندگی سے بیزار کر دے۔ بلکہ شعر کا کام مردہ خیالات اور مردہ ماحول میں زندگی کی روح پھونکنا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہماری شاعری زندہ ماحول کو بھی مردہ بنا دیتی ہے

عدم کی شاعری "طلسم یاقنوطیت" سے بالکل بیگانہ ہے "رجائیت پسندی" اُس کا مذہب ہے۔ وہ زندگی سے ناامید ہونا کفر سمجھتا ہے۔ وہ زندگی کی مسرتوں اور لطافتوں کو محسوس کرتا ہے اور اُن کو مناتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ قاری کو بھی مجبور کرتا ہے کہ وہ زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہو۔ وہ آلام و مصائب سے گھبراتا نہیں بلکہ اُن پر چھا جانا چاہتا ہے ؎

میں عشق کا پروردہ ہوں عدم ہر عزم مرا لافانی ہے
میں موت سے کیا خم کھاؤں گا میں موت پہ بھی چھا جاؤں گا

عدم "قنوط و یاس" کا قائل نہیں اس کا پیغام وہی ہے جو شیلے کا تھا

O Wind,
If winter comes, can
spring be far behind.

عدم نے اپنے نظریۂ "رجائیت" کو ذیل کی نظم "کاروبار نشاط" میں عجیب انداز سے بیان کیا ہے:-

راستے میں اُس سمن پیکر کی نظروں کا سلام
چشم نکتہ فہم کر دیتا ہے مے کا ایک جام
اک محبت زاد گستاخی عدم اُن کے حضور
بخشتی ہے دل کو کیا وجد آفریں کیف و سرور
گرمیوں کی دوپہر میں گاؤں کی پریوں کے راگ
بڑھ کی ٹھنڈی چھاؤں میں جلتی ہوئی الفت کی آگ
بنسری کی آتشیں لے اور نگاہوں کی مٹھاس
جس سے بجھتی بھی ہے اور بڑھتی بھی ہے شاعر کی پیاس
کتنے زریں عیش ہیں بکھرے ہوئے ہر گام پر
میں توجہ کیا کروں دنیا ترے آلام پر

"حوادث" "ناگزیر" کے عنوان سے فرماتے ہیں۔

لے دے کے یونہیں دہر میں رونا ہے ہمیشہ — تقدیر میں لکھا ہے جو ہونا ہے ہمیشہ
مے پی کے ذرا دیکھ لیں ہم نور بھرے خواب — ظلمات بھری نیند تو سونا ہے ہمیشہ

عدم کی شاعری کا وہ رنگ جس کو میں سب سے زیادہ کامیاب سمجھتا ہوں۔ نفسیات کی صحیح ترجمانی ہے۔ عدم درحقیقت نفسیاتی شاعر ہے اور اس کی نفسیاتی شاعری۔ اُس کی فطرت نگاری یا غزل گوئی سے کہیں زیادہ کامیاب اور بلند ہے۔ وہ اظہار خیالات اور جذبات عشق و محبت کی ترجمانی اس انداز میں کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ شاعر کے خیالات و جذبات سے لطف اندوز ہو رہا ہے یا اُس کے طرز بیان سے۔

"نفسیاتی شاعری" میں سب سے بڑی دقت جو ایک شاعر کو محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ شاعر کی نفسیاتی نظموں سے (Realism) حقیقت طرازی مفقود نہ ہو جائے اور اگر اس کے نفسیات سے یہ عنصر مفقود ہو تو پھر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی شاعری ایک کاغذی پھول کی مانند دیکھنے میں خوبصورت لیکن حقیقت میں بدنما ہے۔

لیکن عدم کی نفسیاتی نظموں سے حقیقت طرازی پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہی ہے۔ وہ کسی واقعہ میں ہرگز مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لیتا۔ اُس کے شواہد و واقعات حقیقت کا پہلو لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ اظہار خیالات و جذبات میں حقیقت سے کام لیتا ہے۔ ذیل کی دو نفسیاتی نظمیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) دو رنگ

اُن کی جانب پہلے یونہی دیکھتا رہتا تھا میں — بات تو کوئی نہیں تھی دیکھتا رہتا تھا میں
دیکھتے رہنے سے میرے وہ بہت مسرور تھے!! — اپنے حسنِ دلبری سے آپ ہی مسحور تھے!!
اُن کو خوش کرنے کی خاطر آہ بھر لیتا تھا میں — گاہے گاہے اپنے دل پر ہاتھ دھر لیتا تھا میں
وہ سمجھتے تھے کہ اُن کے حسن پر مرتا ہوں میں — اُن سے کرتا ہوں محبت اُن کا دم بھرتا ہوں میں
گھر میں اُن کو چین آتا تھا نہ میرے دھیان میں — بس بہے جاتے تھے وہ جذبات کے طوفان میں
باغ میں ہر روز مجھ کو دیکھنے آتے تھے وہ — بن سنور کر مجھ سے دادِ حسن لیجاتے تھے وہ
مدعا اس کھیل کا کیا تھا فقط اک دل لگی — اُن کو خوش کرنے میں پنہاں تھی مری اپنی خوشی
کر کے خوش فہمی میں اُن کو مبتلا ہنستا تھا میں — سادگی پر اُن کی دل میں برملا ہنستا تھا میں

آہ لیکن ہمنشیں اب دل کی حالت اور ہے — دِل کی حالت اور ہے رنگِ طبیعت اور ہے
جب نظر آتی نہیں گلزار میں اُن کی جھلک — ٹھوکریں کھاتی ہیں سودائی نگاہیں دور تک
باغ میں آتا تھا پہلے سیر کو میں اب مگر — کھینچ لاتی ہے یہاں اُن کی کشش شام و سحر

اُن کو دیوانہ بنا کر مجھ کو وحشت ہو گئی
دل لگی کی تھی۔ مگر سچ مچ محبت ہو گئی

~~~~~~~~

"بے جرأتی"

اُس کا کیا نام ہے اُس پیکرِ رعنائی کا   ہے تقاضہ یہی ہر دم دلِ سودائی کا
اُس کا کیا نام ہے؟ وہ جسکو مگر کیا کہئے!   گو شناسا تو نہیں۔ جانِ تمنّا کہیے
اتفاقاً وہ اِدھر سے جو گزر جاتا ہے   دِل کو اور روح کو بیتاب سا کر جاتا ہے
اُس کی رفتار میں بہہ جاتی ہے ہستی میری   ہے زمانے سے جدا حسن پرستی میری
بعض اوقات اچانک یہ خیال آتا ہے   ایک دیوانے کو جس طرح کہ حال آتا ہے
کہ کبھی جرأتِ آدابِ پرستاری سے   طرزِ بیباکی سے اور حُسنِ نگوں ساری سے
کر ہی دوں بڑھ کے نذر پیشِ محبت کا سلام   اور پھر پوچھ ہی لوں کیا ہے جناب آپکا نام"
دِل دھڑک اُٹھتا ہے لیکن یہ خیال آتے ہی   یعنی رسوائیِ الفت کا سوال آتے ہی
آہ بھر لیتا ہوں اور دِل کو یہ سمجھاتا ہوں   دِل نہیں مانتا لیکن میں کہے جاتا ہوں

ضبط اچھا ہے بہت بے طلبی اچھی ہے
عشق میں دُور نگاہی کی خوشی اچھی ہے

مندرجہ بالا نظمیں پڑھ چکنے کے بعد یہ امر قاری پر عیاں ہو جاتا ہے کہ عدمؔ کا مطالعہ نفسیات جنسی کس قدر گہرا اور حقیقت رسا ہے اور وہ واقعات اور شواہد کے بیان کرنے میں کس قدر حقیقت سے کام لیتا ہے" حقیقت" یہ ہے کہ عدمؔ جدید اُردو شاعری کا واحد اور کامیاب نفسیاتی شاعر ہے۔

آرٹ اور پیغام، ایک ایسا عنوان ہے۔ جو ہمیشہ تنقید و تبصرہ کا محتاج رہا ہے۔ چونکہ میرے موضوع سے یہ بحث خارج ہے۔ اِس لئے میں آرٹ یا پیغام کے حق یا مخالفت میں کسی قسم کی رائے کا اظہار نہ کر سکوں گا۔ البتہ بعض جگہ محض تشریح کے طور پر اپنے مفہوم کو واضح طور پر بیان کروں گا۔ عدم کی شاعری آرٹ کی ترجمان ہے۔ لیکن وہ اپنی اکثر نظموں میں کوئی نہ کوئی پیغام ضرور دے جاتا ہے۔ گو اُس کا یہ پیغام آجکل کے لفظ "پیغام" کے محدود معنوں سے یکسر الگ ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار مختلف نظموں سے پیش کرتا ہوں :

تو بھی تعمیر اپنا لے لمحۂ جاوید کر   دیکھ لے جس میں زمانہ تیری ہستی کا شرر
ہے عمل کے ہر دقیقے میں ثباتِ جاوداں   شوکتِ یک لمحہ بھی ہے اک حیاتِ جاوداں

~~~~~~~~

گو مرے سینے میں جذباتِ تخریب کا جوش ہے   قطرے قطرے میں جہنم کی تپش روپوش ہے

ایک لمحہ عمر کا بیکار بھی نہیں وقفِ ملال   دیکھ میری فطرتِ آزاد میں شانِ کمال

زندگی کا راز کیا ہے؟ نبضِ ہمت کی دھمک
گو کلیجہ شق ہو، لب پر تو تبسم کی جھلک

~~~~~~~~

بے بہا ہے زندگی کا ایک اک لمحہ مگر   دیکھ انساں سو رہا ہے دو جہاں سے بے خبر
کچھ بتا مجھ کو بشر کو کس طرح آتی ہے نیند   محوِ حیرت ہوں کہ زندوں پر بھی چھا جاتی ہے نیند

~~~~~~~~

ہے غضب حاصلِ محنت یہ دُنیا کیسا وہ دُنیا کیا   ہے مزدوروں کی ملکیت یہ دُنیا کیسا وہ دُنیا کیا

~~~~~~~~

کاش یوں ہموار ہو جائے زمانے کا نظام   کر سکیں اہلِ جہاں اک دُوسرے کا احترام

~~~~~~~~

میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ عدمؔ کی شاعری آرٹ کی ترجمان ہے۔ لیکن یہ بہتر ہو گا۔ کہ میں آرٹ کے اِس مفہوم کو ذرا واضح طور پر بیان کر دوں۔ جس کی آئینہ دار عدم کی شاعری ہے۔

آرٹ درحقیقت فن کار کے ذوقِ حُسن کا نتیجہ ہے۔ کسی شاعر کے کلام کو جانچنے کے لئے کہ وہ کہاں تک آرٹ کی ارتقائی منزلوں تک پہنچ گیا ہے۔ ہمیں شاعر کے کلام سے اُس کے ذوقِ حسن کا مطالعہ کرنا ضروری ہو گا۔ اگر شاعر کا ذوقِ حسن پست ثابت ہو گا۔ تو یقیناً اُس کے کلام میں بھی وہی پستی ہو گی اور اگر شاعر کا ذوقِ حسن بلند اور رفعت پرور ہو گا۔ تو یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ شاعر کا کلام بھی یقیناً بلند ہے۔ کیونکہ آرٹ کو ایسی غیر ضروری تفاصیل سے کوئی تعلق نہیں۔ جو تخلیقِ حُسن کے منافی ہوں۔ اور جن میں کوئی بلیغ اور رومان خیز تخیّل آفرینی موجود نہ ہو۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

Art is the expression of beauty.

"آرٹ تخلیقِ حُسن ہے۔ اور آرٹ خلّاقِ حُسن"

عدمؔ کی شاعری آرٹ کے اسی مفہوم کی صحیح ترجمان اور آئینہ دار ہے اُس کا ذوقِ حسن اِس قدر بلند اور اِس قدر رفعت پرور ہے کہ پڑھنے والے پر ایک گہرا اور دائمی اثر چھوڑ جاتا ہے۔ ذیل کی نظم "شب گردی" میں نہ صرف شاعر کے بلند ذوقِ حسن کا پتہ چلتا ہے۔ بلکہ اُس میں ایک بلیغ اور رُومان خیز تخیّل آفرینی بھی موجود ہے:

رات کے وقت کسی دُور کی آبادی سے
کوئی دیتا ہے بڑے پیار سے آواز مجھے   گدگداتی ہے مری طاقتِ پرواز مجھے
سحرِ شیرینیِ آواز میں کھو جاتا ہوں   نیند آ جاتی ہے مدہوش سا ہو جاتا ہوں

نیند اک اور ہی سنسار میں لے جاتی ہے! لہلاتے ہوئے گلزار میں لے جاتی ہے
جس جگہ ہیں حوادث، نہ زمانہ ہے جہاں شورشِ گردشِ ایّام فسانہ ہے جہاں
خاکداں کے غم و آلام سے آزاد ہے جو روح افروز ہے جو دلکش و آباد ہے جو
اپنی تقدیر خود انسان بناتا ہے جہاں حُسن بھی عشق کو مہمان بناتا ہے جہاں
عزتِ روح کی منزل کے نشاں اور بھی ہیں اہلِ عرفاں کیلئے کتنے جہاں اور بھی ہیں

شب کو جس وقت مرے جسم کو نیند آتی ہے
رُوح چپکے سے کسی سمت نکل جاتی ہے

مندرجہ بالا نظم سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ عدمؔ کا ذوقِ حُسن کس قدر بلند اور رفعت پرور ہے۔ اُس کی شاعری "شبابی رسوائیوں" سے بہت بالا ہے۔ اُس کی شاعری بلیغ اور عمیق معانی اور خیال و عزم کے غیر فانی پیکر پیش کرتی ہے۔ اُس کی شاعری قلب و روح میں ایک انبساطی کیف اور ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔ اُس کی شاعری منظرِ کائنات کی معنوی کیفیات اور زندگی کے وجد انگیز نظریات کی صحیح ترجمان ہے۔ عدمؔ کی شاعری اُس کے "ذوقِ نگاہ" کے طلسمی و غیر فانی رجحانات کا مطالعہ ہے۔ جیسا کہ شاعر "تشہیرِ نگاہ" کے عنوان سے خود کہتا ہے

مری نگاہ کی تشہیر ہے کلام مرا
ہے اک مرقعِ رسوائیِ دوام مرا
یہ شعر عکس ہیں صد رنگ جلوہ گاہوں کے
نقوشِ پا ہیں مری حُسن میں نگاہوں کے

فنی و تخلیقی شاعری (Artistic Poetry) کو بعض کم فہم نگاہیں اس لئے حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں کہ اس میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ حالانکہ آرٹسٹ کی نگاہ حیاتِ انسانی کے اُن پہلوؤں تک پہنچتی ہے جن کو آرٹسٹ کے سوا اور کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ چونکہ عام نظریں اس کو نہیں پا سکتیں اس لئے آرٹسٹ کی پیش کی ہوئی چیز انہیں شاعرانہ دروغ معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ شواہد و واقعات شاعر کے عینی و یقینی مشاہدہ پر مشتمل ہوتے ہیں

ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مرحوم بجنوری نے اسی نظریے کو عجیب انداز میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں

کتابِ قدرت ایک تاریک کتاب ہے جس کے اوراق پر سوائے شاعر کے کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ اس ضیاء میں ہر شے ایک نئی صورت اور نئی کیفیت میں مشاہدہ ہوتی ہے۔ لیکن روشنی شعشہ برقی کی مثال دم زدن میں غائب ہو جاتی ہے۔ اور پھر وہی ظلمت چھا جاتی ہے۔ اس روشنی میں ہر رگِ سنگ میں خونِ شہیداں اور ہر شرارِ سنگ میں جلوہ یزداں نظر آتا ہے۔ یہ کوئی شاعرانہ دروغ یا فریبِ نظر نہیں بلکہ مشاہدہ حقیقت ہے۔ جب شاعر گرد و پیش کے مناظر اور واقعات کو فوق الفطرت طور پر بیان کرتا ہے تو وہ اس کے عینی اور یقینی نظارہ پر مبنی ہوتا ہے"

عدمؔ کے نفسیاتی رنگ کے علاوہ اُس کی فطرت نگاری بھی کامیاب اور بلند ہے۔ عدم کی فطرت نگاری جوشؔ کی فطرت نگاری سے بالکل مختلف ہے جوشؔ کی فطرت نگاری اُس کی "طاقتِ مشاہدہ" Power of observation کی حامل ہے۔ لیکن عدمؔ کی فطرت نگاری میں "مشاہدات" کے ساتھ تخیل کی چاشنی بھی شامل ہے

"تصویر میں دھڑکن بھی ہے شامل مرے دل کی"

اِس لئے عدم کی فطرت نگاری میں ایک خصوصیت پیدا ہو گئی ہے جو کسی اور کے ہاں نہیں۔ ورڈز ورتھ اور شیلے کے نظریۂ فطرت میں نمایاں فرق ہے۔ حالانکہ دونوں شاعر فطرت نگار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ورڈز ورتھ کی شاعری "مشاہدات" کی حامل ہے جس کے باعث اُسے "شاعرِ مشاہدات" کہا جاتا ہے۔ لیکن شیلے کی شاعری میں جہاں "مشاہدات" ہیں وہاں تخیلی عنصر بھی شامل ہے جس کے باعث اُسے "تخیل نگار" کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اُس کی فطرت نگاری۔ یا منظر کشی کے فطری ہونے میں کسی کو انکار نہیں۔ یہی تفاوت عدمؔ اور جوشؔ کے ہاں پایا جاتا ہے اور یہ بالکل سچ ہے۔ کہ عدمؔ کی فطرت نگاری کی مثال اُس مصور کی سی نہیں ہے جو رنگوں کے امتزاج میں اپنا پورا زور صرف کر دیتا ہے لیکن اُس کی تکمیل کے جوش میں اپنے نقوش کی معنوی حیثیت "بیک گراونڈ" سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

ذیل کی نظم "بہار" اسی نظریہ کو پیش کر رہی ہے۔ اس نظم میں شاعر محض منظر نگار نہیں ہو گیا ہے۔ بلکہ نظم کے آخر میں ایک حقیقت بیان کی گئی ہے جس سے نظم میں وسعت اور بلندی پیدا ہو گئی ہے۔

ہواؤں میں خمار ہے۔ فضاؤں میں نکھار ہے جمالِ بے پناہ کا شرار بے قرار ہے
سمٹ کے رہ گئی ہے زندگی جوانیوں کی آگ میں جوانیوں کی آگ شعلہ زن ہے رنگ رنگ میں
سرودِ رقص کی صدا کہ میکدہ بدوش ہے ہر ایک ادائے زر فشاں کہ مست مے فروش ہے
لرز رہی ہے روح کے حسین نغمہ زار میں! جنون رقص کر رہا ہے دل کے تار تار میں
کچھ گم ہو رہا ہے ہوش کو بہار نے شراب میں کہ ہوش جذب ہو گیا ہے اک حسین خواب میں

نیا نیا یہ شوق اور نئی نئی جوانیاں بہار بن کے جھومنے لگیں سبھی جوانیاں
فسونِ نو بہار سے حیات رنگ رنگ ہے مگر خزاں کا خوف اک پیامِ دل خراش ہے

غمِ خزاں نہ سہہ سکے گا قلبِ مضمحل میرا
بہار میں ہی ٹوٹ جائے کاش یہ حباب دل میرا

عدمؔ کی منظر نگاری کی وہ خصوصیت جس نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ وہ اُس کی مناظر نگاری میں بیکراں حد تک موجود ہے۔ یعنی عدمؔ کسی منظر کی تصویر کھینچتے وقت اُس منظر کی غیر ضروری چیزیں پڑھنے والے پر چھوڑ دیتا ہے۔ جس سے نفسِ مضمون میں ایک اہمیت پیدا ہو جاتی ہے۔

ذیل کی نظم "تاثراتِ گورستان" میں عدمؔ نے اس چیز کو پیش کیا ہے

درد کی تصویر کھینچی ہے سکوتِ شام نے — ایک رقت خیز منظر ہے نظر کے سامنے
دُور تک پھیلے ہیں حسرت خیز قبروں کے نشاں — غرق ہیں کیفیتِ غم میں زمین و آسماں
سرآہیں چھپ کے بیٹھی ہیں سکوں کی بھیس میں — نوحہ گر ہے ایک ناطق خامشی اس دیس میں

"گورستان" کی تصویر کھینچنے کے بعد شاعر نفسِ مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہے:

آج سے دس سال پہلے یونہی وقتِ شام تھا — اور میں ناواقفِ دلدوزیِ آلام تھا
چند لوگ اس روح فرسا سرزمیں میں آئے تھے — موت کی سرگرمی میں اک جنازہ لائے تھے
میرے استفسار پر یوں مجھ کو بہلایا گیا — موت کے عقدے کو دو فقروں میں سمجھایا گیا
ہو سکا جتنا تمہارے پیار کا دم بھر گیا — اب تمہارا نوجوان بھائی خدا کے گھر گیا
آہ وہ سادہ دلی بچپن کی اب تک یاد ہے — میں نے یہ سمجھا خدا زیرِ زمیں آباد ہے

آج پہچانا نہیں جاتا وہ گم گشتہ مزار — بن گئی ہیں اُس جگہ ویسی ہی قبریں بے شمار
کس طرح معلوم ہو یہ خویش وہ بیگانہ ہے — ہر تفاوت سے بری روحوں کا ویرانہ ہے

ایک ہی روحوں کی لَے اور ایک ہی آواز ہے
موت کیا ہے؟ اجتماعی زیست کا آغاز ہے

عدمؔ جوان شاعر ہے۔ اُس کی جواں نگاریوں نے اُردو شاعری میں ایک خاص رنگ پیدا کر دیا ہے جو جدید شعراء کے لئے ایک مشعل کا کام دے رہی ہیں۔ لیکن اِس بات کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ عدمؔ کی "جواں نگاریاں" "شبابی رسوائیوں" سے بہت دُور ہیں۔ عدمؔ کے کلام میں باوجود "جواں نگاریوں" کے عریانیوں کے لئے مطلق گنجائش نہیں۔ وہ اظہارِ جذبات میں کمال سنجیدگی اور متانت سے کام لیتا ہے۔ بقول مولانا تاجورؔ

"عدمؔ کے کلام میں پاکیزگی۔ تخیل میں رفعت اور خیالات میں رعنائی ہے۔ عدمؔ نفسیات کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اظہارِ جذبات میں گداز سے کام لیتا ہے"

انہیں "جواں نگاریوں" کے باعث عدمؔ کی بعض نظموں میں کہیں کہیں غیر پختگی نظر آتی ہے لیکن اس کے باوجود انہیں نظموں میں ایک گہرائی، متانت، سنجیدگی اور وسعت پائی جاتی ہے۔

داثر صہبائی۔ بی اے

دلِ برباد

لُٹ گیا دل۔ لُٹ گیا میرا متاعِ زندگی — زندگی باقی ہے لیکن خانماں برباد ہوں
زیب پاتا تھا کبھی مجھ سے جہانِ رنگ و بو — گرچہ اب تصویرِ دردِ یاس اے صیاد ہوں
کر دیا پر کاٹ کر آزاد تو نے رحمدل — ہُوں اسیروں سے بھی بدتر نام کو آزاد ہوں
صاحبِ انصاف تو انصاف کی آنکھوں سے دیکھ — رحم کے قابل ہوں میں اور قابلِ امداد ہوں
اب تو لے دے کے مری تنہا حقیقت رہ گئی — بیکسی کی اِس جہانِ تار میں فریاد ہوں
رحم کر صیاد اب ہیں آخری لمحے نہ چھیڑ — میں بہارِ باغِ عالم کی پرانی یاد ہوں

خواجہ شجاع منعمی ایم۔ اے دھلیگ، ایم ایس سی پنجاب۔
پروفیسر صادقیہ کالج بہاولپور

ایک صبح!

سنور رہے تھے ہوا کے لطیف تر جھونکے
اُبھر رہے تھے گلوں سے بہار کے نقشے
نکھر رہے تھے بصارت نواز نظارے
بکھر رہے تھے سماعت پہ کیف زا نغمے
سُدھر رہے تھے بگڑ کر حیات کے لمحے

سسک رہی تھی مسرت میں ڈوب کر پُروا
چٹک رہا تھا بانداز خاص ہر غنچہ
مہک رہی تھی مگر چاندنی بھری دُنیا
لہک رہا تھا سُرور نشاط میں سبزہ
جھلک رہا تھا ہواؤں میں رنگ موجوں کا

گزر رہی تھی روپہلی طراوتوں سے نظر
بپھر رہی تھیں غنائی حرارتیں اکثر
ٹھہر رہا تھا شہابی تبسموں کا اثر
اُتر رہا تھا فضائی جمود عالم پر
ٹھٹھر رہا تھا جمالی حقیقتوں کا جگر

بدل رہی تھی فضائے خموش نوعیت
اُبل رہا تھا ہر اک سمت چشمۂ فرحت
مچل رہی تھی دلوں میں خلوص کی نزہت
نکل رہی تھی حد لطفِ نوم سے فطرت
بہل رہی تھی سہانے سموں سے محویت

چھُپکا چکی تھی دماغوں کو رات کی رانی
اُڑا رہے تھے دُہنا لکے الاپ کوئل کی
لٹا رہا تھا تجلی ستارۂ سَحَری
سحر نے بعد ادائے نیازِ معبودی
علی الخصوص بصد عجز یہ دعا مانگی

سکوں رہے کہ زمانے کو انقلاب رہے
ہر ایک سعیٔ میں محبوب کامیاب رہے

سحر رام پوری

حامیانِ ہندی کے جذبات و عزائم

اردو کے مخالفین جن جذبات و عزائم کے زیرِ اثر ہندی کی حمایت کر رہے ہیں وہ نہایت معاندانہ اور نفاق انگیز ہیں۔ اظہارِ حقیقت کی غرض سے بعض حامیانِ ہندی کے خیالات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ راہل سانکر تیاین گھرے فرقہ پرست اور بودھ سیاح ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ہندی اردو کا جھگڑا بہت پرانا ہے۔ درمیان میں لوگ اسے بھول گئے تھے۔ لیکن اِس سال سے پھر اس کی آواز سنائی دینے لگی ہے۔ کچھ لوگ بہت مضطرب ہیں کہ کسی طرح یہ کشاکش دفع ہو جائے۔ اگر ہندی اردو کا جھگڑا دور ہو جائے تو سب کو خوشی ہوگی لیکن اِس جھگڑے کی بنا کو بخوبی سمجھے بغیر اس کے دور کرنے کا اقدام نیم حکیم خطرۂ جان کے مصداق ہوگا۔ دراصل ہندی اردو کے جھگڑے کی بنا ہے دو تہذیبوں کی باہمی جنگ۔ ان میں سے ایک ہندوستانی تہذیب ہے جو ہندی کی حامی ہے اور دوسری غیر ملکی تہذیب ہے جس نے اپنی اصلی صورت سے بڑی حد تک مختلف ہو جانے کے باوجود ہندوستانی تہذیب سے کبھی صلح کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے پہلے تو ہندوستانی تہذیب کا نام و نشان تک مٹا دینا چاہا لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ غیر ملکی تہذیب انقطاعِ تعلق کر کے الگ ہی رہتی جب بھی اتنی تلخی پیدا نہ ہوتی۔ لیکن اس کا نصب العین ہمیشہ اپنی حریف تہذیب پر حملہ کرنا رہا جب ہندوستانی اور عربی تہذیب کا یہ تصادم گزشتہ سات سو برس سے آج تک چلا آ رہا ہے تو کسی باہمی تصفیہ کی کیا امید ہو سکتی ہے؟

بعض بھائی اپنی غیر جانبداری کا اظہار کرنے کے لئے یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ ہمیں ہندی کو نہ سنسکرت الفاظ سے بھرنا چاہئے۔ عربی الفاظ سے۔ یہ بھی شدید غلطی ہے۔ عربی ہندوستانی زبان نہیں ہے اور نہ جس زبان سے ہندوستانی زبانوں کا تعلق ہے اس سے اس کا کوئی رشتہ ہے۔ اس کے برعکس سنسکرت ہندی کا سرچشمہ ہے۔ اِس بنا پر اگر غور سے کام لیا جائے تو یہ سنسکرت کا فطری حق ہے کہ وہ ہندی کے خزانے اپنے الفاظ سے معمور کرے

(ہندی سرسوتی الہ آباد)

ڈاکٹر دھیریندر ورما ایم۔ اے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے صدر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "کانگریسیوں میں ہندی کو ہندوستانی یا آسان اردو بنانے کی جدوجہد کا مقصد خصوصی صرف مسلمانوں کے ساتھ تصفیہ کرنا ہے۔ ہندی کے

جن اداروں میں کانگرسیوں کا زور رہے وہاں کانگریس کی اِس حکمتِ عملی کا دخل ہو گیا ہے۔ ابتدا میں "ہندی ساہتیہ سمیلن" نے ہندی کی ترویج قومی یکجہتی کی وجہ سے غیر ہندی صوبوں میں کرنی شروع کی تھی۔ اِس تحریک کی قیادت جلد ہی کانگرسیوں کے قبضے میں چلی گئی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ ہندی کے نام میں تو تبدیلی ہو ہی گئی اس کی صورت میں بھی جلد ہی تغیر ہونے کا بھی پورا خطرہ ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے ساہتیہ سمیلن کی ایک کمیٹی میں یہ تجویز پیش تھی کہ سمیلن کی "قومی زبان" کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اردو رسم الخط سے واقفیت لازمی قرار دی جائے۔ اگر بورڈ کی عنان کچھ دنوں اور کانگرسیوں کے ہاتھ میں بھی رہی تو اس تجویز کو جلد عملی جامہ پہنا دیا جائیگا ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ساتھ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کی ترقی کا بھی سامان پیدا ہو جائے گا۔ اندور کی تجویز میں اس آئندہ حکمتِ عملی کی تمہید تھی۔"

(ہندی سرسوتی الہ آباد)

سنت رام بی۔ اے پنجابی معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے "ہماری قومی زبان کیسی ہو" کے عنوان سے ایک بسیط مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے ڈاکٹر دھیریندر ورما کی طرح ہندی ساہتیہ سمیلن اور اس کے اربابِ حل و عقد پر نام بنام شدید حملے کئے ہیں وہ لکھتے ہیں

"پچھلے دنوں کاکا کیلکر لاہور آئے تھے۔ مجھے بھی اُن سے ملنے کا موقع ملا وہ ہندوستان میں ایک قومی زبان اور ایک قومی رسم الخط کی ترویج کے مقصد سے دورہ کر رہے تھے۔ لاہور میں انہوں نے متعدد فضلاء سے اس مسئلہ پر گفتگو کی تھی لیکن جہاں تک مجھے علم ہے وہ کم سے کم پنجاب کے متعلق کسی فیصلے پر نہیں پہونچ سکے تھے۔ اس کے بعد اُن کا ایک مضمون کلکتہ کے ہفتہ وار وشومتر میں "قومی زبان ہندی کی ترویج کس لئے" کے عنوان سے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے پڑھنے سے اس قومی زبان کی ترویج کرنے والی جماعت کے خیالات کا نیز جس طرح کی وہ ہندی چاہتی ہے اس کا بہت کچھ پتہ چل گیا۔ کاکا جی مراٹھے ہیں۔ سنسکرت کے پنڈت انگریزی کے تعلیم یافتہ مرہٹی اور گجراتی کے اہلِ علم ہیں۔ اردو آپ نہیں پڑھ سکتے لیکن آپ کے مذکورہ بالا مضمون میں انگریزی۔ مرہٹی اور گجراتی کا تو شاید ایک لفظ نہیں بھرمار ہے صرف عربی۔ فارسی کے الفاظ کی۔ مثلاً ہرگز۔ غنیمت۔ دنیا بود۔ مدد۔ تصفیہ۔ تنگ دلی۔ فرقہ پرستی۔ ذریعہ۔ انگریزی داں۔ خطرناک چنانچہ عام فہم۔ فارسی رسم الخط۔ خاندان۔ درمیان۔ حروف عجیب و غریب۔ ہنگامہ

بزرگ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی کو قومی زبان بنانے کا واحد طریقہ حضرات ہندی میں عربی اور فارسی کے موٹے موٹے لفظوں کا داخل کرنا ہی سمجھتے ہیں۔ شاید انہیں اُمید ہے کہ اس سے مسلمان خوش ہو کر ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کو قبول کر لیں گے۔ لیکن مجھے تو ان کی یہ توقع بے بنیاد ہی معلوم ہوتی ہے

میں دوسری زبانوں کے الفاظ لینے کا مخالف نہیں۔ ان سے ہماری زبان کا سرمایہ ترقی کرتا ہے۔ لیکن ہمیں صرف وہی الفاظ لینے چاہئیں۔ جن کے مطلب کے اظہار کے لیئے ہماری زبان میں الفاظ نہ ہوں "بیدی" کے ہوتے ہوئے "لگر" کو لینا "وچاروں" "بھاؤں" "گھٹناؤں" کے ہوتے۔ "خیالات" "جذبات" اور "واقعات" "لکھنا"۔ "اکھیر" "چترو چتر" اور "لی پی" کو چھوڑ "حروف" "عجیب و غریب" اور "رسم خط" کا استعمال قطعاً غیر ضروری بلکہ نقصان رساں ہے۔ مجھے یو۔پی کا پتہ نہیں۔ لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پنجاب کے سکولوں کی لڑکیاں۔ ان فارسی۔ عربی الفاظ کو بالکل نہیں سمجھتیں۔ ان غیر ضروری الفاظ کو استعمال کرنا زبان کے خزانے کو جواہرات کی بجائے گھاس پھوس اور کوڑا کرکٹ سے بھرنے کی فضول کوشش کرنا ہے۔"

اگر عربی اور فارسی کے غیر ضروری اور گلا گھونٹنے والے الفاظ کا رٹنا ضروری ہے۔ تو انگریزی نے ایسا کونسا بڑا قصور کیا ہے؟ اسے اختیار کرنے سے تو ساری دُنیا سے تعلق قائم ہو سکتا ہے۔ عرب اور فارس سے انگریز مہذب اور طاقتور بھی ہیں۔

"ہندوؤں کے جتنے منہ اتنی باتیں ہیں۔ زبانی ڈینگ بہت ہے۔ عمل کچھ بھی نہیں۔" "ادھر مسلمان کشمیر سے راس کماری تک یک زبان ہو کر اُردو کی صدا بلند کر رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہار جیسے صوبے میں بھی اُردو عدالتی زبان ہو گئی ہے"

"یوپی میں مسلمانوں کی مستقل حکومت عرصہ تک رہی ہے۔ آگرہ۔ لکھنؤ۔ دہلی اسلام کے مرکز رہے ہیں اس لئے یوپی اُردو کا قلعہ ہے"

"اسی یوپی کی زبان کو "ہندی" "ہندی ہندوستانی" اور قومی زبان کہہ کر دوسرے صوبوں پر لادا جا رہا ہے ...... وہاں کی زبان ابھی مسلمانوں کی غلامی سے نکلنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ یہ قومی زبان کی ترویج کرنے والی جماعت۔ "جذبات" "واقعات" کے گولے اس پر پھینکنے لگی۔"

"جو عرب اور ایرانی ہندوستان میں آکر آباد ہو گئے ہیں۔ یا جن ہندوستانیوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ انصاف اور حب وطن کا تقاضہ ہے کہ وہ عربی اور فارسی کو چھوڑ کر ملک کی زبان کو اختیار کریں۔"

"عربی اور فارسی تہذیب اور زبان کی حفاظت عرب اور فارس کر رہا ہے۔ ان کی حفاظت کی فکر ہندوستانیوں کو نہیں ہونی چاہیئے ہمیں تو اپنے مذہب۔ اپنی زبان اور اپنی تہذیب کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ پس ہندی کو قومی زبان بنانے کے حیلے سے سنسکرت الفاظ کو مشکل یا برہمنی کہہ کر ان کا جو بائیکاٹ کیا جا رہا ہے۔ اس سے سنسکرت زبان اور ہندوستانی تہذیب کو شدید نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے ...... اگر ہندوستان میں ہندوستانی تہذیب کی حفاظت نہ ہو گی تو اور کہاں ہو گی؟"

"ہندوستان کی قومی زبان ہندی اور قومی رسم الخط ناگری ہی ہونے سے ملک کی فلاح ہو سکتی ہے۔ اس بات کو تسلیم کر کے ہمیں اس کی ترویج و تبلیغ میں استقلال کے ساتھ مصروف ہو جانا چاہیئے۔ آپ کی کامیابی اور قوت کو دیکھ کر دوسرے لوگ اگر ان میں جذبۂ حب وطن ہے خود آپ کے ساتھ ہو جائیں گے۔ اِس طرح منتیں اور چاپلوسیاں کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اِس طرح حامیانِ ہندی کا نظم بھی قائم نہ رہے گا اور دوسرے لوگ بھی آپ سے نہ ملیں گے۔"

(ہندی سرسوتی الہ آباد)

ہندی کے حامیوں نے اُردو کے خلاف جن جذبات و عزائم کا اظہار کیا ہے۔ ان پر تبصرہ کرنا یا ان کا جواب دینا مقصود نہیں۔ مقصود صرف اس ذہنیت کو بے نقاب کرنا تھا۔ جو ہندی کی حمایت میں کارفرما ہے۔ تاکہ اُردو کے حامی راستے کی اس پیچیدگی و پُرخاری سے بھی بے خبر نہ رہیں۔

ابو محمد امام الدین
رام نگری

فنِ تاریخ گوئی میں

ہمزہ کے اعداد

ہر ایک فن میں چند ایک ایسے اہم نکات ہوتے ہیں جن کا سمجھنا ہر ایک طالبِ فن کے لئے نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اگر ان نکات کی صداقت پر جن کے جواز میں اکابرِ فن متفق ہوں۔ حرف گیری کی جلئے یا کد و کاوش سے کام لیا جائے۔ تو اس کا نتیجہ ہمیشہ کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مترادف ہوتا ہے اور حرف گیری کرنے والوں کو ہم منکرِ فن کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں اور ان مسائل و نکات کے عدمِ جواز میں ان کی کد و کاوش ایک سراب نما تخیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ فنِ تاریخ گوئی میں ہمزہ کے بیان سے باخبر ہونا ہر ایک طالبِ فن کے لئے نہایت ضروری اور لابدی ہے۔

یائے معروف جس پر ہمزہ ہو۔ یہ یائے خواہ عربی کی ہو یا فارسی کی یا ہندی کی اس کے بیس۲۰ عدد شمار کیئے جائیں گے۔ مثلاً حضرت جلیل القدر کی ایک تاریخ ہے ع

ایک انگوٹھی ہاتھ آئی شاہ سے

۱۳۳۱ھ

یہاں آئی کے اکیس۲۱ عدد شمار کیئے گئے ہیں۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

اے جلیل اک مصرعِ تاریخ نکلا لاجواب
شاہ عثماں سے گلے ملنے کو عید آئی ہے آج

۱۳۳۴ ہجری

مصرعِ تاریخ سے لاجواب کے اعداد کم کرنے سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ جس کا اشارہ مصرعِ اولیٰ میں واضح طور سے کر دیا گیا ہے۔ یہاں بھی "آئی" کے اکیس۲۱ عدد محسوب ہوئے۔

جناب منشی شنکر سروپ صاحب مغفور شکوہ آبادی شاگرد حضرت نوح ناروی نے ناخدائے سخن حضرت نوح کے دیوان دوم طوفانِ نوح کی یہ تاریخ موزوں کی ؎

ہجری میں طبع کا سن کیا لاجواب نکلا
طوفانِ نوح سیلِ بحرِ سخن میں آئے

۱۳۴۴ھ

مصرعِ تاریخ میں دو عیب ہیں۔ ایک تو "آئے" کے گیارہ۱۱ عدد محسوب کیئے ہیں۔ دوسرے مصرعِ اولیٰ میں جو "لاجواب" کے نکلنے کا اشارہ کیا ہے۔ اس کے اعداد کم نہیں کیئے۔ لہذا تاریخ غلط ہے۔

مہاراجہ محمود آباد کی وفات حسرت آیات کی تاریخ لسان الملک حضرت ریاضؔ مغفور نے جو کہی تھی اس میں "آئے" میں دو یائے شمار کی ہیں۔ مثلاً ع

دھوم ہے دھوم خلد میں آئے سر محمد علی محمد خاں

۱۳۵۰ھ

یہ تاریخ صنعتِ منقوطہ میں ہے۔

گئے اور گئی پر جو ہمزہ ہے اس کے دس عدد محسوب کرنے لازمی ہیں۔ مثلاً فصیح الملک حضرت داغؔ نے اعلیحضرت بندگانِ عالی کی ہنمکنڈہ سے مراجعت پر یہ تاریخ موزوں کی ؎

کہو خیر مقدم کی تاریخ داغؔ
ہنمکنڈے سے آ گئے اب حضور

۱۳۰۷ھ

یہاں "گئے" کے چالیس۴۰ عدد شمار ہوئے ہیں۔

میں نے اپنی اہلیہ محترمہ کی وفات پر یہ دو تاریخیں کہی تھیں ع

(۱) جوانی میں بی بی قضا کر گئی

۱۳۵۵ھ

(۲) وہ تو بہار و لطفِ جہاں ساتھ لے گئے

۱۳۵۵ھ

یہاں "گئے" اور "گئی" میں دو یائے شمار کی گئی ہیں۔

جناب مولانا محمد یعقوب صاحب برقؔ بیاپوری عظیم آبادی نے طوفانِ نوح کی یہ تاریخ موزوں کی ؎

برقؔ لکھ دے مصرعِ تاریخِ طبع
روح پرور چھپ گئی نادر کتاب

۱۳۴۰ھ

یہاں "گئی" کے تیس عدد شمار ہوتے ہیں۔ یعنی "گئی" پر جو ہمزہ ہے، اس کا کوئی عدد نہیں لیا گیا۔ لہذا یہ تاریخ غلط ہے۔
لسان الملک حضرت ریاض کی وفات پر جناب شاکر کا مٹوی فرماتے ہیں ؎

سالِ رحلت کی ہے شاکر فکر تو کہہ دیجئے
شمعِ گل صد حیف بزمِ شاعری کی ہو گئی

۱۳۵۳ھ

یہاں بھی "گئی" کے تیس عدد محسوب ہوئے ہیں۔ یہ تاریخ "شاعر" آگرہ جولائی و اگست ۱۹۳۴ء میں طبع ہوئی تھی۔ اور مولانا سیماب نے اسے شائع کر دیا تھا۔ شاید وہ بھی "گئی" کی ہمزہ کے دس عدد نہ لینے جائز سمجھتے ہیں۔

اگر کوئی صاحب معترض ہوں کہ ہوئے، ہائے، سرائے پہ بھی ہمزہ ہے اور آئے۔ گئی۔ لائے۔ لئے۔ پیئے۔ لکھئے پہ بھی ہمزہ ہے۔ اول الذکر حروف کا ہمزہ کیوں شمار نہیں کیا جاتا۔ اور آخر الذکر حروف کے ہمزہ کے دس عدد کیوں لینے ضروری ہیں۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ ہائے سرائے اور ہوئے پر ہمزہ ہے یہ رسم الخط ہے اور گئے، لئے، لکھئے کا ہمزہ رسم الخط نہیں بلکہ یائے تحتانی کی تبدیل شدہ صورت ہے۔ اس لئے اس کے دس عدد محسوب کئے جاتے ہیں۔

تاریخ گو اصحاب کے لئے یہ نکتہ نہایت منفعت بخش ہوگا کہ جس فعل پر ہمزہ ہو اور ان کے دل میں شک پیدا ہو جائے کہ آیا یہ ہمزہ رسم الخط ہے یا یائے تحتانی کی تبدیل شدہ صورت، ان کو چاہیئے کہ جس فعل کے متعلق شک واقع ہو جائے۔ اس فعل کی ماضی مطلق صیغہ واحد غائب بنائیں۔ اگر ماضی مطلق میں یائے ہو تو بلا تکلف دو یائے شمار کریں۔ مثلاً ہمیں دیکھنا ہے کہ "لئے" پر جو ہمزہ ہے اس کے دس عدد محسوب کرنے چاہئیں یا نہیں۔ لینا مصدر سے لیا ماضی مطلق۔ "لیا" میں ایک یائے موجود ہے اور "لیا" کے آخر میں جو الف ہے یائے مجہول سے بدلا گیا ہے۔ ایک تو "لیا" میں اصل یائے ہے۔ دوسری یائے جو الف سے بدلی گئی۔ اس لئے "لئے" میں دو یائے ہیں مثلاً میر... نے اپنے لختِ جگر عزیزی ریاض احمد کی تاریخ وفات کہی تھی ؎

نغمۂ جبریلؑ سدرہ آشیاں تیرے لئے
جنتِ ضو بار کا نوری جہاں تیرے لئے

تیری مرگِ غنچگی کی تلخیاں میرا نصیب
خلد کی رنگینیں بہارِ جاوداں تیرے لئے

۱۹۳۷ء

"لئے" میں دو یائے شمار کی ہیں۔
جناب مرزا واجد حسین صاحب واقف شاگرد حضرت آسیر مرحوم نے آل انڈیا شیعہ یتیم خانہ لکھنؤ کی یہ تاریخ موزوں کی تھی ع

فطرہ بھی تو جناب یتیموں کو بھیجئے

یہاں "بھیجئے" میں دو یائے شمار کی ہیں اور یہی درست ہے۔ جناب دلکش عدنی اپنے استاذ حضرت جمیل وارثی کی وفات پر فرماتے ہیں ؎

وہ جمیل وارثی بھی چل بسے
جن کی لے دلکش عدن میں دھوم تھی
موت کی تاریخ ہاتف نے کہا
نیک تھا لکھئے جمیل وارثی

۱۳۵۱ھ

اس قطعہ تاریخ میں عیب شتر گربہ ہونے کے علاوہ لکھئے میں ایک یائے شمار کی گئی ہے۔ جو سراسر معیوب اور غلط ہے۔ یہ تاریخ بھی "شاعر" آگرہ جون ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی تھی۔
حضرت جلیل کی ایک تاریخ ہے فرماتے ہیں ع

گھڑی توڑا بٹن سونے کے اپنے شاہ سے پائے

۱۹۱۲ء

حضرت جلیل نے "پائے" کا ہمزہ شمار کیا ہے اور اس کے دس عدد لئے ہیں۔ لیکن حضرت داغ مغفور "پائے" کا ہمزہ شمار نہیں کرتے چنانچہ امیر مینائی رہ کی وفات پر فرماتے ہیں ؎

ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی
قصرِ عالی پائے جنت میں امیر

۱۳۱۸ھ

معلوم ہوتا ہے کہ پائے۔ آئے۔ لائے وغیرہ جب بروزن فاع ہوں تو ایک یائے اور جب بروزن فعلن ہو تو دو یائے شمار کرنی لازمی ہیں۔ جہاں یائے کا اشباع ہو۔ اس کے عدد لئے جائیں گے۔ اور جہاں اشباع نہ ہو وہ نظر انداز کر دینی چاہیئے۔ مثلاً حضرت منیر کی ایک تاریخ ہے ع انگشترِ زمرد پاکیزہ آئی آج

۱۲۸۲ھ

یہاں "آئی" کے گیارہ عدد محسوب کئے ہیں اور ایک اور جگہ ع

چھٹی کمالِ شکوہِ شہانہ سے آئی

۱۲۸۲

یہاں اکیس[۲۱] عدد شمار کئے ہیں۔ یہاں بھی فاع اور فعلن کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ حضرت داغ کے ہاں پائے بروزن فاع ہے اس لئے جو اس کے تیرہ عدد لئے گئے ہیں۔ اسی رواج پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ کتابت کا خیال چھوڑ کر تلفظ پر اعتبار کرنا فن تاریخ گوئی کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کرنا ہے۔ جب حرف مشدد میں تلفظ پر اعتبار نہیں کیا جاتا اور صرف ایک حرف شمار کیا جاتا ہے۔ واوِ معدولہ کے عدد لئے جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ تلفظ سے خارج رہتی ہے۔ پھر فاع اور فعلن کے وزن کا خیال رکھنا یعنی پائے جب بروزن فاع ہو تو تیرہ[۱۳] عدد شمار کرنا کسی طرح قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتا۔ ہاں "پائے" عقل میں پاے کے تیرہ عدد ہی محسوب ہوں گے۔

حاجی سرحدی نے شاطر امرتسری کی وفات پر یہ تاریخ کہی تھی ع

شاطرِ نادرجہاں نے مات کھائی موت سے

۱۹۲۶ء

"کھائی" میں دو یائے ہیں اور حاجی صاحب نے ان کے بیس[۲۰] عدد شمار کئے ہیں۔ لہذا تاریخ درست ہے۔

حضرت جلیل قبلہ نے اپنے استاد حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر ذیل کا قطعہ موزوں فرمایا ؎

جلیل نے سرِ بزمِ عزا یہ پوچھا آج
وہ کون تھے جنہیں روتے ہیں سارے شیدائی
پڑھا جواب میں اُٹھ کر یہ ایک نے مصرع
امیرِ کشورِ معنی امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۱۸ھ

"مینائی" پر جو ہمزہ ہے اس کے دس عدد محسوب کئے گئے ہیں اور یہی درست ہیں۔

منشی وجاہت حسین صاحب وجاہت جھنجھانوی نے مصباح القواعد کی تاریخ کہی ہے ؎

کریگی چار سو عالم میں ظاہر
نئے انداز مصباح القواعد

۴×۴۷۶   ۱۹۰۴ء

یہ تاریخ نئے انداز کی ہے اور یہ طرز منشی حبیب حسن وحشی دیوبندی کے اس مشہور قطعۂ تاریخ سے لی گئی ہے جو انہوں نے حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ کے دیوان خمخانۂ عشق کی طبع پر کہی تھی۔ فرماتے ہیں ؎

یہ آنے لگی چار سو سے صدا
نیا ہے کلام جناب امیر

۴×۴۷۴   ۱۸۹۶ء

جناب وجاہت کی تاریخ نہایت قابلِ قدر ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے "نئے" کے ساٹھ عدد شمار کئے ہیں۔ حالانکہ "نئے" پر جو ہمزہ ہے اس کے بھی دس[۱۰] عدد محسوب کرنے لازمی تھے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو افادۃ التاریخ حضرت جلال صفحہ انتیس[۲۹] فرماتے ہیں۔ لئے، گئے، نئے گئے کی یائے مجہول کے بیس عدد لئے جائیں گے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ نیا میں ایک یائے موجود ہے اور "نیا" کے الف کو یائے مجہول سے بدل دیا گیا۔ ایک تو "نیا" کی ذاتی یائے اور دوسری یائے مجہول جو الف سے بدلی گئی۔ لہذا "نئے" میں دو یائے ہیں۔ اس لئے وجاہت صاحب کی یہ تاریخ درست معلوم نہیں ہوتی۔ نے اور نئے کی کتابت میں جو فرق ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ "نے" بروزن فا یا فع ہے اور "نئے" بروزن مفا یا صلا۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ "نئے" پر جو ہمزہ ہے یہ یائے تمنائی ہے اس لئے اس کے دس[۱۰] عدد محسوب نہ کرنے معیوب ہیں۔ میری اہلیہ محترمہ کی وفات حسرت آیات پر حضرت جلیل قبلہ نے یہ قطعۂ تاریخ موزوں فرمایا ؎

نیک دل خاتونِ کسریٰ تھیں جو آہ!
دہر سے رخصت وہ معصومہ ہوئیں
سال ہے یہ ان کی رحلت کا جلیل
داخلِ فردوس مرحومہ ہوئیں

حضرت جلیل قبلہ نے "ہوئیں" پر جو ہمزہ ہے اس کا کوئی عدد نہیں لیا۔ یہ ہمزہ رسم الخط ہے۔ اسی طرح ہوئے اور ہوئی کا ہمزہ بھی رسم الخط ہے۔ اس کا بھی کوئی عدد محسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ مثلاً حضرت داغ فرماتے ہیں ع

معتمد صاحب ہوئے زیبا خطاب

۱۳۰۸ھ

یہاں "ہوئے" کا ہمزہ نہیں لیا گیا۔ جناب ہاشمی نے حرم سرا مصنفہ لسان الملک حضرت ریاض مرحوم کی یہ تاریخ موزوں کی۔

ہاشمی عیسوی کہو تاریخ
دوسری جلد مشتہر ہوئی خوب

یہاں بھی ہوئی کا ہمزہ شمار نہیں کیا گیا اور یہی درست ہے۔

حضرت احسن مارہروی کے شاگرد جناب شیدا نے طوفان نوح کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں "ہوئی" کی ہمزہ کا ایک عدد محسوب کیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ ع

شہرت ہوئی جہاں میں یہ طوفانِ نوح کی

۱۳۴۱ھ

سرائے، ہائے، لیئے، گھبرائے وغیرہ میں ہمزہ کا کوئی عدد محسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ ہمزہ رسم الخط ہے۔ مثلاً منشی حیات بخش صاحب فرحت کی ایک تاریخ ہے ع

رفت از سرائے فانی با عالمِ بقا

۱۳۴۶ھ

سرائے کا ہمزہ اُنہوں نے شمار نہیں کیا۔

مولوی عبدالغفور صاحب کامل عظیم آبادی نے اپنے خواجہ تاش شاطر کی وفات پر تاریخ کہی ہے اس میں ہائے کی ہمزہ کا کوئی عدد نہیں لیا گیا۔ مثلاً

سالِ فصلی از سر افسوس ہے
ہائے ہائے شاطرِ بیکنٹھ باش

۱۳۳۳ ف

مصرع تاریخ فن تاریخ کے لحاظ سے تو درست ہے لیکن اس میں ایک عروضی غلطی ضرور ہے۔ ہائے بروزن فاع درست ہے بروزن فعلن معیوب ہے۔

مصرعِ تاریخ میں دوسرا ہائے بروزن فعلن ہے ہائے کی یائے کا اشباع سراسر غلط اور معیوب ہے۔

حضرت ریاض مغفور کی وفات کی تاریخ کسی مشہور شاعر کا یہ شعر ہو جاتا ہے

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید
ز جام دہر مئے کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَان

۱۹۳۴ء

یہاں "مئے" کا ہمزہ شمار نہیں کیا گیا۔

ملک الشعراء حضرت جلیل کی ایک تاریخ ہے۔

ع گرہ کشائے زمانہ ہے شہ کی سالگرہ

کشائے کا ہمزہ شمار سے باہر ہے۔ مثلاً حضرت جلال مغفور نے گلزارِ داغ کی تاریخ (بوئے گلزارِ داغ آئی آج) اور اپنے تذکرہ کی تاریخ (سراپا ء بے مثل مطبوع شد) میں بو اور سراپا کی یائے مجہول جو اضافت ظاہر کرنے کے لیئے رسم الخط میں شامل ہے شمار نہیں کی اور اس کی جگہ دانستہ ہمزہ لکھ دیا ہے۔ حالانکہ تمام اکابرِ فن نے اس کے دس عدد محسوب کیئے ہیں۔ ایک اور مثال ہے ع

احیاءِ سخن چو کرد یحییٰ جاں داد

۱۰۶۴

یہاں ہمزہ کو قائم مقام الف سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ مگر حضرت تسلیم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا قول یہ ہے کہ در فارسی ہمزہ کہ نگارند ہمزہ لبعد الف مے آید عوض آں یائے تحتانی مے نگارند قاعدۂ عربی در فارسی جاری کردن خود را عاری کردن است طبع حق پسند چگونہ خواہد پذیرفت یہ قول سو فیصدی درست معلوم ہوتا ہے۔ اردو اور فارسی دونوں کا رسم الخط یہی ہے کہ الف اور واؤ کے ساتھ اضافت آئے تو یائے مجہول لکھ دیتے ہیں۔ اس لئے اس کے دس عدد شمار کرنا لازم تر ہے۔

حضرت احسن مارہروی نے جانِ سخن کی تاریخ موزوں کی

تاریخ کیا نمود کی احسن نے کی رقم
جانِ سخن نمائشِ طبعِ جلیل ہے

۱۳۳۴

جناب صفا تلمیذ حضرت امیر مینائی نے تاج سخن کی یہ تاریخ کہی

مصرعِ تاریخ تم لکھو صفا
لائقِ محبوب ہے تاجِ سخن

اسی دیوان کی عابد سہسوانی نے یہ تاریخ کہی

سالِ طبع او طلب کردم ز فکرِ خویشتن
گفت دل مطبوع شد شائستہ تصنیفِ جلیل

۱۹۱۰ء

جناب اختر تلمیذ حضرت داغ مغفور طوفان نوح کی طبع پر فرماتے ہیں

قلم برداشتہ تاریخ ہجری
لکھی اختر نے مرغوبِ طبائع

۱۳۴۰

جناب صفا قادری شاگرد حضرت جلال نے خم خانۂ جاوید کی دوسری جلد کی یہ تاریخ موزوں کی ؎

صفا پرسید سالش گفت ہاتف
کہ ایں گلشن شگفتہ دائما باد

۱۳۲۹ھ

مذکورہ بالا مصرع ہائے تاریخ میں نمائش، لائق، شائستہ، طبائع، دائما میں جو ہمزہ ہے اس کے دس دس عدد شمار کئے گئے ہیں۔ اسی طرح سائل۔ مائل۔ جائز۔ غائب۔ عجائب۔ غرائب میں بھی ہمزہ کے دس عدد شمار کرنے چاہئیں۔

حضرت احسن مارہروی نے طوفانِ نوح کی جو تاریخ موزوں فرمائی ہے اس میں ایک نہایت باریک نکتہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

فکر سے ملی ہیں در تاریخ احسن مل گیا
کشتیٔ طبع رواں ہے مبدءِ طوفانِ نوح

۱۳۴۰ھ

یہاں مبدء کے آگے جو ہمزہ ہے اس کا ایک عدد لیا ہے اور یہ درست ہے۔

حضرت ناسخ کی وفات پر حضرت رشک مرحوم نے جو تاریخ موزوں فرمائی ہے۔ اس میں لکھنؤ پر جو ہمزہ ہے اس کے چھ عدد لئے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

اٹھا مرگِ ناسخ کا غل چار سو سے
گیا لطف تحقیق کا گفتگو سے
کہا رشک نے مصرعِ سالِ رحلت
وفا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے

گوئی کے ہمزہ کے دس لئے ہیں اور لکھنؤ کے ہمزہ کے چھ عدد شمار کئے ہیں۔ جس طرح یائے معروف جس پر ہمزہ یعنی خط معنی ہو کے بیس عدد لیتے ہیں۔ اسی طرح واوِ معروف جس پر ہمزہ ہو اس کے بارہ عدد محسوب کرنے چاہئیں۔ جیسا رشک مغفور نے مذکورہ مصرع میں "لکھنؤ" کا ہمزہ شمار کیا۔ حضرت نوح ناروی جانشین حضرت داغ مغفور کی ایک تاریخ ہے جو انہوں نے حضرت جلال مرحوم کی وفات پر کہی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بزمِ جہاں سے اٹھ گئے پہلے امیر خوش بیاں
بعد امیر کے بجھا داغ کی زیست کا چراغ
تیسرے تھے جلال بھی وہ بھی یہاں سے چل بسے
ہاتفِ غیب نے کہا، آؤ جلال امیر داغ

۱۳۲۷ھ

یہاں "آؤ" کے ہمزہ کا کوئی عدد نہیں لیا گیا۔ "آؤ" تیرہ[۱۳] عدد لینے ضروری تھے۔ مگر سات لئے گئے۔ جس طرح "آئے" میں دو یائے ہیں اسی طرح "آؤ" میں دو واؤ ہیں۔

کسریٰ منہاس
مدیر ساربان - لاہور

غزل

دنیا! ترا وجود بھلائے ہوئے ہیں ہم
پھر اُن کے ہر فریب میں آئے ہوئے ہیں ہم

پھر غرقِ بیخودی ہے خیالِ جنوں نواز
پھر زندگی کو کیف بنائے ہوئے ہیں ہم

پھر رفتہ رفتہ ہونے لگے ہیں وہ ملتفت
پھر دوستی کی آس لگائے ہوئے ہیں ہم

خلوت، کنارِ جو، شبِ ماہتاب و بادِ سحر
کیا کیا تصورات میں لائے ہوئے ہیں ہم

فرصت نہیں کہ جانبِ کونین ہو نظر
اُس شوخ سے نگاہ ملائے ہوئے ہیں ہم

احوالِ عشق ہوش میں آئیں تو کچھ کہیں
آواز دو کہ ہوش پہ چھائے ہوئے ہیں ہم

اختر چکوالی بی۔ اے

والدِ مرحوم کی قبر پر

جھٹ پٹے کا وقت گورستان کا منظر اداس　　بیکسی، ویرانیاں، افسردگی، خوف و ہراس
نیم کے کچھ خشک پتّے جا بجا بکھرے ہوئے　　قبر کے ٹوٹے ہوئے تختے کہیں نکلے ہوئے
خاک کے کچھ ڈھیر، کچھ بیٹھی ہوئی قبروں کے غار　　منتشر ڈھیلوں کی پگ ڈنڈی پہ چیونٹوں کی قطار
بکریوں کے گھاس چرنے کے نشاں اُبھرے ہوئے　　پائمالی کے فسانے خاک پر لکھے ہوئے
ٹھیکرے، ٹوٹی ہوئی اینٹیں، خزاں دیدہ درخت　　ٹہنیوں کی جنبشیں دیتی ہیں آوازِ کرخت
کوئی کتبہ ہے نہ کوئی امتیازی ہے نشاں　　ایک دُنیا خاک میں گمنامیوں کی ہے نہاں

موت کی پرچھائیاں ہیں اور سوادِ شام ہے
خاک کے کچھ ڈھیر ہیں باقی خدا کا نام ہے

دیکھ کر اک قبر کو آنکھوں میں آنسو آ گئے　　جسم میں لرزا ہوا پیدا قدم تھرّا گئے
سامنے آنکھوں کے اک رنگین[1] صورت آ گئی　　قبر کے اوپر محبت ہی محبت چھا گئی

میں کہ آزردہ بہت ہوں کلفتوں کے جال سے
داستانِ دل سُنا ڈالی زبانِ حال سے

---

[1] والدِ مرحوم کی عمر وفات کے وقت باسٹھ (۶۲) سال کی تھی۔ مگر آپ کا چہرہ حسین و سیع جھلکیوں کا آئینہ دار تھا۔ (ماہر)

جس کی خاطر آپ کے تھے دیدہ و دل فرشِ راہ
آج اُس بیکس کی اس دُنیا میں حالت ہے تباہ

آپ لکھتے تھے جسے "نورِ نظر، جانِ پدر"
آج اُس کی تنگ حالی سے ہے دُنیا بیخبر

جس کی ادنےٰ سی اذیت آپ کو تھی ناگوار
آج اُس بدبخت کا ناگفتنی ہے حالِ زار

جس کی راحت کیلئے صدمے اُٹھائے آپ نے
جس کو سونے کے نوالے تک کھلائے آپ نے

آپ کے دل کی خلش تھی جسکے تلوے کی خراش
آج اُس کا شیشۂ دل ہے غموں سے پاش پاش

آپ کو ہاں آپ کو جس کی جُدائی شاق تھی
آج وہ ہے اور پیہم ٹھوکریں پردیس کی

آپ کی لختِ جگر یعنی مری بیوہ بہن
سی رہی ہے غم کے ہاتھوں، آپ ہی اپنا کفن

آپ کا مسرورؔ[۱] ہے جورِ مصیبت کا شکار
آپڑا ہے اُس کے نازک دوش پر کنبہ کا بار

دیکھتے ہی دیکھتے سر پر مصیبت آگئی
آپ کیا رخصت ہوئے ہم سے، قیامت آگئی

وہ مری ضدّی طبیعت، وہ مرا نازک مزاج
آپ کی وہ درگزر کرنے کی عادت ہائے، ہائے

وہ طریقے خاص میری تربیت کے واسطے
باتوں باتوں میں وہ اندازِ نصیحت ہائے، ہائے

وہ مرے ہنستے ہوئے چہرے پہ نظریں پیار کی
اور وہ دانستہ اخفائے محبت ہائے، ہائے

گلستاںؔ[۲] کی شرح، اور اُس پر وہ رنگیں حاشیے
وہ تبسم اور وہ شیریں عبارت ہائے، ہائے

دوسروں کے سامنے میری ذہانت کا بیاں
اور میرے سامنے میری شکایت ہائے، ہائے

---

[۱] میرا چھوٹا بھائی +
[۲] شیخ سعدی کی مشہور تصنیف +

ایک جانِ ناتواں اور غم کی یورش حیف! حیف! ایک نازک دِل پہ اور بارِ مصیبت ہائے، ہائے
اہلِ دولت، صاحبانِ ذوق، اربابِ کرم اُن کے الطاف و نوازش کی حقیقت ہائے، ہائے

ہر طرف غم کی فضا ہے دیس یا پردیس ہو
چھین لی ماؔہر سے دنیا نے مسرّت ہائے ہائے

آپ کا مسکن جہاں ہے، آپ رہتے ہیں جہاں کیا وہاں پر بھی ہے کوئی خطۂ ہندوستاں
کیا وہاں بھی کوڑیوں کے مول بکتا ہے کمال کیا وہاں بھی ہو چکا ہے آدمیّت کا زوال
کیا وہاں بھی ہے اسی صورت غلامی کو فروغ کیا وہاں بھی کام کرتا ہے سیاست کا دروغ
کیا ہوا کرتا ہے واں بھی فرقہ وارانہ فساد کیا وہاں کے لوگ کہتے ہیں "غلامی زندہ باد"
کیا وہاں بھی سیم و زر کے سامنے جھکتے ہیں سر کیا وہاں بھی آگ سے تنکے نہیں کرتے حذر
کیا وہاں فاقہ کشی کا نام ہے عیش و فراغ جل رہا ہے کیا وہاں بھی اہلِ دولت کا چراغ
کیا لکھا کرتے ہیں واں تعویذ میں "والتّین" کو کیا وہاں کے مولوی بھی بیچتے ہیں دین کو
کیا وہاں اُونچی عباؤں پر ہے تقوے کا مدار کیا وہاں بھی داڑھیاں کرتی ہیں انساں کا شکار

جس طرح ممکن ہو اس گُتھّی کو سُلجھا دیجئے
اِس دِلِ بیتاب کی تسکین فرما دیجئے

ماؔہر القادری

تنویرات

مغربی مصنفین اور اہل قلم کے معاوضے

داستان حمزہ، طلسم ہوش ربا اور اسی قسم کی اور بہت سی قصّوں کی کتابیں مروج ہیں۔ جن کو عجوبہ پسند لوگ بڑے ذوق اور دلچسپی سے پڑھتے سنتے ہیں، لیکن غور کیجیئے تو آج اہل مغرب کا ہر شعبہ زندگی غلام اور تہی مایہ ہندوستانیوں کے لیئے داستان حمزہ اور طلسم ہوش ربا وغیرہ سے بھی زیادہ تعجب خیز و حیرت انگیز ہے، ہمیں یقین نہیں آتا کہ ہم اہل مغرب کے متعلق جو کچھ پڑھتے اور سنتے ہیں وہ واقعات ہیں، وہ ہمارے احوال و کوائف کے مقابلے میں فرضی افسانوں سے بھی زیادہ عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں ٭

ہندوستان میں کتنے مصنف اور ادیب ہیں جن کو اپنی بہترین تصانیف سے ایک پائی کا فائدہ نہیں ہوتا، ان کی قابل رشک کامیابی یہی ہے کہ ان کی کتابیں طبع ہو کر پبلک میں آجاتی ہیں، ورنہ ایسے مصنف بھی ہیں جن کی تصنیفات گوشۂ گمنامی میں پڑی کیڑوں کی خوراک بن رہی ہیں، ان کے چھپنے اور پبلک کے سامنے آنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا، ہندوستان میں ایسے افسانہ نگار اور مضمون نویس بہت کم ہیں جن کو معاوضہ ملتا ہو اور جنہیں معاوضہ ملتا بھی ہے، وہ اس قدر کم ہوتا ہے کہ اسے مزدوری کہنا زیادہ صحیح ہے۔ ان کے مقابلے میں مغربی مصنفین کے معاوضے ملاحظہ فرمایئے اور بتایئے کہ یہ آپ کے لئے ہوش ربا اور حیرت افزا ہیں کہ نہیں ٭

امریکہ کا ایک اخبار مسٹر لائڈ جارج کو ان کے مضامین کا معاوضہ ایک پونڈ فی لفظ کے حساب سے دیا کرتا تھا، اور ایک روزنامہ نے ان کی خود نوشت سوانح عمری کے معاوضے میں انہیں بیس ہزار پونڈ دیئے تھے ٭

لیڈی آکسفورڈ کو اپنی خود نوشت سوانح عمری سے ڈھائی ہزار پونڈ کی آمدنی ہوئی تھی۔ ولرو گر فلم اسٹار جرنلسٹ ایک لفظ کے لئے دو پونڈ لیا کرتا تھا جے بی پرسٹلے کو فلم کتاب اور ڈرامے سے ستّر ہزار پونڈ کی یافت ہوئی ٭

نیول کاورڈ ایک مقبول ترین اہل قلم ہے جس زمانے میں اس کا تصنیف کردہ ڈراما "کیول کیڈ" تھیٹر میں کھیلا جا رہا تھا، تو وہ اس کا معاوضہ ۶۵۰ پونڈ فی ہفتہ لیتا تھا۔ "برسویٹ" نامی ڈرامے سے ۔ ۴۰ ہزار پونڈ کی یافت ہوئی تھی، اس کی سالانہ آمدنی کی اوسط پچاس ہزار پونڈ ہے ٭

ایک جرمن مصنف نے جس کا نام ابریج ماریا رامرک ہے "مغربی سرحد پُر فریب ہے" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کتاب سے اس کو پچاس ہزار پونڈ کی آمدنی ہوئی تھی ٭

کارمنن اور ڈینگپ مختصر افسانہ لکھنے میں خاص امتیاز و شہرت رکھتے ہیں، یہ دونوں ایک افسانے کا معاوضہ ڈیڑھ سو پونڈ لیتے ہیں، آپ خیال فرماتے ہونگے کہ جب وہ اتنا گرانقدر معاوضہ لیتے ہیں، تو انہیں افسانوں کے لکھنے میں غیر معمولی کاوش و دماغ پاشی بھی کرنی پڑتی ہوگی۔ لیکن واقعہ آپ کے قیاس کے خلاف ہے، وہ دو تین گھنٹے کے اندر ایک افسانہ تیار کر لیتے ہیں ٭

مائیکل ارمن ایک افسانہ نگار ہے، پبلشر کے ساتھ اس کا معاہدہ ہے کہ اس کا افسانہ شائع ہو یا نہ ہو، وہ ایک افسانہ کے عوض نو سو پونڈ وصول کر لیا کرے گا ٭

امریکہ کا ایک جرنلسٹ جس کا نام ہربرٹ این کاسن ہے، ایک مضمون کا معاوضہ ڈھائی سو پونڈ لیتا ہے ٭

ایچ جی ویلز کو اپنی تصانیف سے بیس ہزار پونڈ سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے ٭

کیا یورپین ممالک کے اہل قلم اور مصنفین کے مقابلے میں ہندوستانی ادباء اور انشا پردازوں کی یاس و نامرادی ہندوستان کی محکومیت غلامی کی منت پذیر نہیں ؟ کیا ہندوستان میں بھی کبھی وہ دَور فرخ و سعید آئیگا۔ جب ہندوستانی ادیب و مصنف بھی اپنی دماغ سوزی و جگر کاوی کا پورا پورا معاوضہ پا سکیں گے ٭

عہد حاضرہ کا سب سے بڑا نامہ نگار

مسٹر ڈیب عہد حاضرہ کا سب سے بڑا نامہ نگار ہے، وہ دنیا کے

چاروں براعظموں پر ہونے والی چھ جنگوں میں شریک ہو چکا ہے اور ہوائی جہاز کے ذریعے ڈیڑھ لاکھ میل کا سفر کر چکا ہے۔ آج تمام دنیا میں اس کے پایہ کا کوئی نامہ نگار نہیں۔

مسٹر ویب نے گذشتہ مارچ میں اپنی ہنگامہ خیز سوانح عمری شائع کی ہے جس کا نام ہے "میں نے کہیں امن نہیں دیکھا" اپنے وسیع ترین مشاہدات و معلومات کے ذریعہ اس نے بتایا ہے کہ دنیا کے کون کون سے مدبر اور سیاست دان دنیا کی خونریزی و بدامنی اور جنگ و پیکار کے ذمہ دار ہیں، اور کن کی وجہ سے خون آشامی اور فساد کا بازار گرم ہے۔

مسٹر ویب کی سوانح عمری کا وہ حصہ جو اس کے ذاتی احوال و کوائف سے تعلق رکھتا ہے، ہمارے ترقی پسند نوجوانوں کے لئے ایک روشن اور جلی درس حیات ہے۔ ویب ایک مختصر سے زرعی فارم میں ایک مزدور کے ہاں پیدا ہوا۔ وہ اپنے اخلاق اور مزاج کے لحاظ سے شرمیلا اور بے ہمت آدمی تھا، اس کو بدامنی و خونریزی اور قانون شکنی سے دلی وحشت و بیزاری تھی، لیکن جب اس کے سینے میں ترقی کا ولولہ پیدا ہوا، اور اس نے عمل کے میدان میں قدم رکھا تو اپنا اخلاق، مزاج، اور اپنا سب کچھ بدل ڈالا۔ اور ہولناک سے ہولناک جنگ اور خونریزی کا مشاہدہ و معائنہ اس کے لئے کھیل بن گیا۔

مسٹر ویب اپنی ترقی اور کامیابی کے متعلق لکھتا ہے کہ میرے آبائی پیشہ اور ماحول نے میرا جو نقشہ حیات تیار کیا تھا میں نے اسے ٹھکرا دیا اور اپنے زور بازو اور طاقت سے ایک ایسی شخصیت کی تعمیر کی جو پہلے سے بالکل مختلف تھی۔

سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ویب نے صرف کتابوں سے رہنمائی حاصل کی، یعنی کتابوں کا مطالعہ کرتے کرتے اس نے زندگی کی شاہراہ پالی، اور کامیابی کی منزل پر پہنچ گیا۔

انگلستان کی کامیاب ترین فرم

الڈوچ روڈ لون متھ جنوبی انگلستان میں کتابوں کی ایک فرم ہے جس کا نام "ہوریس جی کومین" ہے۔ اس فرم کو ۱۸۹۱ء میں مسٹر کومین نے قائم کیا تھا، فرم کے قیام کے بیس سال بعد یعنی ۱۹۱۱ء میں مسٹر ارنسٹ کوپر اس کا مینیجر مقرر ہوا، جو کتب فروشی کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔

ہوریس جی کومین، جنوبی انگلستان کی سب سے کامیاب کتب فروش فرم ہے، اس نے نہ صرف خود کامیابی و ترقی حاصل کی بلکہ برطانوی قوم میں عمدہ کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا اعلیٰ مذاق پیدا کر کے ملک و قوم کی بھی گرانقدر خدمت انجام دی۔

یہ فرم اپنی عالیشان پنج منزلہ عمارت میں قائم ہے، اس کے پاس ساٹھ ہزار کتابوں کا ذخیرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اس کا کاروبار تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور ہر ملک میں اس کے خریدار ہیں۔ اس فرم کا ایک حصہ نوادر کے لئے مخصوص ہے جو نایاب ترین علمی و فنی کتابوں سے مالامال ہے۔ اس فرم کی کتابوں کی گراں قیمتی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی کتابوں کے ایک ایک سیٹ ایک ایک ہزار پونڈ پر فروخت کئے ہیں۔

آجکل اس فرم کا انتظام و نسق ایک نوجوان کے ہاتھ میں ہے جو تجارت اور تعمیری کاموں کا ماہر کامل سمجھا جاتا ہے۔

کامیاب زندگی کی روشن مثال

مسٹر ایمڈنی پارچہ بافی کے پانچ وسیع اور کامیاب کارخانوں کا مالک ہے۔ وہ ۱۸۶۳ء میں ایک غریب مزدور کے گھر پیدا ہوا، اس نے خود ۲ شلنگ ۹ پنس فی ہفتہ کی مزدوری سے اپنی زندگی شروع کی تھی ابتدا میں وہ نصف دن کام کرتا تھا، لیکن آگے چل کر جب وہ بارہ گھنٹے روزانہ کام کرنے لگا جب بھی اس کی مزدوری ساڑھے سات شلنگ فی ہفتہ سے زیادہ نہ تھی، لیکن اس کی محنت و جفاکشی اور ترقی کے جوش و ولولہ نے اسے عروج و ارتقاء کے بام رفیع پر پہنچا دیا۔

مسٹر ایمڈنی کی کامیابی و فائز المرامی کا تمامتر امتیاز اس کی حیرت انگیز محنت شاقہ کو حاصل ہے۔ وہ سولہ سال کی عمر میں دن بھر متعدد کام کیا کرتا تھا، وہ ایک دفتر میں بک کیپر تھا، ایک کارخانہ کی صفائی کا ذمہ دار تھا، ایک فرم کے لئے ڈیزائن تیار کرتا تھا۔ خواتین کے پسند کئے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑے ان کے گھروں پر پہنچایا کرتا تھا جس گاڑی پر سوار ہو کر گاہکوں کے ہاں جایا کرتا تھا، اس کے گھوڑوں کی داشت و پرداخت خود کرتا تھا، اس سعی و جانفشانی اور عزم و استقلال کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جس کارخانے میں مزدور کی حیثیت سے کام کرتا تھا اس کا حصہ دار بن گیا۔ اس کے بعد اس نے مزید ترقی کی اور اسے کارخانے کی ڈائرکٹری مل گئی اور اسی طرح میدان عروج و ارتقاء میں گام فرسا رہا اور رفتہ رفتہ پانچ کارخانوں کا مالک ہو گیا۔

کیا ہمارے نوجوانوں کے لئے جو تعلیم پا کر نوکری کے لئے دفتروں اور کچہریوں میں مارے مارے پھرتے ہیں اور بجز یاس و نامرادی کے کوئی

گل ریزیٔ خیال

(۳)

باقیات ادیب الملک نواب خیالؔ (خلد آشیاں) کے دو جواہر پارے ہدیۂ احباب ہو چکے ہیں - میرے چند احباب نے مشورہ دیا ہے کہ مَیں ان خطوط کو کتابی صورت میں شائع کردوں - لیکن مَیں اب تک خاموش ہوں، وجہ یہ ہے مَیں ناظرین کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں ٭

یہ تیسرا خط ہے اور اس مقالہ کے ذریعہ مَیں ناظرین کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں کہ وہ خاکسار کو اپنی رائے سے مطلع فرمائیں ٭

نیز حضرت نہالؔ عظیم آبادی کی خدمت میں بصد عجز التجا ہے کہ وہ کسی طرح سے اُن خطوط کو حاصل کریں جو مرحوم واسطی نے نواب خیالؔ مرحوم کو لکھے تھے - ان خطوط کے یکجا شائع ہو جانے سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ میر انیسؔ کے کلام پر ریویو لکھنے والے کو بہت مدد ملے گی - اور ادب اُردو میں گرانقدر اضافہ کا باعث ہونگے - اگر کوئی صاحب خاکسار کو جناب نہالؔ کے پتہ سے مطلع فرمائیں گے - بیحد ممنون ہونگا ٭

سید افضال حسین شاہ آبادی - محلہ درمیانہ سادات - بنوڑ - ریاست پٹیالہ

نقل خط

کلکتہ - ۳ - جون ۱۹۱۵ء

جناب مکرم! مَیں تو سمجھا تھا کہ میرا خط آپ کو نہیں ملا - اس لئے جواب کی طرف سے صبر کر لیا تھا - بارے خدا کا شکر کہ وہ پہنچا اور آپ نے جواب دے کر انتظار کو دفع اور دل کو مشکور فرمایا!

مَیں عرصہ سے آپ کی ملاقات کا مشتاق بھی تھا - گذشتہ سال شملہ سے اُترا تو پٹیالہ کا قصد کیا کہ خلیفہ صاحب سے ملوں اور وہاں اس ضمن میں آپ سے بھی ملاقات ہو جائے - انبالہ پہنچکر جناب خلیفہ صاحب کا تار ملا کہ مہاراجہ ولایت جا رہے ہیں اور وہ اسی وقت بمبئی کے عازم ہیں - ادھر کا ارادہ افسوس کے ساتھ ملتوی کر کے مَیں پشاور چلا گیا، اور یوں آپ کی ملاقات بھی رہ گئی! اس دفعہ ستمبر اکتوبر میں پھر شملہ کا قصد ہے اور کیا عجب کہ وہاں سے اُتر کر پٹیالہ کا عزم کروں - خدا اس امید کو پورا کرے اور آپ سے ملاقات کی آرزو بر لائے ٭

میری "نوابی" کا زیادہ اثر آپ نہ لیں اور سمجھتے رہیں کہ ایک طالب علم سے مخاطب ہوں! اس احدی خطاب کے نہ کبھی لائق تھا اور نہ اب ہوں - مگر زمانہ نے جہاں اور بہت سی بدقسمتیوں میں پھنسایا اور الجھایا وہاں یہ ناکردہ گناہ اس مصیبت کا شکار بھی ہو گیا ٭

خیر --- انیس کے متعلق تو کیا کچھ جی نہیں چاہتا مگر افسوس کہ زمانہ کی نیرنگیوں نے خانہ خستہ کر کے اس راہ میں دو قدم بھی اب تک چلنے نہ دیا - اُن کے کلام پر جو تنقید و نظر آپ چاہتے ہیں وہ آسان نہیں اور جب تک انہی کی طرح مجمع کمالات کوئی شخص نہ پیدا ہو، دو حرف بھی نہیں لکھ سکتا - پھر بھی ایک کوشش مَیں نے کی ہے اور شہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" پر ایک غائر نظر ڈالی، اور اس کی حتے الوسع تفسیر و تشریح کر چکا ہوں لیکن ختم کرنے کے بعد احساس ہوا کہ اس دفتر کو پڑھے گا کون؟ یہ خیال آتے ہی دل سیر بلکہ برگشتہ ہو گیا، پھر آگے ہمت نہ پڑی - اگر آپ اُسے ملاحظہ فرمانا چاہیں تو میں بعض بندوں کی تفسیر مسودہ سے نکال کر بھیجدوں - تاریخ واقعہ کربلا کا لکھا جانا بھی ضروری ہے جس کے بغیر انیس کے مرثیہ کا سمجھنا آسان نہیں - اور مَیں اُسے انشاءاللہ لکھونگا، اور ضروری باتیں بھی مقدمہ میں ہونگی - ہتھیاروں کے نام - ان کی تصویریں، جنگ کے متعلق وہ باتیں جو مرثیہ میں آئیں، اور پھکیتی کے کرتب (جو گویا اب مفقود ہو چکے!) سب کا بیان ہوگا - گھوڑے کی تصویر اور اس کے ان مقامات کی تشریح جو مرثیے میں آئے ہیں سب کو بتاؤنگا - اسی طرح دیگر امور جو ضمنی مگر ضروری ہیں سب انشاءاللہ درج ہونگے اور بغیر ان چیزوں کے کلام انیس کا اب شائع ہونا زمانہ کی ضرورت اور مانگ کے موافق ہرگز نہیں ہو سکتا، اور اس پر ہماری خاص نظر ہے -

مَیں شاید قبل لکھ چکا ہوں کہ جس طرح بلا تشبیہہ کلام مجید کو اس وقت تک کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا جب تک کل کتب آسمانی پر اُس کی غایر نظر نہ ہو اسی طرح کلامِ انیس کی خوبصورتی و بزرگی اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتی جب تک تمام اگلے پچھلے مراثی یکجا کر کے سامنے نہ ڈال دئے جائیں اور اس ارتقا کو نہ دکھایا جائے۔ واقعی انیس کی تکمیل اس کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی یہی سبب تھا کہ مَیں سب کے قبل اس طرف جھکا اور پرانے مرثیوں کے شیوع پر آمادہ ہوا۔ مَیں اس کے لئے کچھ قبل سے تیار ہو رہا تھا، مگر اب مستعد ہی ہو گیا ہوں اب تک تقریباً چالیس مرثیہ گویوں کے نام اور بیس سے اوپر کے حالات معلوم ہو گئے اور پندرہ سے زیادہ حضرات کا کلام بھی مل گیا ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کامیابی کی امید ہے۔ پُرانے مراثی کا ایک اچھا ذخیرہ انڈیا آفس کے کتب خانے اور برٹش میوزیم میں بھی ہے۔ اسی لالچ میں گذشتہ سال میں یورپ جا رہا تھا کہ یکایک جنگ چھڑ گئی اور بمبئی سے ناکام لوٹ آیا۔ خیر! اس کے لئے دوسری سبیلیں کی ہیں اور کر رہا ہوں ۔

دلہی شبلی جو کچھ اس بارے میں کر گئے اس کو غنیمت سمجھتا اور اس کی داد دینا چاہئے۔ مگر مرحوم میں ایک سخت عیب یہ تھا کہ وہ زیادہ تر اپنی جولانئے طبع پر بھروسہ کرتے تھے۔ انیس کے کلام کو بھی انہوں نے پڑھا کم اور لکھا زیادہ! یہ عیب ان کی ہر تصنیف میں ہے مگر موازنہ میں بہت زیادہ۔ تا کہ صاحب نظر کو کھٹکتا ہے۔ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کی بھی کوئی تاریخ وہ نہ بنا سکے اور بقول آپ کے اس کو ایک سانس میں ادا کر گئے۔ بہرکیف انشاء اللہ اس معاملہ میں آپ فقیر کی محنت و تلاش کی داد دینگے۔ ہمارا خیال ہے کہ نظم اردو میں غزلوں سے پہلے مرثیے کی بنیاد پڑی اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا کہ اظہارِ غم، اظہارِ خوشی و عیش و طرب پر ہمیشہ مقدم رہا ہے۔ ولی کو تذکرہ نویسوں نے سُنّی المذہب لکھا ہے۔ لیکن تاسی (ایک فرنچ تذکرہ نویس ہے۔ جو ۱۸۳۰ء میں یہاں آیا اور عرصہ تک رہا) اُس نے خبر دی کہ بہت سے لوگ اُسے سُنّی اور بہت سے شیعہ کہتے ہیں۔ بہرکیف ولی کے مرثیہ کا کہیں تذکرہ مَیں نے نہیں پڑھا۔ مہربانی کر کے مخزن کی اس جلد اور نمبر کا حوالہ دیجئے۔ جس میں ولی کا مرثیہ شائع ہوا تھا۔

مجھے اب تک مندرجہ ذیل مرثیہ گویوں کے نام معلوم ہوئے ہیں:۔
امانی[1] ۔ مرزا ظہور علی خلیق[2] ۔ حیدر[3] ۔ حیدری[4] ۔ انشان[5] ۔ افگار[6] ۔ احمد[7] ۔ افسر[8] ۔ بیان[9] ۔ بینوا[10] ۔ پروانہ[11] (راجہ جسونت سنگھ ہندو) شرف[12] ۔ عاصی[13] (یا عاصی) عیاش[14] ۔ فضلی[15] (جس نے عہد محمد شاہ سے قبل کربل کتھا یا وہ مجلس لکھی) فیاض[16] ۔ فرخ[17] ۔ غزا[18] ۔ قاسم[19] ۔ مسکین[20] ۔ منت[21] ۔ محزون[22] ۔ ندیم[23] ۔ وفا[24] ۔ وصال[25] ۔ متاخرین میں افسردہ[26] ۔ گدا[27] ۔ سکندر[28] ۔ ظفر شاہ[29] بادشاہ ۔ شرف[30] ۔ احسان[31] ۔ تپاں[32] ۔ ذبیح[33] ۔ دلگیر[34] ۔ فصیح[35] ۔ ضمیر[36] ۔ دبیر[37] ۔ مونس[38] ۔ انس[39] ۔ وحید[40] ۔ قدیم[41] ۔ مرزا علی بہار[42] ۔ واجد علی شاہ[43] ۔ ان میں سے نمبر ایک ۔ دو ۔ تین ۔ ۴ ۔ ۵ ۔ ۶ ۔ ۷ ۔ ۸ ۔ ۱۱ ۔ ۱۳ ۔ ۱۵ ۔ ۱۹ ۔ ۲۰ ۔ ۲۶ ۔ ۲۸ ۔ ۳۹ ۔ ۳۳ ۔ ۳۴ ۔ ۳۵ ۔ ۳۶ ۔ ۳۷ ۔ ۳۸ ۔ ۳۹ ۔ ۴۰ ۔ ۴۲ ۔ ۴۳ کے کچھ کچھ حالات بھی معلوم ہو چکے ہیں ۔ اور نمبر ۲ ۔ ۳ ۔ ۱۷ ۔ ۱۸ ۔ ۲۰ ۔ ۹ ۔ ۲۶ ۔ ۲۸ ۔ ۲۹ ۔ ۳۳ (پرانے مرثیہ گو) کا کلام بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ دلگیر کے بعد کے مرثیہ گویوں کے مرثیے تو چھپے ہوئے ملتے ہیں ۔ البتہ مرزا علی بہار اور واجد علی شاہ اختر کا کلام شائع نہیں ہوا، مگر ہمارے پاس موجود ہے ۔

آپ مہربانی کر کے ادھر بھی پرانے مرثیوں کو تلاش فرمائیں جو ملے روانہ کر دیں۔ افسردہ کا سلام گو عام ہے مگر پھر بھی جو آپ کے پاس ہے بھیج دیجئے اور کاشف کا مرثیہ بھی ارسال ہو۔ مَیں اس کے حالات کی تفتیش کرونگا۔ ہاں میر۔ سودا اور خلیق کا نام لکھنا بھول گیا۔ میر و سودا کے مرثیے تو چھپ گئے، لیکن خلیق کا مرثیہ نایاب ہے۔ میرے پاس سوا ایک مرثیے کے دوسرا نہیں۔ مرزا ظہور علی خلیق (المتوفی سنہ ۱۲۱۱ھ) کے دو مرثیے اور اسی طرح افسردہ کے دو مرثیے بھی موجود ہیں ۔

اور کیا عرض کروں۔ امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہونگے مجھ سے مراسلات جاری رکھئے۔ اور جو بات ذہن میں آئے، فوراً لکھئے ۔ زیادہ تسلیم

نیازمند

خیال



صدائے میخوار

یہ دُنیائے فانی بڑی فتنہ زا ہے　　بڑی بیوفا ہے بڑی کج ادا ہے
بجُز رنج و حسرت کے اور اس میں کیا ہے　　یہاں کے غموں کی یہی اک دوا ہے

پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا

نہ جمشید باقی نہ خسرو نہ دارا　　نہ وہ جامِ جم ہے نہ وہ اس کا نقشا
نہ بہرام ہے اور نہ قصرِ معلےٰ　　جو میری سُنے تو

پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا

یہ گلشن یہ پھُول اور یہ سبزے کا عالم　　یہ پھولوں کے پتّوں پہ قطراتِ شبنم
یہ ندی کے نغمے یہ لہروں کے سرگم　　لچک کر درختوں کا مِلنا یہ باہم

پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا

جو پیتے ہیں جینا اُنہیں کا سزا ہے　　جو پیتے ہیں جینا اُنہیں کو روا ہے
زمانہ ہے دشمن یہی آسرا ہے　　یہی اب کہونگا یہی جب کہا ہے

پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا

جو مسجد میں پہنچا تو زاہد پکارا　　گیا دَیر میں تو ہوُا یہ اشارا

کہ پینے سے ہے اس جہاں میں گذارا یہی زندگی کا ہے اصلی سہارا

پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا

شرابِ مصفّٰی نہیں اک دوا ہے شرابِ مصفّٰی نہیں کیمیا ہے
شرابِ مصفّٰی کے حق میں کہا ہے شرابِ مصفّٰی نہیں رہنما ہے

پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا

نہ رکھ کام زاہد کی پند ریا سے نہ رکھ کام دنیا کی حرص و ہوا سے
نہ ڈر ابتدا سے نہ ڈر انتہا سے نہ مل شاہ سے اور نہ مل تو گدا سے

پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا

ترا تخت اُڑتا پھرے گا ہوا پر کُھلے گا فتوحاتِ غیبی کا دفتر
نظر میں تری سب رہیں گے برابر نہ کانٹا لگے گا کہیں اور نہ ٹھوکر

پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا، پیئے جا

ہوش ملیح آبادی

جوانی

وہ ولولۂ دل، وہ ترنگیں نہ رہیں صد حیف! جوانی کی امنگیں نہ رہیں
افسردہ دلی وہ ہے کہ خالق کی پناہ جذبات میں رات دن وہ جنگیں نہ رہیں

(رشید فخری جالندھری)

جنوبی ہند کا دورہ

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

سیلون میں صنعت وحرفت اور کسی قسم کی فن کاری کا مطلق رواج نہیں ہے۔ کاشت کے معاملے میں یہ ملک بہت پیچھے ہے۔ حتیٰ کہ پوری آبادی کے لئے ایک مہینے کا غلہ بھی نہیں پیدا کر سکتا۔ سیلونی، برما، بنگال مدراس اور جاپانی چاول سے اپنا پیٹ بھرتے اور انگلستان وجاپان کے کپڑے سے اپنا تن ڈھانکتے ہیں۔ اس ملک کا پورا حصہ سوائے ساحلی حصوں کے پہاڑی ہے۔ اندرون ملک جہاں اور جدہر جاؤ پانچ سات ہزار فٹ بلند پہاڑیاں یا چھوٹے چھوٹے ٹیلے یا پتھریلی زمین جو ناقابلِ کاشت ہوتی ہے، نظر آئے گی۔ کینڈی، نیوریلیا، ماٹن، اولیپا ماتلے، ڈمبلے، ماسکلے وغیرہ مقامات کی پہاڑیاں موزوں کے سخت تودے ہیں، جن پر چائے کا پورا کاروبار انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ پورے سیلون میں چائے کے چھوٹے بڑے تقریباً پانسو کارخانے ہیں جن میں بارہ لاکھ آدمی کام کرتے ہیں۔ ان مزدوروں میں اکثریت مدراس اور جنوب ہند کے مزدوروں کی ہوتی ہے، مشکل سے ایک آدھ لاکھ مزدور ملکی ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس افلاس کے باوجود سیلونی بلند اپنے معیار کو گھٹانا نہیں چاہتے۔ مدراس وغیرہ سے آئے ہوئے مزدور پانچ یا چھ آنہ پہ کام کرنا قبول کر لیتے ہیں، لیکن ایک سیلونی آٹھ آنہ سے کسی طرح کم اجرت قبول نہیں کرے گا۔ اس لئے انگریز اپنے فائدہ کی خاطر جنوبی ہند سے مزدوروں کو جہازوں پہ لاد کر لاتے ہیں، اور دو چار یا پانچ چھ سال کام لینے کے بعد ان مزدوروں کو واپس کر کے اور تازہ دم جماعت فراہم کرتے ہیں۔

چائے کی کاشت کے لئے نہایت ہی مرطوب آب وہوا کی ضرورت ہے۔ جہاں کا درجہ حرارت ۸۰ یا ۹۰ سے تجاوز نہ کرے اس کی کاشت خاص بلندی یعنی موزوں کے بلند ٹیلوں یا پہاڑیوں پر ہوتی ہے۔ بڑے بڑے پہاڑوں پر بھی جہاں موزوں کی زمین ہو اس کی کاشت کا امکان ہے۔ چائے کا پودا عموماً ۲ فٹ سے ۴ فٹ تک بلند ہوتا ہے۔ بعض اوقات ۵ فٹ تک بھی اونچا ہو جاتا ہے۔ اس کا پھیلاؤ ۴ اور ۵ فٹ تک ہوتا ہے۔ پتا چوڑا مثل بانو مرچ کے، بڑے پتے کے ہوتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی بُو وغیرہ نہیں ہوتی۔ پودے کی عمر ۸ سال سے ۱۲، بعض اوقات ۱۵ سال تک ہوتی ہے۔ جب پودا ایک سال کا ہوتا ہے تو اس کو پھول اور بعد میں پھل لگتے ہیں۔ یہی پھل چائے کے بیج ہوتے ہیں۔ جن کی شکل گھنگوں کی سی، لیکن رنگ مختلف یعنی سیاہی مائل ہوتا ہے۔ سال میں دو مرتبہ پودوں کے پتے چُنے جاتے ہیں۔

پتیوں کو توڑنے کے بعد دو تین روز کے لئے ہوا میں رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک مشین کے ذریعہ چوبہ کی طرح کاٹتے ہیں۔ پھر پانی میں ملا کر چار، پانچ دن کے لئے سڑنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں جب اس سے ایک قسم کی بُو آنے لگتی ہے اس کو نکال کر ہائیڈرو اکسٹراکٹر مشین میں ڈال کر خشک کیا جاتا ہے۔ اس دوران میں اس کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔ دو تین طریقوں کے بعد رنگ بدل کر وہ پتیاں اپنی بازاری شکل میں آتی ہیں۔ اس کو مشین کی چھلنیوں کے ذریعہ چھان کر پوڈر علیحدہ، باریک پتی اور موٹی پتی علیحدہ کی جاتی ہے۔ چائے کے مختلف نام اس کی کسی خاص ترکیب کے باعث نہیں رکھے جاتے، بلکہ اشتہار بازی اور اپنے مال کی نکاسی کا ایک طریقہ ہے۔ ورنہ سچ پوچھو تو سب چائے ایک ہے۔ چائے کی پتی میں کہیں بھی کسی قسم کی آمیزش نہیں کی جاتی۔ اس کے مزے یا خوشبو میں جو فرق محسوس ہوتا ہے وہ دراصل اس کے بھوننے کا کمال ہے۔ اس کے علاوہ چائے میں اگر کوئی فرق ہو سکتا ہے تو مختلف مقامات کا ہلکا سا موسمی اثر مثلاً کشمیر، سیام، آسام، اوٹی اور سیلون کے موسمی اثرات وہاں کی پیداوار پر اور اس کے اجزائے ترکیبی میں اپنا تھوڑا بہت اثر پیدا کرتے ہیں۔ صرف سیلون سے کئی قسم کی چائے نکلتی ہے۔ جس کے مختلف نام ہیں اور حقیقت میں دیکھو تو ایک دوسرے میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں۔

سیلون میں چائے کے علاوہ کوکو، کافی، ربڑ اور ناریل کی

کاشت کثرت سے ہوتی ہے۔ کوکو، کافی، اور ربڑ کی تقریباً پوری پیداوار یورپ کی نظر ہو جاتی ہے۔ سوائے ناریل کے کوکو، کافی اور ربڑ کی کاشت پر بھی انگریزوں ہی کا قبضہ ہے جن سے مثل چائے کے ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ سیلون میں ناریل اگرچہ کثرت سے پیدا ہوتا ہے لیکن اسقدر مہنگا کہ ان مان۔ صوبہ مدراس کے اسٹیشنوں اور شہروں میں جہاں کہیں ہم نے ناریل خریدا ایک دو پیسے سے زیادہ نہیں دئے، لیکن سیلون میں اگر آپ ناریل بن میں بھی چلے جائیں تو ۸ سینٹ (۸ پیسے یا دو آنے) سے کم میں نہیں ملے گا۔ یہ گویا معمولی ناریل کی قیمت ہوئی۔ اور کنگ کوکونٹ جو کسی قدر چھوٹا اور پیلے رنگ کا ہوتا ہے۔ اس کی قیمت ۱۲ یا ۱۰ سنٹ سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ اس ناریل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا پانی نہایت میٹھا اور بہت سرد ہوتا ہے۔ ناریل کی گرانی کا اصل باعث اس کی مانگ ہے۔ سیلون میں گھی شاید ہی استعمال ہوتا ہے۔ کھوپرے کا تیل گھی کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اضلاع، دیہات، اور قصبوں میں امیر غریب سب کے سب سالن اور چراغ میں یہی تیل استعمال کرتے ہیں۔

اناج میں چاول، باجرا، کنگنی، جوار اور مکئی وغیرہ قلیل مقدار میں پیدا ہوتے ہیں۔

سیلون میں تین زبانیں رائج ہیں۔ سنہالی جو سیلون کی قدیم اور اصلی زبان ہے۔ چنانچہ یہاں قدیم باشندے بھی اسی نام سے پکارے جاتے ہیں۔ اس کے بعد تامل۔ یہ زبان جنوبی ہند سے سیلون آئی اور ضروریات زمانہ کے اعتبار سے مروج ہو گئی۔ آخر میں انگریزی زبان جو حکومت کے اثر، عیسائیت کے رواج اور مختلف کاشتوں کے سلسلے میں مجبوراً بولی گئی۔ معاشی حالات کے اعتبار سے ملک بہت تباہ حال ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اصلی باشندوں کا کچھ حصہ مختلف قسم کی کاشت میں مصروف نظر آتا ہے۔ اس کے بعد کچھ حصہ سرکاری ملازمتوں کا متمنی ہوتا ہے۔ ایک حصہ بیرونی مال کی تجارت کرتا اور کثیر حصہ بیروزگاری کا طوق گلے میں ڈالے پریشان حال پھرتا ہے۔

سیلون کا سب سے بڑا پُر رونق شہر اور پایہ تخت کولمبو ہے۔ اس کی آبادی جیسا کہ پیشتر بھی بیان کیا گیا چھ لاکھ ہے۔ بندرگاہ کولمبو کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ یورپ اور ایشیا کی یہ درمیانی بندرگاہ ہے۔ جہاں بڑے بڑے جہاز آتے ہیں۔ یہاں کی اکثر و بیشتر عمارتیں عالیشان، خوبصورت اور بلند ہوتی ہیں۔ سڑکیں چوڑی اور نہایت پاک صاف ہیں۔ تجارت زیادہ تر یورپین اقوام کے ہاتھ ہے۔ اس میں بمبئی، مدراس، کلکتہ کے تاجروں کے علاوہ خود سیلونیوں کا بھی کچھ حصہ ہے۔

شمالی ساحل پر جافنا کی زبردست بندرگاہ اور شہر ہے جو اقصائے مشرق بعید سے قریب تر واقع ہے۔ وسطی حصہ میں کینڈی سیلون یا قدیم لنکا کا بہت مشہور اور پرانا پایہ تخت تھا۔ آجکل ایک معمولی شہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ کینڈی اور اس کے اطراف واکناف کے تمام مقام پہاڑیوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ جن پر چائے کے باغ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ کینڈی کا نباتی باغ دنیا کے مشہور نباتی باغوں میں شمار ہوتا ہے۔

سیلون میں ایک خاص چیز یہ دیکھنے میں آئی کہ ملک کے ہر گوشہ میں جنگل، بیابان، پہاڑ، گھاٹی یا وادی جدھر بھی چلے جاؤ، ڈامبر کی سیاہ سڑک ملے گی۔ حکومت کی یہ فیاضی اصلی باشندوں کی خاطر نہیں بلکہ اپنے ان ہم قوموں کے لئے ہے۔ جو ملک کے گوشہ گوشہ میں کاشت کے لئے پڑے پھرتے ہیں۔ سیلونیوں کے اخلاق و عادات کے بارے میں صرف اسقدر عرض کروں گا کہ برے ہیں نہ ہی اچھے۔ سیلونی ملکی سیاسیات سے ابتک کورے تھے لیکن تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات میں تغیر پیدا ہو رہا ہے، حالانکہ انہیں ہندوستان کے عام سیاسی حالات سے بالکل بیخبر رکھا گیا ہے۔ تاہم وہ اپنے جذبات سے مجبور ہیں۔ قیاس تو یہی کہتا ہے کہ چند سال بعد وہاں بھی سیاسی کشمکش پیدا ہو جائے گی۔

سیلون میں تعلیم کا فقدان ہے۔ یہاں ملک کی اپنی کوئی یونیورسٹی نہیں۔ کولمبو جیسے بڑے شہر میں صرف ایک بڑا کالج ہے۔ جہاں صرف بی۔ اے تک تعلیم دی جاتی ہے۔ ابتدائی تعلیم کی حالت بہت ہی ناقص ہے۔ قانونی اور اعلےٰ تعلیم سے خود سیلونی بیزار ہیں جہاں سختیاں ضرورت سے زیادہ ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے روکنے کا مقصد یہ ہے کہ ملک میں بیداری نہ پیدا ہونے پائے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ سیلون کے باشندوں نے سنہالی زبان میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی تحریک کی تھی، لیکن حکومت نے اس کو مسترد کر دیا۔

تالامنار پیر سے دھنسکوڈی پیر کا فاصلہ صرف ۲۲ میل ہے۔ اور یہ راستہ پونے دو گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ دھنسکوڈی پیر پر گاڑی تیار تھی۔ مسافروں کے سوار ہوتے ہی گاڑی وقت مقررہ پر حرکت میں آئی، راستہ میں رامیشورم روڈ اسٹیشن پڑتا ہے۔ یہاں سے رامیشورم

کا مشہور مندر دکھائی دیتا ہے - اس مقام پر ہم نے ریل کا مشہور پُل آدم بریج بھی طے کیا - یہ پُل دو سمندروں یعنی خلیج بنگال اور بحیرہ عرب کے مقام ملاپ پر ڈالا گیا ہے - اس کی لمبائی تقریباً تین میل ہو گی - اب ہم خطہ پاک مدراس میں سے گزر رہے تھے - دوزخ کی آگ سے پیدا کی ہوئی لو گاڑی کے اندر زور دار تھپیڑے لگا رہی تھی - اس لئے ڈبوں کی تمام کھڑکیاں بند کر لی گئی تھیں - تین بجے گاڑی مدورا جنکشن پہنچی - ہم نے سامان لگیج روم میں رکھوا دیا - اور شہر کی سیر کو چلے گئے - سب سے پہلے مندر کی طرف گئے - یہاں کا مندر مضبوط فصیل سے گھرا ہوا ایک چھوٹا سا قلعہ معلوم ہوتا ہے - ترچنا پلی کی طرح یہاں بھی مندر کے خاص حصّہ میں داخل ہونے سے ہمیں روکا گیا - آبادی کے اعتبار سے صوبہ مدراس میں مدورا اگرچہ تیسرا شہر ہے لیکن شہریت کے اعتبار سے نہایت ہی فضول مقام ہے -

دس بجے کی گاڑی سے اوٹی روانہ ہو گئے - چونکہ ہم پسنجر گاڑی سے سفر کر رہے تھے - اس لئے میٹو پالائم تک تین جگہ گاڑی تبدیل کرنی پڑی - یہاں سے اوٹی کے لئے نیارو گیج ہے - کوئمبتور کے بعد سے پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے - پہاڑوں پر چائے کے پودے ہیں - لیکن سیلون کے سے دلفریب مناظر نہیں پیش کرتے - اوٹی پہنچنے تک پہاڑیوں پر کئی آباد مقامات ملتے ہیں - جن میں سب سے بڑا کونور ہے - چار بجے اوٹی پہنچے اور میونسپل ہائی اسکول میں جہاں پہلے سے انتظام ہو چکا تھا قیام کیا - یہاں چار روز رہے، سردی کافی تھی، لیکن وہاں کے اعتبار سے قدرے کم تھی - یہاں کھانے وغیرہ کی بڑی تکلیف ہے دو تین یورپین ہوٹلوں کے سوا کوئی اچھا ہوٹل موجود نہیں - یہاں کا نباتی باغ عمدہ مقام ہے - اکثر لوگ تفریح کے لئے آتے ہیں - اسی کی حدود میں ایک پہاڑی پر گورنر مدراس کا مکان واقع ہے -

۱۸ رمئی کو گیارہ بجے موٹر بس کے ذریعے میسور کی طرف روانہ ہوئے - شام کے چھ بجے مہاراجہ کالج ہوسٹل پہنچے - پہلے سے ہماری آمد کی اطلاع تھی - یہاں کے مودب مقیم نے ہوسٹل میں ہمارے رہنے کا انتظام کیا ہوا تھا - یہاں بھی چار روز قیام رہا - اس عرصے میں ہم نے میسور کا مشہور چڑیا گھر، آرٹ گیلری، مہاراجہ کا محل، چاونڈی ہل، مہاراجہ کالج کی عمارتیں اور یونین بلڈنگ دیکھی - سرنگا پٹم میں ٹیپو سلطان کا مقبرہ اور لچکدار کمان، سیوا سمدرم میں کاویری کا آبشار اور زبردست بجلی گھر اور کرشنا ساگر دیکھا - ساگر کے نواح میں حکومت نے ایک کثیر رقم صرف کر کے زینہ بہ زینہ لانس اور ان میں مختلف قسم کے حوض اور فوارے بنائے ہیں - ہری ہری گھاس میں فواروں کی روپہلی دھاریں ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی ہیں - ان حوضوں اور فواروں کے اندرونی حصوں میں شیشوں کی حفاظت کے ساتھ مختلف رنگ کی روشنی کا انتظام کیا گیا ہے - چھ بجے روشنی ہوتی ہے - اور جیسے جیسے اندھیرا بڑھتا جاتا ہے اسی مناسبت سے روشنی کا منظر شباب پر آتا جاتا ہے - مختلف رنگ کی روشنی پانی کی دھاروں اور چادروں کے ملنے کے بعد کچھ ایسی جاذب نظر ہوتی ہے کہ دیکھنے والا محو حیرت ہو جاتا ہے - اس رنگین فضا میں مرد، عورت، بچے بوڑھوں کے سوا رنگین طبیعت حضرات اپنے سرخ و سفید جوڑوں کے عشق و عاشقی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں - ہفتہ میں دو مرتبہ میسور کی دوسری دلچسپیوں میں اس چیز کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے - میسور سے ساگر اسٹیشن تک ریل آتی ہے - محض اس تماشہ کے دیکھنے کے لئے ریلوے کے عہدہ داروں نے ہفتہ اور اتوار کے دن ایک خاص گاڑی مقرر کی ہے جو میسور سے ۵ بجے مسافروں کو لے جاتی ہے - اور ½۹ بجے شام واپس ہوتی ہے - خاص رعایت کے ساتھ واپسی ٹکٹ دیا جاتا ہے - امیر اور مقتدر لوگ موٹروں کے ذریعے جاتے ہیں اور متوسط و غریب افراد ریل کے ذریعہ سے ان دامون انسانی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں -

۲۲ رمئی ۳۰-۶ کی گاڑی سے لنڈا گوا روانہ ہوئے - ۲ بجے رات کو لنڈا جنکشن پہنچے، یہاں سے گوا کیلئے دوسری گاڑی ملتی ہے صبح دس بجے مارموگوا پہنچے - یہاں سے بذریعہ اسٹیمر لانچ نوا گوا یا پنجم گئے - یہی مقام حکومت گوا کا پایہ تخت ہے - چھوٹا سا شہر ہے - مگر پانڈیچری کی طرح سنسان یا کم آباد نہیں - بعض چیزیں یہاں بھی سستی ملتی ہیں، لیکن کروڑ گیری کا محصول کسی کو خریدنے کی جرأت پر آمادہ نہیں کرتا - یہاں پرتگالی یا خود یہاں کی زبان کونکنی بولی جاتی ہے - بعض اردو بولنے والے بھی مل جاتے ہیں مگر انگریزی داں مشکل ہی سے نظر آتے ہیں تین بجے موٹر کے ذریعے اولڈ گوا جہاں متعدد گرجے اور سینٹ زیورس کا مقبرہ ہے - دیکھتے ہوئے مارگو پہنچے - راستے میں دو پلوں پر سے گزرنے والے ہر شخص کو ایک اور تین پیسے علی الترتیب ٹول ٹیکس کے ادا کرنے پڑتے ہیں - مارگو پنجم سے ۲۸ میل کے فاصلہ پر ہے - یہ مقام بھی حکومت گوا کا ایک چھوٹا سا شہر ہے، کوئی خاص بات نہیں - گوا سے واپس

ہونے وقت ریل کے کرایہ میں ہر شخص سے دس آنے زاید وصول کر لئے جاتے ہیں۔ اس کو پرسنل ٹیکس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ۵ بجے کی گاڑی سے روانہ ہو کر رات کو ۲ بجے لونڈا پہنچے، یہاں گاڑی تبدیل کی اور دوسرے دن ½۳ بجے پونہ پہنچے۔

پونہ میں ہمارا قیام آغا سید معین الدین حسینی صاحب کے گھر رہا۔ آپ نے ہمارے ساتھ اتنی مہربانیاں کی ہیں کہ ان سب کا شکریہ ادا کرنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ یہاں پر زراعتی کالج، فرگوسن کالج عارصدرگاہ، پربھات فلم کمپنی، بنڈ گارڈن، وغیرہ دیکھا۔ پونے میں بھی ہم لوگ چار روز رہے۔ خلاف پروگرام ٹھہرنا پڑا۔ ۲۷ر مئی صبح ۷ بجے کی گاڑی سے بمبئی روانہ ہوئے۔ یہاں ہمارا قیام انجمن اسلام ہائی اسکول بوری بندر میں رہا۔ اس مدرسہ کے معتمد مولوی جابر علی صاحب نواب ہاشم یار جنگ بہادر معتمد جوڈیشل کمیٹی حیدرآباد کے حقیقی بھائی ہیں۔ آپ کو جامعہ عثمانیہ سے بڑی ہمدردی اور دلچسپی ہے۔

بمبئی میں ہم نے سر جے جے اسکول آف آرٹ اور پرنس آف ویلس میوزیم دیکھا۔ چونکہ یونیورسٹی کی تعطیلات تھیں۔ اس لئے باہر سے صرف عمارتوں ہی کے دیکھنے پر اکتفا کیا۔ دفتر اخبار اجمل اور اخبار خلافت کا بھی معائنہ کیا۔ خلافت کے دفتر میں مولانا شوکت علی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مولانا نے حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ سے متعلق مختلف قسم کے سوال کئے۔

۲۹ر مئی رات کے ½۱۱ بجے کی پسنجر ٹرین سے براہ منماڑ راہی اورنگ آباد ہوئے۔ ارادہ تو ۱۱ بجے کی ایکسپریس سے جانے کا تھا۔ لیکن قلیوں کی غلطی سے دیر ہو گئی اور گاڑی چھوٹ گئی۔ اس لئے مجبوراً پسنجر سے سفر کرنا پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ آباد بجائے ۷ بجے صبح پہنچنے کے چار بجے شام پہنچے۔ اورنگ آباد پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ صبح کی گاڑی کے وقت پرنسپل صاحب عثمانیہ کالج اورنگ آباد، تحصیلدار صاحب، صدر مدرس صاحب مدرسہ وسطانیہ، مولوی خواجہ فیاض الدین صاحب نائب ناظم آبکاری، مہتمم صاحب آبکاری، مولوی برہان الدین صاحب مہتمم زراعت، اور کئی ایک دیگر حضرات ہمارے استقبال کے لئے اسٹیشن تشریف لائے تھے۔ چار بجے کی گاڑی پر سوائے پرنسپل صاحب کے باقی سب حضرات موجود تھے۔ یہاں ہمارے رہنے کا انتظام مدرسہ وسطانیہ کے اقامت خانہ میں ہوا تھا۔ اقامت خانہ کے ملازمین کے قطع نظر تعلقدار صاحب نے بھی دو چپراسی مقرر کر دئے تھے۔ اور مددگار تحصیلدار صاحب وقتاً فوقتاً ہماری امداد کے لئے تشریف لاتے تھے۔ اس رات کو مولوی شطاری صاحب منصف سیلون نے ہمیں کھانے پر مدعو فرمایا۔ یہاں پرنسپل صاحب کالج سے ملاقات ہوئی۔ دوسرے روز ہم نے دولت آباد کا قلعہ اورنگ زیب اور آصف جاہ کے مزار دیکھے۔ خلد آباد سے گزر کر غارہائے ایلورا کی سیر کی۔ ان غاروں کے نقوش کی تفصیل کا یہ کوئی موقع نہیں۔ دنیا کے سات عجائبات میں اس ایک عجوبہ کا اضافہ نہ کرنا واقعی ناانصافی ہے۔ ایلورا کارسٹ ہاؤس غاروں کے اوپر پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔ ان تمام مناظر سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم لوگ تقریباً چار بجے اورنگ آباد واپس ہوئے۔ اسی شام مقبرہ رابعہ دورانی اور انجمن ترقی اردو کا دفتر دیکھا۔ واپسی میں غلام محمد خاں صاحب اول تعلقدار کے مکان پر گئے۔ جہاں تعلقدار صاحب اور ان کے داماد ڈاکٹر عبدالحق پروفیسر عربی جامعہ عثمانیہ سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔ دوسرے روز صبح ایک جماعت اجنٹا دیکھنے کے لئے گئی اور ہم چند لوگ تھکن کے باعث اورنگ آباد ہی میں ٹھہرے رہے۔ اس جماعت کی واپسی تک ہم نے انیس الحق صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ کی رہبری میں مدرسہ کا تفصیلی معائنہ کیا اور اکثر جماعتوں کے طریقۂ تعلیم نیز طالبعلموں کی دستکاری کے نمونے وغیرہ بھی دیکھے۔ اس کے بعد کالج گئے چونکہ ان دنوں کالج کو چھٹیاں تھیں، اس لئے سوائے عمارت کے کوئی خاص دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد قلعہ ارک جاکر دیکھا۔ تقریباً تین بجے تک ہم نے اپنا پروگرام ختم کر لیا تھا اور اُس وقت وہ جماعت اجنٹا سے آچکی تھی۔ سوا تین بجے ہم ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ ہمیں خدا حافظ کہنے کے لئے اسٹیشن پر اکثر حضرات موجود تھے۔ ساڑھے تین بجے گاڑی پلیٹ فارم سے حرکت میں آئی۔ اس طرح ایک مہینہ آٹھ روز کے طویل سفر کے بعد ۲۔ جون صبح کے سات بجے ہماری جماعت خیر و عافیت کے ساتھ حیدرآباد میٹر گیج پہنچ گئی۔

غلام محمد خاں (عثمانیہ)

ذریعہ تعلیم علوم و فنون سے آراستہ کیا جا سکتا ہے۔ اِس لئے نہایت ضروری ہے کہ صوبجاتی زبانوں پر زور دیا جائے اور ہمارا زیادہ تر کام انہی میں انجام پائے۔ صوبوں میں کسی نئی یا خاص زبان کو ذریعۂ کار بنانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو بقیہ کثیر آبادی سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اور عوام الناس کی علمی و تمدنی ترقیوں کو روک دیا جائے

کانگرس کا ابتداء سے یہ دستور العمل رہا ہے کہ اس نے اپنا زیادہ تر کام صوبجاتی زبانوں میں کیا۔ اس کا مفید نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ عوام الناس میں ہمارے خیالات بہت آسانی سے پھیل گئے اور کانگرس کی قوت تمام ملک پر نہایت تیزی سے غالب آگئی۔ کانگرس کا پیغام محلوں اور شہروں سے گزر کر دُور اُفتادہ کوروہ اور جھونپڑوں تک پہنچ گیا اور اِن سب میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ اِس لئے ہر صوبہ میں تعلیم اور پبلک سے متعلق تمام کام مقامی زبان ہی میں ہونا چاہیئے۔

صوبجاتی زبانیں کون کونسی ہیں۔؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "ہندوستانی" جس میں اُردو اور ہندی مع مختلف رسم الخط اور متعدد طرز ادا کے ساتھ شامل ہیں۔ اس کے بعد بنگالی۔ مرہٹی اور گجراتی جو درحقیقت ہندی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں اور ایک دوسرے سے بہت کچھ مشابہ ہیں۔ جنوب میں تامل تیلگو۔ کنارسی اور ملایالم ہیں۔ اِن کے علاوہ اُڑیا۔ آسامی۔ سندھی۔ پنجابی اور شمالی و مغربی صوبے میں پشتو زبان ہے۔

مندرجہ بالا ایک درجن زبانیں ملک میں رائج ہیں اور اِن میں "ہندوستانی" کا رقبہ اور اقتدار سب سے زیادہ ہے اور اسی سبب سے اس میں تمام ملک کے لئے مشترکہ زبان بننے کی صلاحیت موجود ہے۔

صوبجاتی زبانوں میں ذرہ برابر مداخلت کئے بغیر ہم اِس بات کے لئے مجبور ہیں کہ تمام ملک میں اتحادِ عمل اور مراسلت کا ذریعہ بنانے کے لئے کسی ایک زبان کو مشترکہ زبان کے طور پر استعمال کریں۔ بعض کا خیال ہے کہ اس مقصد کے لئے انگریزی زبان کارآمد ہوگی۔ اگرچہ اِس میں شک نہیں کہ انگریزی زبان ملک کے سیاسی معاملات میں ایک حد تک یہ خدمت انجام دے چکی ہے مگر اس کا اثر صرف اعلیٰ طبقہ تک محدود رہا اِس لئے یہ انتخاب عوام الناس کے لئے ذرا بھی مفید نہ ہوگا۔ یہ قطعی غیر ممکن ہے کہ کروڑوں مخلوق کو غیر ملکی زبان میں تعلیم یافتہ بنا دیا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ انگریزی زبان بسبب اس کے کہ اس سے ہمارے تعلقات رہ چکے ہیں اور یہ موجودہ زمانے کی ایک ضروری زبان ہے ہمارے اندر بطور مفید اور کارآمد زبان کے رکھا جائے گا اسے غیر ممالک سے مراسلت کرنے میں استعمال کیا جائیگا اگرچہ میرا خیال ہے کہ اِس مقصد کے لئے صرف انگریزی ہی زبان سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں ممالک غیر کی دوسری زبانیں بھی جاننے کی ضرورت پیش آئے گی۔ مثلاً فرانسیسی۔ جرمنی۔ روسی۔ اطالوی۔ چینی۔ جاپانی وغیرہ مختصر یہ کہ ہندوستان کی تمام آبادی کو انگریزی کی تعلیم دیکر اِسے ملک کی مشترک زبان نہیں بنایا جا سکتا۔

صرف وہ زبان جس کا مشترک ہونا ممکن ہو سکتا ہے "ہندوستانی" ہے اِس زبان کو بارہ کروڑ انسانوں سے زیادہ تو اسی وقت بولتے ہیں اور اس سے کئی گنا زیادہ سمجھ لیتے ہیں۔ وہ لوگ جو اِسے فی الحال نہیں جانتے ایک ایسی توجہ کے بعد جو غیر ملکی زبان کے حاصل کرنے سے بدرجہا کم ہوگی۔ اسے نسبتاً بہت جلد اور آسانی کے ساتھ سمجھنے لگیں گے۔ اوّل تو ہندوستان کی تمام زبانوں میں بکثرت الفاظ مشترک ہیں اس کے علاوہ سب سے بڑی آسانی یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے اختلاف کو نظر انداز کر کے تمام ملک میں تہذیب۔ تمدن۔ رجحانات۔ اصلاحات۔ خیالات قریب قریب یکساں ہیں۔ انہی وجوہ سے زبانوں میں بھی یکسانیت ہے اور ان ہی اسباب سے ہندوستان کے کسی صوبہ کے باشندے کو ملک کی دوسری زبان حاصل کر لینا بہت آسان ہے۔

(ندیم بھوپال)　　　(پنڈت جواہر لال نہرو)

مذہب اور مادیت

آج بیسویں صدی میں تمام عالم عمومی طور پر دو طبقوں میں منقسم نظر آتا ہے۔ **مادی اور روحانی** اوّل طبقہ کا خیال ہے کہ مذہبیت اور روحانیت ایک لغو اور بیکار چیز ہے۔ عالم صرف مادہ اور اُس کے تمام کرشموں کا نام ہے۔ دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ مذہب حیات انسانی کی ضروریات میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری چیز ہے۔ کامل انسانیت اس کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ بھی نہ صرف اس وجہ سے کہ مذہب انسان کو صحیح فطرت کی طرف لیجاتا۔ اور تکمیل طبائع کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے اُن کی ہدایت کرتا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ مذہب انسان کو صحیح انسان بناتا اور آخر میں ربانی تجلی کے ساتھ پیوست کر دیتا ہے۔ حیوانوں کے لئے تو صرف اسی قدر کافی ہے کہ ان کو خورونوش کی چیزیں مل جائیں ان کے لئے ایک ملجا و ماویٰ ہو۔ اور وہ مہلک اشیاء سے محفوظ رہ سکیں۔ لیکن انسان کے لئے صرف اسی قدر کافی نہیں۔ بلکہ ان چیزوں کے علاوہ بہت سے معنوی مقاصد بھی ہیں جن کی ضرورت انسان کو مادی ضروریات سے کم نہیں۔ اور اپنی حیات کی تکمیل کے لئے مادیات سے کچھ کم ان کا محتاج نہیں ہے۔ گویا انسان ایک ایسی ہستی ہے جس کے مقاصد غیر متناہی اور بیشمار ہیں۔ اسی طرح وہ عالم جس میں یہ ہستی زندگی کے وسیع میدان کے اندر تگ و دو میں مصروف ہے۔ بالکل غیر متناہی ہے۔ انسان اس غیر متناہی عالم کے اندر ڈالدیا گیا۔ نہ محض اس لئے کہ وہ صرف حیوانوں اور چوپایوں کی طرح زندگی بسر کرے اور پھر کچھ مدت کے بعد بالکل فنا اور معدوم ہو جائے۔ بلکہ انسان اس غیر متناہی اور بوقلموں عالم میں اس لئے آیا ہے کہ اس میں رہ کر اس کے مخفی اسرار کی نقاب کشائی کرے اور خود کو نظام عالم کی زبردست اور عجیب و غریب مشین کا ایک پرزہ ثابت کرے۔ ان تمام مقاصد میں سے ہر ایک مقصد پر اس کا کوئی نہ کوئی کمال صوری یا کمال معنوی معلق اور موقوف ہے۔ اس لئے اگر یہ شریف نوع ان مقاصد کے صحیح راستہ سے بھٹک جائے تو یقیناً اس کی نوعی شرافت بدل جائے گی اور وہ حیوانوں اور چوپایوں سے بھی زیادہ پست درجہ میں چلا جائے گا پھر یہ نتیجہ ہوگا کہ وہ خود اپنی اور غیروں کی ذات کے لئے ایک مستقل خطرہ کی صورت اختیار

کرے گا اور اس کی زندگی بالکل لایعنی اور قابلِ صد نفریں سمجھی جائے گی۔

اِس بنا پر اولین مسائل میں سے وہ مسئلہ جس کے حل کرنے کی انسان کو تکلیف دی گئی ہے مادہ مشہودہ و روح مستورہ کے اسرار کا انکشاف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں انہی دونوں رازوں پر موجوداتِ عالم کا سنگِ بنیاد رکھا ہوا ہے۔ اِس لیئے اس عجیب و غریب کائنات میں مادہ و روح کے علاوہ کوئی تیسری چیز نہیں۔ اگر انسان نے ان دونوں کی حقیقتیں معلوم کرلیں تو پھر اس کے نزدیک کوئی چیز مخفی نہیں رہ سکتی۔ پھر انسان ترقی کے کس درجے پر رہے گا۔ اس کی تعیین یقیناً ہمارے وہم و خیال سے باہر ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ آج مادہ کے صرف بعض رازوں کے انکشاف سے دنیا اس قدر ترقی کر گئی ہے تو پھر اس وقت کیا حال ہوگا جبکہ انسان مادہ کے تمام رازوں کو منکشف کرے۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ان رازوں کا انکشاف اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان قصورِ علمی میں مبتلا رہے گا۔ بلکہ اِس انکشاف کے قبل کمالِ معنوی کے اس درجے میں پہنچ جائے جس کا ہم اس وقت تخیل بھی نہیں کر سکتے۔ تاکہ اس کا یہ نیا انکشاف اس کے درجۂ علم و فضل کے مناسب و مساوی ہو۔ اور انسان کی خلقت پر غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے عجیب راستہ پر چل رہا ہے جس کے لیئے ان مشکلات و مجہولات کا حل کرنا نہایت ضروری اور یقینی امر ہے۔

لیکن مادیین نے یہ خیال کیا کہ اِس تنگ و تاریک اور دشوار گزار راستہ کو انسان کے لیئے مختصر کر دیا جائے۔ تاکہ وہ ان مجہول و لامعلوم اشیاء کے حل کرنے سے محفوظ رہ سکے۔ اِس لیئے اِن حضرات نے پہلے تو یہ خیال کیا کہ روح کوئی واقعی چیز نہیں۔ بلکہ محض وہمی و فرضی ہے اور اس کی تحقیق و تفتیش بالکل بیکار اور لایعنی ہے۔ پھر یہ دعوے کیا کہ ہم نے مادہ کا راز دریافت کر لیا۔ لیکن اس کے تعیین میں باہم مختلف ہو گئے۔ بعضوں نے کہا مادہ ایسے اجزا سے مرکب ہے جو منقسم نہیں ہو سکتا۔ بعض اس طرف گئے کہ وہ بے شمار الکٹرن سے مرکب ہے جو ایک نقطہ کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔ جیسا کہ تمام سیارے آفتاب کے گرد گھومتے ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ مادہ و قوت دو مختلف چیزیں ہیں۔ بعضوں نے کہا کہ موجود صرف قوت ہے اور مادہ اس کے بے شمار مظاہر میں سے صرف ایک مظہر ہے۔ اس اختلاف کی اہمیت اسوقت نہ ہوتی اگر یہ حضرات اسی حد تک ٹھہر جاتے۔ لیکن عجیب بات تو یہ ہے کہ ان کا بالکل واضح اور صاف دعوے یہ ہے کہ مادہ کا راز ظاہر ہو گیا۔ اب اس میں کوئی مخفی بات نہیں ہے۔ مگر ساتھ ہی مادہ کی ایک حقیقت نہیں بلکہ کئی حقیقتیں متعین کی جا رہی ہیں اور حقیقت بیان کرنے والا اپنی حقیقت ہی کو حقایقِ علمیہ اور مقرراتِ تجربیہ میں سے ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس لیئے ہم نہایت افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ ہم لوگ پہلے جس طرح مادہ کی حقیقت سے جاہل تھے اب بھی اسیطرح جاہل ہیں اور جسطرح پہلے اس کی حقیقت میں شک تھا آج بھی وہ اسی طرح ہمارے نزدیک مشکوک ہے

(پروفیسر عبید الرحمٰن عاقل)
(ندیم گنام)

کرب کی آواز

ابنِ آدم کی شادکامی کا
مسئلہ ہے عجیب زہرہ گداز
آدمی کھُل کے ہنس نہیں سکتا
غم نہ بخشے اگر پر پروانہ
ایک کلفت کا عارضی انجام
ایک وقتی طرب کا ہے آغاز
سبزۂ نرم و بسترِ سنجاب
خار و خس کا ہے فرشِ پا انداز
جس میں پنہاں نہو خراشِ الم
کونسا ہے طرب کا وہ انداز
ایک پژمردگیٔ نامحسوس
دہر کی ہر شگفتگی کا ہے راز
ایک مبہم سا نوحۂ ابدی
چھیڑتا ہے سرِ تول کا ساز
تنگ میں جوشِ غلطاں ہے
ایک دھیمی سی کرب کی آواز

(ریکم)

صفحۂ اطفال

ایڈیٹر پریم کا خط —— اپنے چھوٹے بیٹے شاہد جاوید دُرّانی کے نام

ننھے مُنّے شاہد!

آج تم سوتے سوتے چارپائی سے نیچے گر پڑے میں نے دیکھا کہ نیند کی غفلت کے باوجود گرتے ہوئے تم نے پلنگ کی چادر کو ایک ہاتھ میں پکڑے رکھا اپنے سنبھلنے کے لئے یہ تمہاری پہلی معصومانہ کوشش تھی۔ تم اِس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے گر پڑے۔ چوٹ کھائی۔ اور تم نے رونا شروع کر دیا۔ تمہاری ماں نے بجلی کی تیزی کے ساتھ تمہیں زمین سے اُٹھالیا۔ چُمکارا پیار کیا اور جھنجھنا بجا کر درد کے احساس کو مٹانے کی تدبیر کی۔ تمہارا خیال بٹا اور تم اپنے فطری تقاضے سے ہنسنے لگے۔ یہ سارا ڈراما دو تین منٹ میں ختم ہو گیا اب تمہیں اپنی حسین مصروفیتوں میں اپنا گرنا۔ چوٹ کھانا اور رو دینا یاد بھی نہیں۔ کسی غیر مفہوم مسرت کے احساس سے ہنس رہے ہو۔ ہنسے چلے جاتے ہو۔

بیٹے زندگی کی کہانی بھی اِس ڈرامے سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے —— اِس ڈرامے کو ذرا اور پھیلاؤ تو ساری انسانی زندگی اس کے ایکٹوں میں تقسیم ہو جاتی ہے انسان اپنی زندگی کی دوڑ میں اکثر خطرات[۱] محسوس کرتا ہے اس سے بچنے کی سعی[۲] کرتا ہے۔ کبھی کبھی اِس کی سعی کسی خطرے سے مغلوب بھی ہو جاتی ہے تو فطری احساس اُسے رُلا بھی دیتا ہے۔ پھر وقت کہ انسان کے لئے ایک مادرِ مشفقہ[۳] ہے احساسِ الم کو اس کے دِل سے مٹا کر اسے زندگی کی دوسری دلچسپیوں میں مشغول کر دیا کرتا ہے۔ وہ ان دلچسپیوں میں محو ہو کر بھول جاتا ہے کہ اسے کبھی کسی خطرے کا سامنا ہوا تھا اور زندگی اس کی منزلِ مقصود کو اس سے قریب تر کر دیتی ہے

پیارے شاہد! زندگی اور خصوصاً کامیاب زندگی کا راستہ خطرات سے پٹا پڑا ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ لمبا طا بھر اِن خطروں سے بچاؤ کی کوشش کرو۔ اِن خطرات سے گھبرانے کی بجائے ان سے بچنے کی سعی ضروری ہے۔ مگر ان سے ڈر کر آگے بڑھنے سے ہچکچانا انتہا درجے کی بزدلی ہے اور بزدل کی زندگی کوئی زندگی نہیں۔ تمہارے ڈرنے سے راہِ زندگی کے خطرات ٹل نہیں سکتے۔ ان سے ڈر گئے تو تمہارے نصب العین کے سامنے دیوار حائل بن جائیں گے۔ زندگی کے راستے کو طے کرنے ہی میں زندگی کا لطف ہے

---

۱ خطرہ کی جمع ۔ ۲ کوشش ۔ ۳ مہربان ماں۔

بہادر انسان خطروں کو روندتے ہوئے منزل مقصود پر جا پہنچتے ہیں اور خطرات منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ جو لوگ ان خطرات سے گھبرا کر رہ گئے۔ اُن کے لئے پھر زندگی سزائے زندگی بن جاتی ہے۔ یہ ناکام زندگی بزدل ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ قدرت کی امانتوں میں خیانت کرنے والے بھی۔ کیونکہ قدرت نے ہر انسان کو زندگی کے نصب العین کے لئے ایک راستہ اور اس راستے کو طے کرنے کے لئے ارادہ۔ ہمت۔ اولوالعزمی۔ جفاکشی۔ بے خوفی جیسی انمول طاقتیں عنایت کی ہیں۔ اور ان طاقتوں کی آزمایش کے لئے راہِ زندگی میں خطرات کا جال بھی بچھا دیا ہے۔

جو اپنی طاقتوں سے کام نہیں لیتا وہ گویا قدرت کی امانت میں خیانت کرنے کا مجرم گردانا جاتا ہے

بہادر افغان زادے! تو ایک بہادر قوم کا فرد اور ایک بہادر خاندان کا ممبر ہے۔ پانی پت کا میدان تیری خاندانی شجاعت کا گواہ ہے۔ تیری قوم اور تیرے آباؤاجداد نے کبھی اس براعظم ہندوستان کا جغرافیہ بدل دیا تھا۔

تجھے بھی وہ تمام صفات جو تیرے اعلیٰ خاندان کی روایات کو زندہ رکھ سکتی ہیں قدرت نے آبائی ورثے میں بخشی ہیں۔ تو ان نعمتوں کا امانت دار ہے۔

اس دردناک حالت کو نہ بھول! کہ تیرا ملک غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ آزاد قوموں کی محفل میں اس کے لئے کہیں سر اونچا کر کے بیٹھنے کی جگہ نہیں۔

تو اسلام کا پیرو ہے۔ اور اسلام غلامی کو بہت بڑا کفر قرار دیتا ہے تو افغان قوم سے تعلق رکھتا ہے اور افغان غلام ہو کر جینا کبھی پسند نہیں کیا کرتا:

مختصر یہ کہ تیرے قومی خصائل اور تیرے مذہبی احکام غلامی کی ذلیل اور کافرانہ زندگی پر عزت کی موت کو ضروری قرار دیتے ہیں

میرے پیارے بیٹے! اس واقعیت کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ تیرا وطن ہندوستان ہے۔ تو ہندوستانی ہے اور وطن کے حقوق تیرے ذمے تیرے مذہب اور قوم کا ایک قرض ہے۔ جسے ادا کرنا تیرا پہلا فرض ہے اس فرض کی ادائیگی کے راستے میں مشکلات، خطرات اور حادثات بھی پیش آئیں گے۔

بہادر ہندوستانی بچے! غیرت قومی کا تقاضہ یہ ہے کہ زندگی وطن کی آزادی کے لئے وقف کر دے

وطن کی آزادی تیری زندگی کا نصب العین ہونا چاہئے۔ مشکلات کو روندتا ہوا خطرات سے بے پرواہ حادثات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے آگے بڑھتا چلا جانا۔ اِس سفر میں اہلِ وطن کی دعائیں۔ عالم انسانیت کی ہمدردیاں تیری خداداد طاقتیں یہاں تک کہ خدا بھی تیرے ساتھ ہوگا۔

شاہد! رسول کریم علیہ التسلیم کے اس ارشاد کو ہمیشہ پیشِ عمل رکھنا۔ زندگی کی طرح ضروری بنا لینا

"حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ"

یعنی اپنے وطن سے محبت کرنا ایمان میں داخل ہے۔ پیارے وطن! خدا تجھے آزادی کی نعمت بخشے۔

(منقول از پریم) تاجور

ایم ہادی حسن اختر پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس ... چھپوا کر دفتر ... کوٹھی محبوب شاہ احاطہ کالو جلالدین روڈ مزنگ لاہور سے شائع کیا